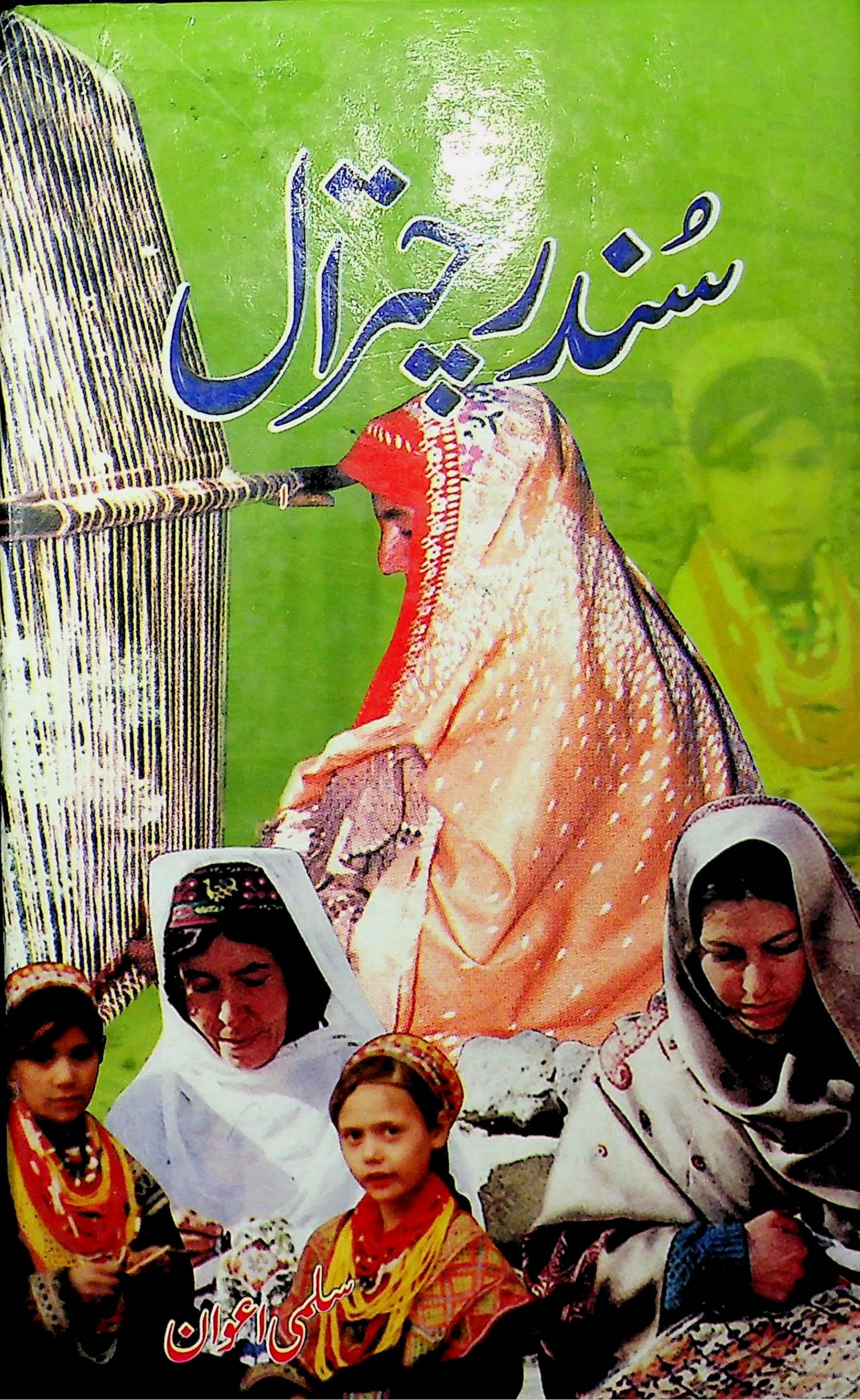

سُندر چترال
سلمیٰ اعوان

سُندر چترال

سلمیٰ اعوان

الفیصل
ناشران و تاجرانِ کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور

Al-FAISAL NASHRAN

Gazni Street,Urdu Bazar,Lahore.Pakistan
Phone : 7230777 Fax :09242-7231387
http:www.alfaisalpublishers.com
e.mail:alfaisal_pk@hotmail.com

مارچ2004ء

محمد فیصل نے

تعریف پرنٹرز سے چھپوا کر شائع کی۔

قیمت:-/180روپے

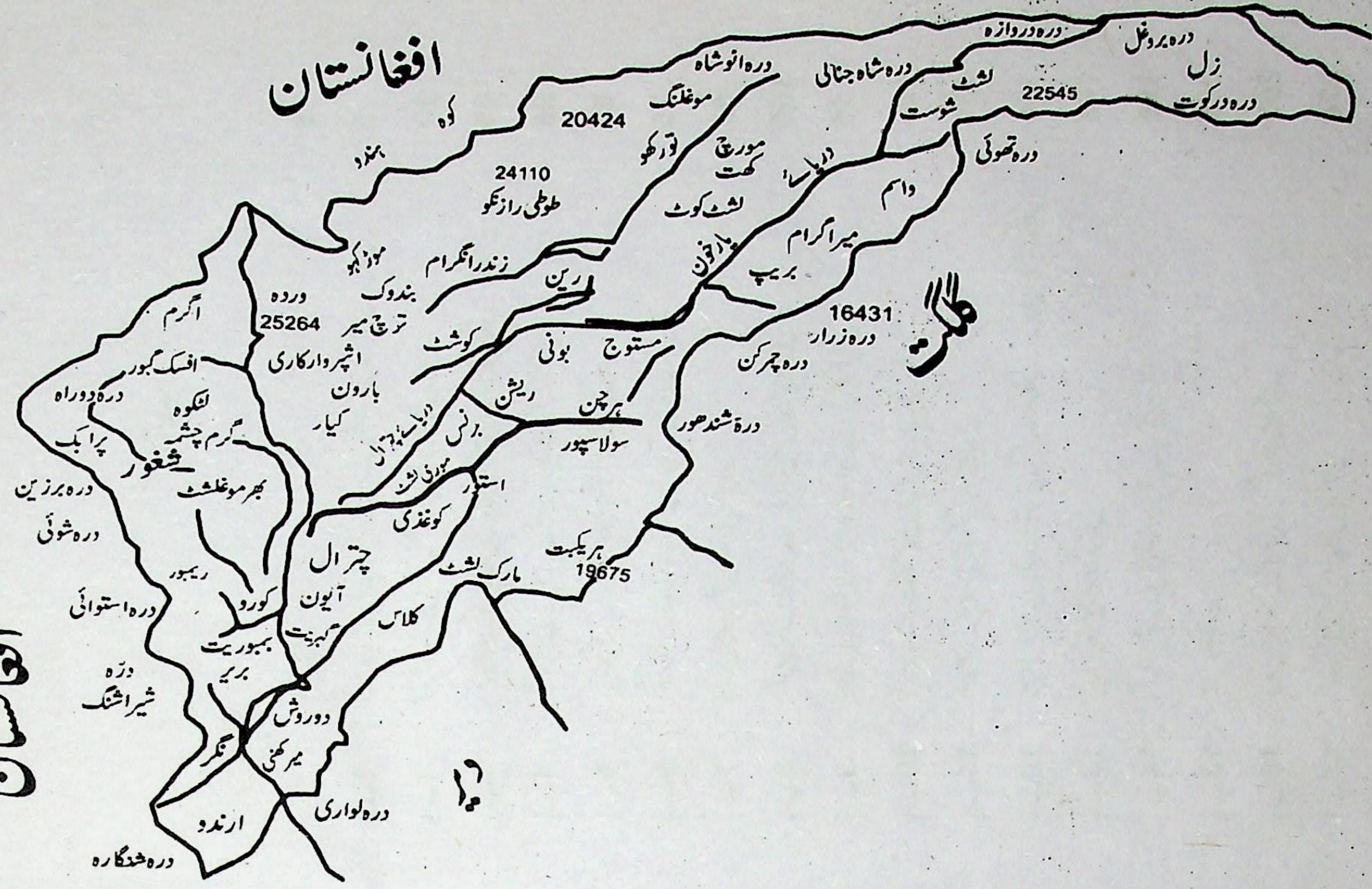
اپنی بیٹی سعدیہ عمران

اپنی بھتیجی نبیلہ رحمٰن

اور

چترالی بیٹیوں کے نام

ترتیب



افغانستان
کوہ
ہندو
20424
24110
طوطی رازکو
درہ انوشاہ
موغلنگ
تورکھو
موریچ
کھت
لشٹ کوٹ
دریا سا
درہ شاہ جنالی
درہ دروازہ
درہ بروغل
زل
درہ درکوٹ
22545
لشٹ
شوست
درہ تھوئی
وام
میراگرام
بریپ
یارخون
16431
درہ زرار
درہ چرکن
درہ شندھور
موڑکہو
زندرانگرام
بندوک
ریں
درہ
25264
ترچ میر
اشپروارکاری
کوشٹ
مستوج
بونی
ریشن
ہرچن
سولاسپور
بارون
کیار
اگرم
افسک گبور
درہ دوراہ
لنکوہ
گرم چشمہ
پرابک
شغور
بھرموغلشٹ
درہ برزین
درہ شوئی
برنس
استور
کوغذی
چترال
آیون
کورو
ریمبور
ہریکبت
19675
مارک لشٹ
کلاس
درہ استوائی
بمبوریت
بریر
دروش
درہ
شیراشنگ
نگر
میرکھنی
درہ لواری
ارندو
درہ شندگارہ
کشمیر
ریمبور
بمبوریت
بریر
افغانستان

پیش لفظ

سالوں پہلے چترال سے متعلق دو واقعات میری ذہنی دیواروں سے یوں چمٹے کہ میں ایک مدت تک خود کو انکے سحر سے نہ نکال سکی۔ یہ جاتی بہاروں کی ہی ایک شام تھی جب ہم اپنے چھوٹے سے آنگن میں آگ پر ہولیں (کچے چنے کے پودے) بھونتے تھے۔ ہماری اماں گھر میں داخل ہوئیں۔ بلند آہنگ آواز میں ''سبحان اللہ سبحان اللہ'' کہتے ہوئے وہ تیسری بار پھر سبحان اللہ کے ورد کے ساتھ گویا ہوئیں ''مولوی صاحب دُلہن بیاہ کر لائے ہیں۔ سلفے کی لاٹ ہے۔ کمرے میں بیٹھی جگمگ جگمگ کرتی ہے۔''

سیدھی سادی اماں کے چہرے پر حسن کے سحر سے فسوں خیزی حیرت زدگی اور خدا کی حُسن تخلیق پر عش عش کرنے کا واضح ردعمل تھا۔ ہمارے محلے کی مسجد کے ادھیڑ عمر مولوی صاحب علم صاحب ایمان اور صاحب کردار انسان تھے۔ میں نے کالک میں لتھڑے اپنے ہاتھ منہ صاف کیے اور انکے حجرے کی طرف بھاگی۔ دہلیز میں میرے قدم جیسے لوہا بن کر مقناطیس کی کسی باڑ پر پڑے اور وہیں چپک گئے۔

سُرخ اوڑھنی میں اُس کے سنہری بالوں میں جیسے آگ سی لگی ہوئی تھی۔ ایسی نشیلی ہری کچور شفاف بولتی آنکھیں کہ جن میں ڈوب جانے کو جی چاہے۔ رعب حُسن سے میری بولتی کو اگر سانپ سونگھ گیا تھا تو وہیں میرے دماغ میں بھونچال آیا ہوا تھا۔

بچپن کی پڑھی گئی سب کہانیوں کی شہزادیاں اور انگریزی ناولوں کی خوبصورت ہیروئنیں

اور پرنسیز دماغ کے کونے کھدروں سے نکل کر چوکڑیاں بھرتے ہوئے اپنے آپکو موازنے کے لیپیٹ کرنے لگیں۔

میں نے سر جھکا اور کچھ جاننے کے لیے پاس بیٹھی۔

''دور دور پہاڑ اور چترال''

یہ چند الفاظ تھے جو اسکے لعلیں لبوں سے نکلے۔

وہ اور مولوی صاحب چترال سے بھی آگے کوئی ساٹھ میل پرے لٹکوہ وادی کے ایک گاؤں سے تھے۔ پھر مزید شناسائی ہوئی۔ اُس نے بھی ٹوٹا پھوٹا بولنا سیکھ لیا تھا۔ ہمہ وقت محلے کی عورتوں سے ربط میں تھی۔ ایک دن ایک خوبصورت جوان لڑکا وہاں بیٹھے دیکھا جو اسکا چچیرا بھائی تھا۔

''اسکا ہاتھ دیکھو۔'' جونہی میں چٹائی پر بیٹھی اُسنے لڑکے کا ہاتھ میرے آگے کر دیا۔ میں اُسوقت بائیس تیئس کے ہیر پھیر میں تھی اور پامسٹری کی کتابیں پڑھنے اور ہاتھوں پر طبع آزمائی کے جنوں میں ہمہ وقت پاگل ہوئے رہتی۔ لڑکے کے ہاتھ پر زندگی کی لکیر تو ٹھیک ٹھاک تھی پر حادثاتی موت کی ایک علامت جسے تھوڑے دن پیشتر میں نے کہیں پڑھا تھا موجود تھی۔

میں اگر اپنے اُس دور کے شب و روز کا محاسبہ کروں تو یقیناً کہوں گی کہ میں احمق نہیں تھی۔ ماہ و سال کے مطابق ذہنی پختگی بھی تھی تو پھر کیا وجہ تھی کہ میں نے چھوٹتے ہی کہہ دیا تھا کہ اسکی عمر تھوڑی ہے۔ یقیناً اسوقت میں نیم ملا خطرہ ایمان اور نیم حکیم خطرہ جان کی تفسیر بنی ہوئی تھی اور اپنے اُس محدود سے علم کی خودنمائی کے اظہار کے لیے بے قرار تھی۔

مجھے یاد نہیں میری اس بات پر اُن دونوں کا کیا ردعمل تھا۔

دو سال گزر گئے۔ میں ابھی بھی اُس پری وش کے درشن کو جایا کرتی تھی کہ اسکے پاس بہت سی تحیر آمیز باتیں تھیں۔ ایسے ہی ایک دن اُسنے یکدم گفتگو روک کر مجھے بتایا کہ اُسکا وہ بھائی مر گیا ہے۔

''کیسے؟'' میرے سر پر جیسے بم پھٹا۔

''گاڑی چلا رہا تھا۔ آسمان کو چھوتے پہاڑوں کے ساتھ تنگ کچے راستے ساتھ میں گہری گھاٹیاں۔ رگوں میں خون خشک ہوتا ہے ان پر سفر کرتے ہوئے۔ کہیں لڑھکا اور گاڑی سمیت گہرے کھڈوں میں جا گرا۔''

یوں چترال میرے لیے ایک مدت تک خوف کی علامت بنا رہا۔

اہل چترال علمی بصیرت رکھتے ہیں۔ مہمان نواز اور منکسر المزاج ہیں مگر زوحس بھی ہیں۔ میں عورت ہوں نسائی خوبصورتی کو دیکھ کر اُسے سراہنا مجھے اچھا لگتا ہے۔ چترالی لڑکیاں خوبصورتی کے ساتھ ساتھ متین بردبار سلیقہ شعار علم حاصل کرنے اور خدمت میں پیش پیش ہیں۔ بھلا ایسی خوبیوں والی صنف کا ذکر کیوں نہ ہوگا۔

آخر میں اُن سب لوگوں کی ممنون ہوں اور شکر گزار بھی جنہوں نے مجھے اپنا تعاون دیا۔

سلمیٰ اعوان

باب نمبر۔۱

ذرا سرزمین شہدا بالاکوٹ سیف الملوک اور لالہ زار تک

سچ تو یہ تھا کہ وہ صبح اپنی تمامتر حشر سامانیوں اور جُملہ سامانیوں کے ساتھ آنکھوں کے راستے دل میں اُتر گئی تھی۔ آسمان کے سینے پر آگے پیچھے دائیں بائیں بھاگتی دوڑتی اُودی اور سیاہ گھٹاؤں کی یلغار تھی۔ سرسبز درختوں کی کمزور ٹہنیوں کے ساتھ دکنی ہواؤں کی چھیڑ چھاڑ جاری تھی۔ لان میں اُگے موتیے کے بوٹوں پر چنبیلی کی کلیاں کھل کر نگینوں کی طرح دمک رہی تھیں۔ کیلے کے جھومتے پودوں کے بالائی حصے ہواؤں کے زور سے یوں تار تار ہو رہے تھے جیسے کسی خاتون نے پلو کی کشیدہ کاری کے لئے اسکے دھاگے نکال دیئے ہوں۔

اور میز پر دھری چائے دانی ٹی کوزی سے ڈھنپی ہونے کے باوجود قہوے کی مسحور کن خوشبو کو باہر نکال کر پھینک رہی تھی۔ میں اس سارے منظر کو آنکھوں کے راستے دل میں اُتارتی کرسی پر بیٹھی۔ بیٹی نے چائے کا کپ بنا کر میری طرف بڑھایا جسے میں نے شدید احساس تشکر کے ساتھ تھاما کہ اس دل موہ لینے والے موسم میں بن مانگے چائے کا کپ مل جانا بھی کتنی بڑی نعمت تھی۔ اور جب میں نے سرشاری ہو کر بے حد رغبت سے سپ لیا میں نے سُنا بیٹی نے کہا تھا۔

''آپ بہت خود غرض ماں ہیں''۔

حیرت و تعجب سے میں نے اُسے یوں دیکھا جیسے وہ پاگل ہو گئی ہو۔ مجھ جیسی devoted ماں تو پوری دُنیا میں نہ ہو گی۔ یہ تو میں جانتی ہوں یا میرا خدا کہ انکے

پالنے سے جوان ہونے تک دن بھر میں بیسوں بار کرتے کا دامن اور ہاتھوں کے پیالے پھیلا پھیلا کر انکی تندرستی اور زندگی کی اوپر والے سے بھیک مانگتی رہی ہوں۔ ہونٹوں پر دعائیہ الفاظ تھرکتے ہی انکے لیے ہیں۔ لو دیکھو بھلا کیسی ایکٹویٹی رہی۔

یقیناً میری آنکھوں میں چھلکتے شکوے اور دُکھ کو اُسنے محسوس کرلیا تھا۔ پر وہ ان سے کوئی اثر لئے بغیر بڑی قطعیت سے بولی۔

''اماں میں ٹھیک ہی تو کہہ رہی ہوں۔ جب آپکا جی چاہتا ہے اٹھتی ہیں بیگ کندھے سے لٹکاتی ہیں اور نکل بھاگتی ہیں کبھی آپ نے یہ بھی سوچا کہ ہم بھی پہلو میں دل رکھتے ہیں۔ گھومنے پھرنے اور سیر سپاٹے کرنے کو ہمارا بھی جی چاہتا ہے۔ نئی جگہیں اور نئے لوگ دیکھنا ہماری بھی آرزو ہے۔ لیکن آپکو کیا؟''

بھاپ اُڑاتی چائے کی لطافت میں جیسے زہر سا گھل گیا۔ کھڑکیوں کے شیشوں سے باہر کے حسین منظر پر ایک نظر اور اُسکے چہرے پر دوسری ڈالتے ہوئے میں نے اپنے آپ سے پوچھا تھا۔

''کیا یہ ٹھیک کہتی ہے؟''

اور میرے اندر نے پوری توانائی کے ساتھ اُسکے اس احتجاج کو رد کر دیا تھا۔ میری ممتا بھلا اس گلاب چہرے کو ان کٹھنائیوں اور دشواریوں میں کبھی ڈالنے کے لئے تیار ہوگی جنہیں میں نے اپنا نصیب کرلیا ہے۔ اُسے یہ بتانا اور سمجھانا بھی کسقدر دشوار تھا کہ عمر کے ساتھ ساتھ بڑھاپے کی طرف تیزی سے بڑھتی ہوئی عورت کا ہاتھ اسکے دل کی شریانوں کی طرح تنگ ہوتا چلا جاتا ہے۔ اسکے اندر کی کنجوس اور کفایت شعار عورت ایک وقت کا کھانا بچا کر پبلک ٹرانسپورٹ سے کبھی پیدل اور کبھی لفٹوں سے سفر کر کے اپنے حسابوں توڑ جوڑ کر کے اعداد و شمار کی روشنی میں بڑی سرشاری محسوس کرتی ہے کہ اُسنے بڑے تیر مار لئے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی کبھی پیسہ بچاتی اپنی حماقتوں سے روپوں کا پٹڑہ کر جاتی ہے اور اس ضرب المثل کو سو فیصد سچ کر دکھاتی ہے جس

میں کہا جاتا ہے۔ ''بندہ جوڑے پلی پلی اور رام لنڈھائے کُپا''

یہ آسائشوں کی گود میں آنکھیں کھولنے پلنے اور جوان ہونے والے بچے بھلا مجھ جیسی عورت کی اِس نفسیات کو کیا جانیں۔

بیٹا آنکھیں ملتا ہوا اپنے کمرے سے نکل کر گیلری میں آیا اور بولا۔

اب یہ ہینکی پھینکی نہیں چلے گی اس بار سیر کرنی ہے۔ کاغان ناران لے چلیئے سوات کا پروگرام بنا لیجئے۔ مری کو چھوڑ دیجئے ہم اس کی صورت دیکھ دیکھ کر عاجز آ گئے ہیں۔

میرا سانس جیسے سینے میں رُک گیا۔ سیر ڈھیر سارا خرچ اور حاصل وصول کُچھ نہیں۔ کاغان ناران عام رسائی والی جگہیں ہیں۔ اور میں لکھنے کے علاوہ سفر کا سوچ بھی نہیں سکتی۔ ایک تیر سے دو شکار کرنے کی عادی ہوں خالی خولی تفریح کرنی میں نے سیکھی ہی نہیں۔ انگلینڈ امریکہ جانے کی کبھی خواہش نہیں ہوئی وہاں جا کر کیا کرنا ہے۔ ڈھیروں لوگ گئے ڈھیروں نے لکھا۔ میں کیا لکھوں گی۔ کوئی انفرادیت کچھ نیا پن کوئی نئی چیز قاری کو نہیں دے پاؤں گی۔ زندگی میں اگر پیسے کی ریل پیل ہو گی تو پھر گھانا اور اسکا ویگلا دیکھوں گی۔ آسٹریلیا کے فجی کی سحر انگزیوں سے لُطف اندوز ہوں گی۔ اور اگر جیب ہلکی رہی تو پھر پاکستان میں بھی بہت سے ایسے گوشے ہیں جن پر لکھا جا سکتا ہے۔

مگر ہوا یوں کہ سیر سپاٹے کی اس پچ پر بیٹے نے فوراً اننگز کھیلنے کا فیصلہ کر لیا۔ اُسنے جارحانہ انداز میں مجھے الٹی میٹم دیا ''تیار ہو جایئے اور پیسوں کا بندوبست کر لیجئے۔'' ساتھ ہی میری کزنز کو اُسنے فون کھڑکا دیئے۔ اپنی چچیوں کو بھی کہا کہ دعوت عام ہے اسکی اس مہم کا نتیجہ یہ تھا کہ چار عورتوں اور پندرہ بچوں پر مشتمل ایک قافلہ کاغان ناران کیلیئے تیار ہو گیا۔

پنڈی سے چھوٹی خالہ کی تاریخ دان بیٹی فرح ناز نے ہمارے ساتھ شامل ہوتے ہی اس بے سرے قافلے کے نتھنوں میں نکیل ڈال کر مہار اپنے ہاتھوں میں تھام لی۔

حد ہو گئی ہے۔ مہاراجہ اشوک کے کتبے دیکھے بغیر تم آگے کیسے جا سکتے ہو۔ اُس نے

فیصلہ سنا دیا۔

مانسہرہ کے قریب پتھروں پر کندہ ان عجیب وغریب تحریروں قراقرم ہائی وے پر کاندسیاں گاؤں میں شیو جی مہاراج بریڑی دیوی اور ''چٹی گٹی'' کے مشہور ٹوٹے پھوٹے مندروں کو سوائے میرے اور فرح کے سبھوں نے کوفت اور بیزاری سے دیکھا اور ناک منہ چڑھاتے ہوئے اس کاوش کو وقت اور پیسے کا ضیاع قرار دیا۔

اشوک جی کی بھی آخری عمر میں کیسی کایا کلپ ہوئی۔ کہاں جنگوں اور خون ریزی کا متوالہ جوان ہندو اور کہاں بڑھاپے میں بدھ مت کا بھکشو۔

وقت پیری گرگ ظالم مے شود پرہیز گار

فرح اپنے کالج اور یونیورسٹی کی طرف سے بہت دفعہ ان راستوں کو ناپ چکی تھی۔ اس نے جب قابل دید جگہوں شران، موسیٰ کا مصلیٰ، شینو کا مچھلی گھر، لالہ زار، جھیل لولوسر اور دودی پت سر کے نام لیے تو لڑکیوں کے قہقہے بکھرے آہا کس قدر طلسمی نام ہیں۔

صبح شوگراں کے لیے چلے پروگرام واپسی پر رات کیوائی میں ٹھہرنے کا تھا۔ مانسہرہ سے گل ڈھیری تک بڑا ہی کے جنگل کا زگ زیگ جیسا راستہ بلند وبالا درختوں اور اُنکی مسحور کن خوشبو سے اٹا پڑا تھا۔ گل ڈھیری میں ہرے بھرے کھیتوں اور کوہ موسیٰ کا مصلیٰ نے فوراً توجہ کھینچی۔ گڑھی حبیب اللہ میں دریائے کنہار کے کنارے ٹال ہوٹل میں چائے پی گئی تصویر کشی ہوئی۔ چھوٹے چھوٹے خوبصورت گاؤں سے گزرتے ہوئے جونہی بالاکوٹ نظروں کے حصار میں آیا۔ میں بے کل ہوگئی۔ خورشید کی صورت جینے والے سید احمد شہید سید اسماعیل شہید کا مدفن بالاکوٹ جسے میرے بچپن کا معصوم تصور بلند وبالا ٹیلوں پر چمکتی تلواروں کے ساتھ پگڑیوں اور کرپانوں والے سکھوں کا مقابلہ کرتے دیکھا کرتا کہ میرے چھوٹے چچا کا ان دونوں سرفروش مجاہدوں سے والہانہ عشق ہر تیسرے چوتھے دن ان کے ذکر کے بغیر ادھورا رہتا۔

رات کیوائی کی جگہ بالاکوٹ میں گزاریں گے۔ میں نے اپنے آپ سے کہا تھا۔

کیوائی کی وادی نے خوبصورتی کے ساتھ ساتھ ایک نئے منظر سے آشنا کیا کہ سارے گھر بلند و بالا پہاڑوں پر بکھرے پڑے تھے۔ شوگراں کوئی سات ساڑھے سات ہزار فٹ کی بلندی پر واقع ایک ایسی دل کش سطح مرتفع ہے جو کیوائی سے اگرچہ نو دس کلو میٹر پر لیکن کھڑے ہاتھ جیسی ایسی عمودی چڑھائی کہ بندے کا سانس سینے میں رُک رُک جائے۔ بلند و بالا پہاڑوں کے جنگل ایک جانب اور گہری کھائیاں دوسری سمت۔ دو دھاری تلوار جیسے اس راستے کے بعد جنت دیکھنے کو ملتی ہے۔ تا حد نظر سبزہ پھول خوشنما گھاس کوہ مکڑا اور سری پایہ کی چوٹیاں۔

پائین پارک میں ہماری کہاں ڈھوئی تھی۔ کہ مہنگے ریسٹورنٹ کے لیے ہماری جیب ہلکی تھی۔ پیٹ پوجا تو نیچے سے لانے والی چیزوں سے ہوئی۔ لڑکوں نے ''سری پایہ'' پر کوہ پیمائی کی اور واپس آ کر دیودار اور بیار کے گھنے جنگلوں اور خوبصورت پرندوں کے ذکر کے ساتھ ساتھ ایک دلچسپ داستان بھی سنائی۔ سینکڑوں سال پہلے ان علاقوں میں ایک عجیب الخلقت شے کی حکمرانی تھی۔ ایک بار علاقے کے مکھیا کی بکری کھوگئی۔ پورا گاؤں اُسے کھوجنے نکلا بکری یقیناً اس خونخوار کی بھینٹ چڑھ گئی تھی۔ سیدھے سادے مکھیا کے غم خوار لوگوں نے جس مقام سے بکری کی سری ملی اُسے سری اور جہاں سے پائے پائے گئے اُسے پائے کا نام دے دیا۔

واپسی پر کیوائی کی بجائے رات بالاکوٹ گزارنے کی میری بات پر فرح اور لڑکوں نے اعتراض کیا کہ پیچھے کیوں جائیں۔ کیوائی نہیں ٹھہرنا تو آگے پارس چلتے ہیں۔

میں نے مختصر اُدو ٹوک انداز میں کہا ''نہیں''۔

دراصل میں بھی اپنے جذباتی رشتے سے مجبور تھی۔ دریائے کنہار کے دونوں کناروں پر بسنے والے بالاکوٹ شہر کی شہرت تاریخ میں شہدا کی سرزمین کی ہے۔ سب کو ہوٹل چھوڑ کر میں اکیلی اسکی سیر کے لیے نکل کھڑی ہوئی تھی۔ صدی پُرانے چوبی پُل پر کھڑے ہو کر ان کوہساروں پر لڑی جانے والی لڑائی کا تصوراتی نظارہ تکلیف دہ تھا۔ عصر کی نماز جامع مسجد سید احمد شہید میں پڑھی جس کے ستون دریائے کنہار کے پانیوں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ سید احمد شہید کا مزار دیکھ کر میں دکھ اور

کرب کی اتھاہ گہرائی میں گری کہ ایک عام سا احاطہ جس کے چھوٹے سے دروازے کی کنڈی کھول کر میں اندر داخل ہوئی تھی۔ جہاں درختوں کی چھاؤں تلے وہ مردِ مجاہد ابدی نیند سو رہا تھا۔ مزار کے اوپر والے حصے میں پھول بوٹے سرہانے کتبہ اور اسکے ساتھ عربی عبارت والا لوہے کا ایک بڑا سا ڈبہ تھا۔ قبر کے تین سٹیپ تھے۔ سرہانے کھڑے ہو کر میں نے گیلی آنکھوں کے ساتھ فاتحہ پڑھی۔ احاطے میں دیگر قبروں کے لیے دعائے خیر کی اور بوجھل دل کے ساتھ باہر نکل آئی۔ میرا دل اس قومی بے حسی پر ماتم کناں تھا۔

شاہ اسماعیل شہید کا مزار چوک اسماعیل شہید سے کوئی ایک میل کے فاصلے پر ایک چھوٹی سی پہاڑی پر ہے۔ جہاں جانے کے لیے مجھے سواری لینا پڑی۔

ڈوبتی شام اور چاروں سمت چھائی خاموشی میں ماضی اور حال کے تقابلی جائزوں میں آنسو دھڑا دھڑ بہتے تھے۔ فاتحہ پڑھنی مشکل ہو گئی تھی کہ چمن وطن میں ہوائے حرص وہوس دیدہ وروں کے لیے موت کا پیام بن گئی تھی۔ گھور اندھیرا تھا اور روشنی کی کوئی کرن دکھائی نہ دیتی تھی۔

علی الصبح بالاکوٹ سے چلے۔ لڑکیوں نے شور مچایا شینو کا مچھلی گھر ضرور دیکھنا ہے۔ کیسا رنگ رنگیلا افسانوی سا نام ہے۔ ڈرائیور نے بتایا کہ دراصل یہاں ٹراؤٹ مچھلی کا فارم ہے۔ ساتھ ہی مزید کہا کہ جرید میں رُکیے۔ زنانہ گرم شالیں خریدیں۔

جرید میں چائے پانی بھی پیا گیا۔ شالیں بھی خـــــریدی گئیں۔ اور اس جگہ کی سیر بھی ہوئی۔

کاغان تنگ لیکن خوبصورت وادی ہے۔ ناران کشادہ اور جھیل سیف الملوک کا راستہ ہڈی پسلی ہلانے والا۔ لمبے چوڑے گلیشئر کے ٹوٹے پر پیدل چلنا دلچسپ تجربہ تھا۔ فرلانگ بھر کی لمبائی والا بالشت بھر چوڑا راستہ جس کی گہرائیوں میں کبھار چنگھاڑیں مارتا بہتا تانگوں اور رگوں میں خون منجمند کرتا تھا۔ اُس جان لیوا مشقت کے بعد جھیل سیف الملوک کسی حسین نازنین کی مخمور آنکھ کی طرح دکھائی دی۔ اور ساتھ ہی اُس بے مثل فقرے سے حظ اُٹھایا جو ایک فیصل آبادی ٹولے

نے ماجھے ساجھے انداز میں ڈکراتے ہوئے کہا تھا۔

''آئے ہائے یہ سیف الملوک ہے۔اس سے اچھا تو ہمارے چک کا چھپڑ ہے۔یونہی اتنا پینڈ امارا۔''

میں بے اختیار ہنسی تھی اور رُخ پھیر کر انہیں دیکھا تھا اور اس مقولے پر ایمان لائی تھی کہ واقعی کسی بھی چیز کا حُسن دیکھنے والے کی نظر میں ہوتا ہے۔

جھیل سے متعلق داستان مقامی داستان گو سے سُنی جو الف لیلیٰ کی طلسمی کہانی سے کیا کم تھی۔

لڑکے بابوسر ٹاپ تک جانے کے لیے بضد۔پر لالہ زار سے آگے نہیں جایا جاسکا۔لالہ زار بھی یادوں میں ہمیشہ کسی برقی فانوس کی مانند جھلملاتا ہے۔

بٹہ کنڈی سے جیپ سڑک کے دائیں ہاتھ والے راستے پر اُتری۔جُوں کی چال چلی اور چار پانچ میل کے ٹوٹے کو کوئی گھنٹہ بھر میں طے کرنے کے بعد جہاں جا کر رکی اُس منظر نے مقامی لوگوں کی فہم فراست کی داد دی کہ جنھوں نے اسے لالہ زار کا نام دیا۔

بخدا کیا جنت کا نظارہ تھا۔نکھری ہوئی فضا میں آنکھوں کو تازگی بخشتی سرسبز چوٹیاں رنگا رنگ کھلے پھول اور انکی خوشبو سے مہکی فضا زمردیں چوٹی تو یوں نظر آئی تھی جیسے یہ سارا میلہ اسی شہزادی کے لیے ہی سجایا گیا ہو۔ان پہاڑوں کے پار جھیل سیف الملوک تھی۔

لڑکوں نے مزید جگہوں کے لیے بڑا شور مچایا پر جوان اور خوبصورت لڑکیاں ساتھ تھیں۔راستے ٹیڑھے میڑھے اور دشوار گزار تھے اُن پر تنہائی اور سناٹے کی دھول تھی۔دیورانی بول اُٹھی۔

''باجی واپسی کریں کوئی اُنیس اکیس ہوگئی تو کس کی ماں کو ماسی کہیں گے۔''

بہترین ہوٹلوں میں قیام وطعام اور دیگر اللّے تللوں میں میری اور کزنز کی اولادوں نے اتنا خرچ کروایا کہ حساب کتاب کے چکروں میں اُلجھ کر میں نے ایک بار نہیں بیسوؤں بار

شاید اپنے آپ سے کہا تھا۔ ''اس سے تو میں پورا پاکستان گھوم سکتی تھی''۔

میری زبان سے اسکی تکرار جب چند مرتبہ ہوئی تب ایک دن بیٹے نے دونوں ہاتھ بنتی کے انداز میں جوڑ کر میری ناک کی پھنگی سے لگا دیئے اور سڑے بُسے لہجے میں بولا۔

''مانتے ہیں ہم۔ اتنے پیسوں سے آپ پاکستان کیا ساری دنیا گھوم سکتی تھیں بس ہمیں معاف کر دیجئے غلطی ہوگئی آئندہ ہماری توبہ ہمارے باپ دادا کی توبہ جو کبھی آپ کو ساتھ لے جائیں۔''

توبہ ہے آجکل کے بچے مجال ہے جو ناک پر مکھی بھی بیٹھنے دیں۔ میں بیٹے کے غصیلے لہجے پر بہت جز بز ہو رہی تھی۔

میرا سارا سال اسی اُدھیڑ بن میں گزرا کس پر لکھوں۔ علاقہ غیر پر قلم اُٹھاؤں۔ شہرت کے حوالے سے ایک بدنام نام میں نے جُھرجھری سی لی۔ کسی بااثر تعاون کے بغیر وہاں جانا جان جوکھوں کا کام۔ اندرخانوں کی کہانیوں پر دبیز پردے جنہیں باہر لانا یقیناً دلچسپی کا موجب ہوگا۔

تبت کی طرف پیش قدمی کروں۔ وہاں کی زمین اور تہذیب دونوں میں بڑا اسحر اور اسرار ہے۔ کیا کروں کہاں جاؤں ....

باب نمبر۔۲

چترال شاہی قلعہ۔ مشی خان

اور کالاش ڈرامہ

ابھی انہی گھمن گھیریوں میں اُلجھی ہوئی تھی جب نیلم احمد بشیر نے مجھ سے پوچھا کالاش چلتی ہو۔ پروین عاطف ڈرامے کے لئے اپنی ٹیم کے ساتھ وہاں جارہی ہیں۔ بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا۔ ساتھ مل رہا تھا۔ جانے کی ٹھان لی۔ پر ایک گھمبیر مسلہ سامنے آن کھڑا ہوا۔ بیٹی ایم۔اے انگلش اور بیٹا بی۔ ایس۔ سی فائنل کے امتحان دے رہے تھے۔ کسی خیر خواہ نے کہا۔

''عجیب اوندھی ماں ہو۔ امتحانوں میں بچوں کے کھانے پینے کی خصوصی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ انہیں مورل سپورٹ کی بھی سخت ضرورت ہوتی ہے اور تم ایسے نازک وقت گھر سے بھاگ رہی ہو۔''

بات تو ٹھیک تھی۔ پر ملازم پیشہ عورت کی مجبوریاں بھی مدنظر تھیں۔ میں نے بیٹی کو دیکھا اور پوچھا۔

''تم کیا کہتی ہو؟''

جھلستی دھوپ میں سے جیسے کوئی گھنی اور ٹھنڈی چھاؤں تلے آجائے میری کیفیت ایسی ہی تھی جب اُسکے چہرے پر سجی اور آنکھوں میں پھیلی مہربان سی مسکراہٹ نے مجھے کہا

''نکل جائیے آپ۔ ہم اب کوئی بچے تھوڑی ہیں۔''

جانے کے لئے جو جھمیلے سُننے کو ملے وہ میرے لئے قطعی اجنبی تھے۔ پروین عاطف فون

پر بڑی دلگیری سی تھیں۔

مشی خان پلہ نہیں پکڑا رہی ہے وہ سید نور کی ''بلی'' کی شوٹنگ میں مصروف ہے میری ہزار خواریوں کے باوجود تاریخ کا تعین نہیں ہو رہا ہے۔

تاریخ کا جب تعین ہوا تو شندھور میلہ آڑے آ گیا۔ غیر ملکی و ملکی سیاحوں بیوروکریٹوں اور حکومتی عہدیداران کی بھاری تعداد میلے کے سلسلے میں چترال بھاگی جا رہی تھی۔ اور پی آئی اے ہم جیسے ایرے غیرے نتھو خیرے کو ٹکٹ دینے کے قطعی موڈ میں نہ تھی۔

آٹھ جولائی کو پروین عاطف کا فون آیا ''کل پشاور کے لئے روانگی ہے۔''

''کل'' میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

''چلو تم دس کو پشاور پہنچ جاؤ گیارہ کو ہماری فلائٹ ہے۔''

اُسنے درمیانی راہ نکالتے ہوئے مجھے پشاور میں اپنے دو عزیزوں کے پتے لکھوا دیئے۔

میں تیاری کے لمبے چوڑے جھمیلوں میں کبھی نہیں پڑی۔ جب بریف کیس میں دو جوڑے رکھنے لگی تو بیٹی نے ہاتھ پکڑ لیا۔

''کچھ خدا کا خوف کیجئے۔ آپ اکیلی تو نہیں شوبز کے شوئی لوگ ساتھ جا رہے ہیں۔ کپڑے لتے کا خیال کریں۔''

میں نے مسکینی سے اُسے دیکھا۔ میری نگاہوں میں مچلتا اضطراب اُس سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اُس نے قدرے تیزی سے کہا۔

''جاتے ہی دھوبی گھاٹ لگانا ہے کیا۔''

بیگ میں پانچ کلف اور استری شدہ جوڑے رکھے گئے۔ میرے اندرون ملک سفروں کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ میں نے لپ اسٹک پرفیوم کولڈ کریم اور پولی کلر کی ٹیوب ہینڈ بیگ میں ڈالی۔ کانوں کے لئے ایک جوڑی بندوں کی بھی رکھی۔ یہ اور بات ہے کہ ایسا کرتے ہوئے مجھے اُلجھن ہو رہی تھی۔

جولائی کی حبس اور امس سے بھری شب میں اسٹیشن سے ٹرین کمپارٹمنٹ تک بڑی ایکٹویٹی رہی۔ اے۔سی پارلر کی سیٹیں تھیں۔ میاں کا کوئی بیلی مل گیا۔ وہ وہیں پلیٹ فارم پر ہی اُسکے ساتھ ہیلو ہائے میں مصروف ہو گئے۔ باپ کی مصروفیت دیکھتے ہوئے بیٹے نے مجھے اے۔سی اکانومی میں بٹھا دیا۔ سُرخ مخملیں آرام دہ سیٹ پر بیٹھتے ہوئے میں نے اللہ کا شکر ادا ہی کیا تھا کہ میری اوقات اب کچھ بہتر ہو رہی ہے اور میں تھرڈ کلاس سے ون میں آ رہی ہوں۔ جب بھیڑ میں سے مجھے میاں کی گھاتی نظر آئی جس پر ٹکے اس کے چقندر کی طرح چہرے اور انگاروں کی طرح دہکتی آنکھوں اور منہ سے اُگلتے شراروں نے مجھے بتایا کہ میں غلط جگہ پر آ بیٹھی ہوں۔ میں نے مکھی اڑانے کے انداز میں داہیں بازو کو اٹھا کر فضا میں لہراتے ہوئے اُسے سگنل دیا کہ بس سب ٹھیک ہے۔ پر اگلے ہی لمحے مجھے اندازہ ہو گیا کہ اگر میں نے ذرا بھی حیل وحجت کی اور اپنا بیگ اٹھا کر نہ بھاگی تو کہیں جوش غضب میں مجھ پر ایر ریڈ ہی نہ ہو جائے۔ پلیٹ فارم پر میری دوڑ کی کیفیت کچھ نئے رنگروٹوں سے مختلف نہ تھی۔ جب اے۔سی پارلر میں جا کر سیٹ پر بیٹھی تب میرا جی میاں کا بھرتہ بنانے کو چاہ رہا تھا۔ میری پشت پر پسینہ بارش کے قطروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ انتہائی اہتمام سے استری اور کلف شدہ قمیض اور ڈوپٹہ یوں چُرمُر ہو رہے تھے جیسے انہیں بکس کے کسی کونے کھدرے سے نکال کر پہنا گیا ہو۔

پر صرف پندرہ بیس منٹ کے وقفے نے مجھے اے۔سی پارلر اور اکانومی کلاس کا فرق سمجھا دیا تھا۔ یہ فرق سمجھ آنے کے بعد میاں کو بھرتہ بنانے کو چاہنے والا دل شکر گزاری کے جذبات سے معمور ہو گیا۔ سبزی مائل نیلگوں شیڈ کے شیشوں سے میں نے پلیٹ فارم پر کھڑے میاں کو دیکھا جس نے گاڑی کو وداع کر کے رخصت ہونا تھا۔ وقت انرجی اور آرام کے اس تیاگ کی میں کبھی قائل نہیں رہی۔ اسکی جگہ میں ہوتی تو خدا حافظ کہہ کر کبھی کی جا چکی ہوتی۔

پنڈی سے پشاور کے سفر میں بہت خواری ہوئی۔ لیاقت آباد والوں نے پیرودھائی کیطرف لڑھکایا اور پیرودھائی والوں نے میونسپل کمیٹی والے اڈے کی طرف دھکیل دیا۔ ایک بجے

کی چلچلاتی دھوپ میں بیگ کندھے پر اٹھائے مار دھاڑ کرتی ہوئی جس کوچ میں جا کر بیٹھی وہ اڈے سے بس نکل ہی رہی تھی۔ سیٹ بھی وہ ملی جو مالکان گاڑیوں میں اضافی لگوا لیتے ہیں۔ تاہم پھر بھی شکر ادا کرنے کی بات تھی کہ پشاور کی سڑکوں راستوں اور جگہوں سے اجنبیت کی بنا پر دن دیہاڑے وہاں پہنچنا بے حد ضروری تھا کہ دیئے گئے ٹھکانوں کو کھوج بھی کرنا تھا۔

راستے میں جن شہروں کا کھڑکی کے بیرونی شیشوں سے نظارہ کیا اُن میں سے بیشتر کے ناموں سے بچپن کی کتابی شناسائی تھی۔ اکوڑہ اور اٹک کے قلعے کی عظیم الشان بیرونی فصیلوں کو دلچسپی سے دیکھا۔ بڈا بیر بیس اور کاک شیل روڈ میں سے کسی ایک جگہ جانے کے بارے میں فیصلہ میں نے پشاور اُتر کر کیا۔

''کاک شیل روڈ محمودہ آباد میں آپ آسانی سے جا سکتی ہیں۔ نزدیک ہی ہے۔'' کا سُن کر میں نے بیگ رکشے کی سیٹ پر پھینکا اور اسمیں لد گئی۔ پرانے پشاور کی گلیاں اور سڑکیں چھوٹے موٹے بازاروں کا منظر پیش کرتی تھیں۔ بڑے سے سلور کے پتیلے پر رکھے سفید بھٹے جنہیں دیکھ کر خریدنے کو طبیعت للچائی۔ پر موقع کی مناسبت نے اس چٹورپن کی اجازت نہ دی۔

محمودہ آباد میں رکشہ جس گھر کے سامنے رکا اُسکے بڑے سے گیٹ کے بند دروازوں اور مونچھیں بردار دربان نے مجھے دہلیز سے ہی سمجھا دیا تھا کہ میں کسی امیر کبیر خان کے دروازے پر کھڑی ہوں۔ اسوقت جب جولائی کی تپتی سہ پہر شام میں ڈھل رہی تھی۔ میں دائیں بائیں دیکھتی اور مرعوب ہوتی زنان خانے کی طرف بڑھ رہی تھی۔ سرسبز بیلوں پھولوں اور پھلوں سے آراستہ زنان خانہ بڑا روایتی تھا۔ گھر کا لان اونچی نیچی پہاڑیوں کی طرز پر بنا تھا۔ لمبے برآمدے نے کمروں کی ساری گرمی کو جو اے۔ سی کی صورت باہر آ رہی تھی اپنے اندر جذب کرتے ہوئے چھوٹی سی دوزخ بنا لی تھی۔ میں نے بیگ کو فرش پر رکھا۔ اور برآمدے میں نظریں دوڑائیں۔ آخری کونے میں کرسی پر واٹر کولر پڑا تھا۔ مجھے دو چیزوں کی اشد ضرورت تھی۔ گلاس اور واش روم۔ گھر کے ایک حصے کی چھان پھٹک کے بعد مجھے دونوں چیزیں دستیاب ہوئیں۔ گلاس نمبر ون اور واش

روم نمبر فور اگر نمبر ون نے ٹھنڈا ٹھار پانی اندر بھیج کر لطف اور شانتی دی وہیں نمبر فور نے گرم پانی کے اخراج سے سکون بخشا۔ ٹوٹے پھوٹے اس باتھ روم کی زنگ آلود ٹونٹی کا پانی اتنی خنکی لیے ہوئے تھا کہ منہ ہاتھ بازو اور پاؤں دھو کر مزہ آ گیا۔ میرا تو جی نہانے کو مچل رہا تھا پر دروازے میں اتنی بڑی بڑی درزیں تھیں کہ حوصلہ نہ پڑا۔

وضو کر کے برآمدے کے فرش پر میں نے چادر بچھا کر نماز پڑھی۔ میں کوئی آدھ گھنٹے سے اس گھر میں گھوم پھر رہی تھی حیرت کی بات تھی کہ مجھے ایک متنفس دکھائی نہ دیا۔ گھر والے تو چلو مانا ٹھنڈے کمروں میں قیلولے کا مزہ لوٹ رہے تھے پر ملازم وہ تہہ خانوں میں ہی کہیں ہو سکتے ہوں گے انکے امکانی ٹھکانے تو میں نے کھنگال ڈالے تھے۔

کرسی پر بیٹھ کر میں نے بالوں میں کنگھا چلایا۔ اور جب میں اپنے اودے ہونٹوں پر لپ اسٹک کا ٹچ دے رہی تھی کہ بیچارے کچھ گلابی مائل ہو جائیں میں نے برآمدے کے آخری کونے میں جالیدار دروازے کا پٹ ہاتھ میں پکڑے ایک شائستہ سی خاتون کو اپنی جانب دیکھتے پایا۔ کنگھا لپ اسٹک اور شیشہ سب بیگ میں ٹھونس ٹھانس کر جلدی سے اٹھ کر اُن کی طرف بھاگی۔

سلام دعا کے بعد صرف مدعا بتایا۔

''اللہ پروین تو تمہارا انتظار کر کے ابھی کوئی آدھ گھنٹہ قبل گئی ہے۔''

کمرے کی لطیف خنکی نے میرے سارے شریر کو سرشار کر دیا تھا۔ چائے پی کیک کھایا۔

صاحب خانہ پشاور شہر کے سابق مئیر تھے چند دن قبل امریکہ سے بائی پاس کروا کے آئے تھے۔ خاتون خانہ اُنکے بارے میں گفتگو کرنے لگی۔ کھانے پینے اور تھوڑی سی گفتگو سے فراغت پا کر میں نے قصہ خوانی بازار کے محل وقوع کے بارے میں پوچھا۔

''پشاور پہلی بار آئی ہیں۔'' سوال ہوا۔

''اپنی شادی کی شاپنگ میں نے یہاں سے کی تھی۔ کوئی چوبیس سال پہلے کی بات

ہے۔"

"پشاور تو بہت پھیل گیا ہے۔ آپ اکیلی۔" انہوں نے فکرمندی سے کہا۔

مجھے اُنکے اس تشویش بھرے انداز پر ہنسی آ گئی تھی۔

دروازے کیطرف قدم بڑھاتے ہوئے میں نے یہ کہنا ضروری سمجھا۔

"آپ قطعی فکر نہ کریں۔ میں مغرب کی نماز انشاءاللہ آپ کے گھر میں پڑھوں گی۔"

سڑک پر آ کر رکشے میں بیٹھی۔ ریڑھی پر رکھے سلور کے پتیلے کے ڈھکن پر سجائے سفید اُبلے بھٹوں کے پاس اُسے رکوا کر بھٹہ خریدا۔ سچی بات ہے میں بڑی شودی ہوں۔ یہ شودی سرائیکی زبان کے معنوی مفہوم سے کوئی واسطہ نہیں رکھتی بلکہ یہ پنجابی زبان کے مطلب کی غماز ہے۔ بچپنے سے لے کر اب تک بازاروں اور گلیوں میں ریڑھیوں اور خوانچوں پر سجی کھانے پینے کی چیزیں ہمیشہ میری آنکھوں میں ندیدہ پن لے کر اُتر آتیں۔ اٹھنی روپے کی خرید کر سدا میں نے اپنا چسکا پورا کیا مگر اب عمر کے ساتھ ساتھ آگے کو تو ند نکالتا پیٹ بڑھتے ہاتھوں اور چٹخارے لیتی زبان کو تھوڑا بہت قابو میں رکھنے کی کوشش کرتا۔ یہی وجہ تھی کہ قصہ خوانی بازار میں چپلی کبابوں کی پاگل کر دینے والی خوشبو کو اک ذرا رک کر میں نے سونگھا پر خریدا نہیں۔ یوں یہ اور بات ہے کہ میں نے چاہا کہ آدھا کباب خرید لوں پر شرم آڑے آ گئی۔ خدایا دوکاندار کیا سوچے گا کیسی شوم عورت ہے۔ بازار سے میں نے چترال پر چند کتابیں خریدیں۔ اور جب سورج ڈوبنے کے قریب تھا میں گھر لوٹ آئی تھی۔

مغرب کی نماز کے بعد اُنکا بیٹا مجھے بڈا بیر بس پر پروین عاطف کے پاس چھوڑنے لے گیا۔ پروین وہاں اپنے دیور کی بیٹی سویرا کے پاس ٹھہری تھی۔ رات کی تاریکی میں بڈا بیر بس کی شان و شوکت کا تو مجھے کچھ اندازہ نہ ہوا پر جس گھر میں داخل ہوئی وہ خاصا جدید اور خوبصورت تھا۔ لاؤنج میں داخل ہوتے ہی میں نے بیگ زمین پر رکھا اور پروین کے اٹیچی کیسوں اور بڑے بڑے بیگوں پر نگاہ ڈالی۔ جب میں پروین کے گلے لگ کر اُس سے اظہار محبت کر رہی تھی اُسنے تعجب سے

میرے مختصر بیگ کو دیکھا اور حیرت سے بولی۔

''بس یہی تمہارا سامان ہے۔''

''یہ بھی زیادہ ہے۔ اس میں پانچ سوٹ ہیں جو آپکے آرٹسٹوں کی نظر میں معتبر بننے کے لئے زبردستی رکھے گئے ہیں وگرنہ میں تو دو جوڑوں کی عادی ہوں۔ میرا بس چلے تو جینز پہن کر اوپر سے چادر اوڑھ لوں۔ چادر سے ملٹی پرپز حاصل ہوتے ہیں۔ جائے نماز بیڈ شیٹ دستر خوان وغیرہ وغیرہ۔''

لاؤنج میں ادھر اُدھر بکھرے پروین کے قوی الجثہ بے ہنگم اور بے تکے بیگوں اور اٹیچی کیسوں کو دیکھ دیکھ کر مجھے اختلاج قلب سا ہونے لگا تھا۔ ڈھائی چھٹانک کی پروین ان دیو ہیکلوں کو کیسے سنبھالے گی۔ ان ڈھیر ساروں کے لئے کتنے پورٹر درکار ہوں گے۔ میں خلوص اور مروت کی ماری اس صورت حال سے کیسے اور کیونکر نمٹوں گی۔ میرے ذہن کے تنور سے اُلٹی پلٹی تلخ اور مضطرب سوچوں کے سلسلے ایک کے بعد ایک چھلانگیں مارتے یوں باہر آ رہے تھے جیسے

The Great Escape کے جنگی قیدی سرنگ کے سوراخ سے قلابازیاں کھاتے باہر نکلتے تھے۔

بے چینی نے مجھے کھڑا کر دیا تھا۔ کھڑکی کا پردہ سرکا کر دونوں ہاتھوں کی اوٹ میں چہرہ لے کر باہر دیکھا۔ گھپ اندھیرا تھا۔ کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ واپس اپنی کرسی پر آ بیٹھی۔ چائے کی ٹرالی میرے سامنے آئی۔ سویرا نے کپ بنا کر مجھے تھمایا۔ رغبت سے سپ لے کر میں نے اس کوفت کو کم کرنا چاہا جو میرے قلب و ذہن پر چھا گئی تھی۔

''چینی باجی آپ کے لئے میری جان بھی حاضر ہے۔ پر آپکا یہ بوجھ اٹھانے میں میں ہرگز آپکی مدد نہیں کروں گی۔ خدا کے لئے انہیں ہلکا کریں۔''

میں نے ''سخی نالوں سوم بھلا جیہڑا ترت دیوے جواب'' والی پالیسی پر عمل کرنے کا

فیصلہ کرلیا تھا۔

''ڈارلنگ پروین کے لہجے میں شہد جیسی مٹھاس تھی۔

مجھے تو تمہارے اوپر رشک آ رہا ہے۔ اسوقت سے میں یہی سوچ رہی ہوں کہ میں اس وزن کو کیسے گھٹاؤں۔''

پشاور سے چترال کے لیے جہاز میں بیٹھنے سے قبل چیکنگ سکریننگ اور جہاز کی سیڑھیوں سے آگے دروازے تک کے مرحلوں میں میں نے اپنی تمامتر چلاکیوں اور ہوشیاریوں سے اپنے آپ کو کھڑکی کے ساتھ سیٹ لینے کے چکر میں گھما پھرا کر آگے آگے رکھا۔ پر اس ساری تگ ودو پر پانی پھر گیا جب ایر ہوسٹس نے بورڈنگ کارڈ مانگا جو مجھے جلدی میں سٹیورڈ سے لینا یاد نہیں رہا تھا۔ نتیجتاً نیچے جانا پڑا۔ اور جب واپس آئی پروین عاطف کھڑکی کے ساتھ والی سیٹ پر قبضہ جما چکی تھی۔ ہانپتے ہوئے میں سیٹ پر ڈھے سی گئی۔

ارے میں نے قدرے دکھ سے سوچا۔

پروین کی زندگی جہازوں میں چڑھتے اُترتے گذر گئی ہے۔ ایک گھنٹے کا یہ سفر اسکے لئے کیا اہمیت رکھتا ہے خیال تھا وہ ضرور کہے گی تم ادھر آ جاؤ۔ پر جب ایسی کوئی بات نہ ہوئی اسوقت میرا جی چاہا کہ میں جیمز بانڈ کے سٹائل میں مُکا مار کر کھڑکی کا شیشہ توڑ دوں اور پروین کو گچی سے پکڑ کر نیچے پھینک دوں اور خود مزے سے اسکی سیٹ پر براجمان ہو جاؤں۔

میں نے آنکھیں بند کرلیں۔ جہاز اُڑان لے چکا تھا۔ میں نے بیلٹ بھی نہیں باندھی اور ہمسائی کے کندھوں پر جھکتے ہوئے باہر نظر بازی بھی نہیں کی۔ چُپ چاپ بے حس وحرکت سر پشت سے ٹکائے بیٹھی رہی۔

جونہی پرواز ہموار ہوئی خوش شکل ایر ہوسٹس اور سٹیورڈ نے چائے کے لئے سروس شروع کردی۔ برگر بند اور کیک کا پیس۔ چائے کی پیالی ہاتھ میں تھامتے ہوئے پروین نے کہا۔

''سویرا کے گھر کا ناشتہ ابھی تک میرے سینے پر دھرا ہے۔ اسے پیک کر لیتے ہیں دوپہر

اور شام کے کھانے کی بچت ہو جائے گی۔''

ماشاءاللہ خیر سے یہ میری بھی پیو نکلیں۔ مجھے ہنسی آ گئی تھی جسے میں نے کمال ضبط سے روکا۔ یوں میں اندر سے خوش بھی ہوئی کہ اللہ کے فضل و کرم سے خیالات میں کافی ہم آہنگی معلوم ہوتی ہے۔ اگر سفر کے ہر موڑ اور رُخ پر ایسی ہی دور اندیشی سے کام لیا گیا تو شاندار نتائج بر آمد ہوں گے۔

اور جب ہم دونوں پیکنگ کر رہی تھیں میں نے دیکھا تھا میرے برابر والی سیٹ پر بیٹھا مرد ہماری اس کاروائی کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے طنزاً مسکرا رہا تھا۔ اُسکے بچوں کے چھوڑے ہوئے بند برگر ایر ہوسٹس اٹھا رہی تھی۔ یوں ہم نے بھی اپنے شوگر بیگز پی۔ آئی۔ اے والوں کو واپس کر دیئے تھے۔

دور سے جو نظارے دیکھنے کو ملے اُن میں بادلوں کے پُرے برفانی چوٹیاں لواری ٹاپ کی ایک چھوٹی سی جھلک پتلی سی لکیر کی مانند بہتے دریا، گڑیوں کے گھروندوں کی مانند مکان اور سب سے آخر میں جہاز کا دریائے چترال پر پرواز کرنا تھا۔ جونہی جہاز نے زمین کو چھوا میں نے شکر کا لمبا سانس بھرا تھا۔ چترال کے لئے فوکر جہاز مخصوص ہیں۔ پی۔ آئی۔ اے کے فوکر اب بہت پرانے ہو چکے ہیں۔ لواری ٹاپ پر ذرا سی دھند انہیں آگے کی بجائے پیچھے لے جاتی ہے۔ اور آپ جہاں سے چلے تھے وہیں آن کھڑے ہوتے ہیں اکثر آپکا سارا شیڈول اپ سیٹ ہو جاتا ہے۔

ائیر پورٹ کی چھوٹی سی عمارت سیاہ پر ہیبت پہاڑوں میں گھری نگینے کیطرح چمکتی تھی۔ تیز ہواؤں سے نہال ہوتے ہوئے میں نے تنقیدی نظروں سے ائیر پورٹ کا جائزہ لیا۔ اور بے اختیار سوچا کیا اسے بوئنگ طیاروں کے لئے وسعت نہیں دی جا سکتی ہے۔ گلگت ائیر پورٹ کے ساتھ بھی یہی مسئلہ ہے۔ پروردگار کوئی مرد آہن اس قوم کو نصیب ہو جو میدانوں صحراؤں اور پہاڑوں کو نتھ ڈال دے۔

چھوٹی سی عمارت کے شیشوں والے دروازے میں داخل ہونے سے قبل کیاریوں میں

اُگے رنگا رنگ پھولوں اور سیبوں کے بار سے جھکے درختوں نے جھوم جھوم کر جیسے سرگوشی میں کہا ہو۔

خوش آمدید چترال آئی ہو۔

اس اتنے پیارے استقبالیہ جُملے پر انکا شکریہ ادا کرتے ہوئے میں اندر داخل ہو گئی تھی۔

ایک کریلا دوسرے نیم چڑھا ایک شراب اوپر سے دو آتشہ جیسی مثالوں کی پروین کے وجود کے ساتھ عملی موزونیت کا احساس مجھے چترال ایرپورٹ سے ڈپٹی کمشنر کے دفتر تک بہترین انداز میں ہوا۔ پروین خوبصورت لکھاری کیلاش پر ٹی وی کے لئے سیریل بنانے کی تگ و دو میں مصروف اوپر سے ہاکی کے بین الاقوامی شہرت کے حامل بریگیڈیئر عاطف کی بیوی۔ اب وہ اپنی جس خوبی کو جہاں چاہتی کیش کرواتی یہ اُسکی مرضی تھی۔ ائیر پورٹ کے کمرے میں اسکے بھاری بھرکم بیگ بھی سنبھالے گئے اور اسسٹنٹ کمشنر اظفر بہ نفس نفیس دینین روڈ پر ریسٹ ہاؤس میں چھوڑنے بھی آیا۔ آرٹسٹ پارٹی کل کی فلائٹ سے پہنچ رہی تھی۔ انکے لئے گاڑیوں کا بندوبست بھی فی الفور ہوا۔ انتظامیہ کی جانب سے ہر طرح کے تعاون کے وعدے پر اُسنے سُکھ کا لمبا سانس بھرا۔ بیڈ پر ٹانگیں پھیلا کر لیٹی اور بولی۔

"سلمیٰ لنچ کرتے ہیں اور چائے پیتے ہیں۔"

معدے کی مریض پروین جس کا کھانا چڑی کے چوگے جتنا ہے اسوقت لنچ کرنے اور چائے پینے کی خواہش کا اظہار کیوں نہ کرتی کہ اجنبی جگہ پر اُسکے گھمبیر مسائل الہ دین کے جن کیطرح مقامی حکام نے حل کر دیئے تھے۔ میں نے اپنے بیگ سے چینی پتی اور دودھ نکالا۔ سائیڈ ٹیبل پر رکھی تھرموس میں دو کپوں کے حساب سے چیزیں ڈالیں اور گرم پانی کے لئے کچن میں گئی۔ اسوقت ریسٹ ہاؤس کے دو خانسامے اشتہا انگیز کھانے پرونے میں پسینہ پسینہ ہو رہے تھے۔ ملحقہ کمرے میں بھاگم دوڑ جاری تھی۔ میں نے بوتل میں پانی ڈالا اور ناک بند کرتی اپنے کمرے میں آ گئی۔ دو گھروں کا لنچ نکالا۔ سویرا کے دیئے ہوئے شامی کباب اور سلائس ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار تھے۔ یہی حال پی۔ آئی۔ اے کے برگر بندوں کا تھا۔ روکھے سوکھے سلائس چائے

کے گرم گھونٹوں کے ساتھ حلق سے نیچے اُتار کر رب کا شکر ادا کیا کہ اُسنے مفت کا یہ من وسلویٰ ہمیں دیا۔ ساتھ ہی ہمسایوں کو بھی لعن طعن کی کہ وہ کھانے کے لئے لان میں کھیلتے اپنے بچوں کو آوازیں دے دے کر بلا رہے ہیں کمبخت یہ نہیں دیکھتے کہ برابر میں دو عورتیں بھی انکی نظر کرم کی مستحق ہیں۔ ہمسایوں کے تو بڑے حقوق ہوتے ہیں۔

چار بجے ہم ریسٹ ہاؤس سے نکل آئیں۔ اب میں نے چترال کے ناک نقشے پر توجہ مرکوز کی۔

کوہ ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑوں میں چاروں طرف سے گھری ہوئی یہ وادی اپنی چند خصوصیات کی بنا پر ہر سیاح کی توجہ فوراً اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔ شور مچاتا کف اڑاتا دریائے چترال شہر کے بیچوں بیچ بہتا ہے۔ چیو پل پر کھڑے ہو کر شہر کا نظارہ کریں یا کسی اور جگہ سے شاہی مسجد کے بلند و بالا مینار اسکا مغلیہ طرز تعمیر اسکے شاندار گنبد سنگ مرمر اور سرخ اینٹیں آپکو متاثر کرنے کے ساتھ ساتھ اسکی مشابہت شاہی مسجد لاہور سے جوڑیں گے۔ کسی اونچی جگہ کھڑے ہو جائیں تو پچیس ہزار فٹ سے بھی بلند تر ترچ میر کی برف سے ڈھکی چوٹی خوبصورت اور منفرد نظر آتی ہے۔

پروین نے گروسری کی خریداری کرنی تھی ایک جنرل سٹور سے جب وہ دال چاولوں کے چکر میں اُلجھی۔ میں گھبرائی شاپنگ سے مجھے ہمیشہ کی چڑ ہے۔ میرے اُلجھے ہوئے استفسار پر وہ بولی تھی۔

''یار کالاش میں چیزیں بہت مہنگی ہیں یہاں سے لے جانے میں کافی بچت ہو جائے گی۔''

اُن سے ایک گھنٹے کی آوارہ گردی کا کہہ کر میں چیو پل پر آ گئی۔ یہ پُل وزیر اعظم بھٹو کے زمانے میں تعمیر ہوا۔ چیو ایک کیلاشی شہری تھا۔

گدلے پانیوں والا دریائے چترال شور مچاتا بہتا ہے۔ دریا کے دائیں ہاتھ مستوج

روڈ ہے جو بونی تک پکی اور شندھور تک کچی۔ بائیں ہاتھ ائیر پورٹ روڈ ہے۔ پل کے ساتھ ہی پہاڑ کا جھکاؤ اتنا خطرناک ہے کہ بس یوں لگتا ہے جیسے ابھی لڑھک کر آ پکے اوپر آ جائے گا۔ یوں تیز بارش اور دھوپ سے اسکے کھوہ میں کھڑے ہو کر بچا جا سکتا ہے اکیلے ہونیکی صورت میں ائیر پورٹ جانے والی کسی گاڑی میں مفت کی لفٹ بھی مل سکتی ہے۔ پل سے اتالیق بازار تک کا راستہ کوئی پون گھنٹے میں طے ہوا۔

بڑے بڑے دروازوں والی دُوکانیں اور لمبی لمبی داڑھیوں والے دوکاندار گاہکوں کو نپٹانے میں مصروف تھے کہیں کہیں نوخیز گل رنگ چہرے بھی بھاؤ تاؤ کرتے نظر آتے تھے۔ بازار کی ایک نمایاں خوبی یہ تھی کہ ہر پچاس گز پر بازار کا نام تبدیل ہو جاتا ہے۔ شاہی بازار، کڑوپ رشت بازار، نیو بازار، اتالیق بازار۔

پجاروں کی جتنی فراوانی مجھے چترال بازار میں نظر آئی وہ میرے لیے حیرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ مسرت بخش بھی تھی۔ واپسی کے لئے میں نے ایک پجارو میں ہی لفٹ لی۔ چیو پل اُتری اور پولو گراؤنڈ روڈ پر بڑھی جہاں میں پروین کو چھوڑ کر گئی تھی۔

ماشاءاللہ چاول دالوں چینی اور دیگر الم غلم چیزوں سے بھرے اُسکے شاپر ایک نئی دوکان کھولنے کا سماں پیدا کر رہے تھے۔ میری صورت پر نظر پڑتے ہی وہ چلائی۔

''سامنے والی دوکان سے آدھ کلو آلو خرید لو رات کے کھانے کے لئے۔''

''سبحان اللہ کتنا شاندار ڈنر ہوگا۔'' اپنے آپ سے کہتے ہوئے میں سبزی والی دوکان کی طرف ہو لی۔ جب پاؤ بھر آلو تل رہے تھے پروین نے میرے پاس آ کر مجھے مزید ایک نوید سُنائی۔ ''قریب ہی میں نے تنور دیکھا ہے۔ دونان وہاں سے پکڑ لیں گے۔''

سوزوکی میں ہماری اور سامان کی لدلدائی کے ساتھ ساتھ دونانوں کو بھی مکمل عزت و احترام کے ساتھ جگہ دی گئی۔

ریسٹ ہاؤس سنسان تھا۔ مرغن کھانوں والی فیملی کوچ کر گئی تھی۔ اور باورچی خانے

میں اُلو بول رہے تھے۔ سرونٹ کوارٹر میں سے خانسامے کو ڈھونڈ کر لائی اور آلو اس کے حوالے کئے۔ ایک نظر اُس نے مجھ پر اور دوسری آلوؤں پر ڈالی اور سر جھکا کر چولہا جلانے لگا۔ اُسکی نگاہ مجھے کہہ گئی تھی ایسی شودی زنانیاں تو میں نے کبھی نہیں دیکھیں۔ گھی پیاز اور نمک اسنے لوگوں کا بچایا ہوا ڈالا آلو اور مرچیں ہماری ڈالیں۔ یوں ڈنر تیار ہوا۔ پروین نے چپہ کھایا میں نے آدھا اور جب باقی نان میں انہیں عنایت کرنے گئی تو دیکھا دونوں خانسامے دوپہر کا بچا ہوا مرغ گوشت اور پلاؤ کھا رہے تھے۔ کھسیانی ہنسی ہنستے ہوئے واپس آ گئی۔

چترال کی اُس اولین شب کو سونے کے لئے لیٹتے وقت میرا جی چاہا کہ سارے کپڑے اُتار پھینکوں۔ میری جس کزن نے موٹے کپڑے لے جانے کا مشورہ دیا تھا ابھی جا کر اسکی چھترول کروں۔ پروین نہا کر لیٹی تھی اور شاید کچھ سکون میں تھی۔ میں نہانے کی ازلی چور بس رات بھر گرمی سے گتھم گتھا ہوتی رہی۔

غریبانہ سے ناشتے سے فراغت پاتے ہی میں پروین سے یہ کہتے ہوئے باہر نکل گئی کہ اب ائیر پورٹ پر ملاقات ہوگی۔ پر وہاں جانے کی نوبت ہی نہیں آئی کہ کتابوں کی دوکان پر دس بجتے ہی لوگوں کی آسمان کی جانب اُٹھتی نگاہوں زبانوں اور ایک دوسرے سے یہ استفسار "کیا فلائٹ آئی ہے؟" نے مجھے سمجھا دیا کہ پروین کی دعائیں کام نہیں آئیں۔

اتالیق بازار کے پُل پر ریلنگ کے ساتھ ٹک کر اک ذرا میں نے نیچے بہتے نالے کے پانی کی روانی کو دیکھا۔ نگاہوں نے لشکارے مارتی دھوپ میں لامحدود وسعتوں والے شفاف آسمان کی سیاہی مائل نیلاہٹوں پر نظر کی۔ پروردگار کی رفعتوں اور عظمتوں کے اس پُر اسرار اور پُر ہیبت اظہار پر میری نظریں زیادہ دیر جمی نہ رہ سکیں فوراً ہی خوفزدہ سی ہو کر سکڑیں اور جھک گئیں۔

پتہ نہیں مجھے وہاں کھڑے کتنی دیر گزر گئی تھی پھر جیسے مجھے محسوس ہوا کہ کوفت بیزاری اور ڈپریشن سا بجلی کی کسی ننگی تار سے نکلتے مدھم کرنٹ کیطرح میرے سارے سر یر میں دوڑنے لگا ہے۔ میں مفلوج ہو رہی ہوں۔ پروین عاطف کے پروگرام اور اسکے منصوبے مجھے اُن بونوں اور رسوں

کی مانند نظر آ رہے تھے جنہوں نے گلیور کو جکڑ کر زمین پر چاروں شانے چت گرا دیا ہو۔ میں زمانے بھر کی آپ پھُدری جب بھی باہر نکلی ہمیشہ اپنے حسابوں چلی۔ دائیں بائیں اور پیچھے نہیں دیکھا۔ آگے دیکھا۔ چترال کے نقشے اور لوگوں نے مجھے بتایا تھا کہ مجھے کہاں کہاں جانا چاہیئے۔ اسوقت میرا جی چاہ رہا تھا کہ اڈے پر چلی جاؤں اور جو لاری گاڑی جہاں بھی کہیں جا رہی ہو اس میں لد جاؤں۔

شہزادہ مطاع الملک کے ہاں وادی شغور میں وادی گرم چشمہ وادی دروش بھر موغلشٹ جیسی دلآویز جگہیں۔ شندھور میلہ میں اپنی لاعلمی سے مس کر بیٹھی تھی کہ جانتی ہی نہ تھی کہ ساڑھے بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر شندھور جھیل کے ہمسائے میں وسیع و عریض سطح مرتفع پر کھیلے جانے والے پولو ٹورنامنٹ کو دیکھے بغیر آپکا چترال آنا اور اس پر کچھ لکھنا ادھورا رہتا ہے۔

کیلاش اور اس کی وادیاں بمبوریت اور ریمبور کا سلسلہ تو پردین کے ساتھ چمٹ گیا تھا۔

دفعتاً مجھے محسوس ہوا آتے جاتے مقامی لوگ مجھے دیکھ رہے ہیں۔ اُنکی نظروں سے بچنے کے لئے میں نے چلنا شروع کر دیا۔ چلتی گئی چلتی گئی۔ پجارو زن زن کرتی میرے قریب سے گذرتی گئیں مگر میں نے کسی کو ہاتھ نہیں دیا۔ مجھے کونسا کہیں حاضری دینی تھی۔

چیوپُل کے پاس ریسٹ ہاؤس کا نوکر رجسٹر ہاتھ میں پکڑے ڈی۔ سی آفس کیطرف جاتا نظر آیا مجھے دیکھ کر رُکا۔ میں نے پوچھا۔

"کیا ایسا ممکن ہے آج تم مجھے اپنے گاؤں لے چلو میں وہاں رات گزارنا چاہتی ہوں۔"

وہ ہنسا۔ میں نے دیکھا تھا طنز سے بھری ہوئی زہریلی ہنسی اُسکے ہونٹوں سے پھسلتی اسکی آنکھوں میں گری اور وہاں سے سارے چہرے پر پھیل گئی۔ اور جب اُس نے رخ پھیر کر میری طرف دیکھا اور کہا۔ "آپ نے وہاں جا کر کیا کرنا ہے؟"

مجھے محسوس ہوا تھا زہرا سکے لہجے میں عود آیا تھا۔

''کچھ جاننا چاہتی ہوں تم لوگوں کے بارے میں۔''

میں نے اپنے سامنے بہتے دریائے چترال اور شور مچاتی موجوں پر نظریں جمائے جمائے کہا۔

''ہمارے پاس غریبی کے دکھوں کے سوا ہے کیا جس کے لئے آپ وہاں جانے کی خواہشمند ہیں۔ میرے بوڑھے باپ نے سولہ سال کی چھوکری سے بیاہ کرلیا ہے۔ اُس چھمک چھلو نے میری بیوی اور بچوں کو نتھ ڈال رکھی ہے۔ میرا باپ ایسا زن مرید کہ مجال ہے جو ایک لفظ بھی بولے۔ سارا وقت تو تو میں میں اور کل کلیان میں گزرتا ہے۔ پھر وہ بڑی قطعیت سے بولا۔ وہ بڑی باجی وہاں ریسٹ ہاؤس میں بہت پریشان بیٹھی ہیں۔ جہاز نہیں آیا نا۔ انکے لوگ نہیں پہنچے۔ آپ جا کر انہیں تسلی دیں۔''

ریسٹ ہاؤس کے ٹی۔ وی لاؤنج کی میز پر کچی کلیجی شاپروں میں لپٹا چھوٹا اور بڑا گوشت لہسن اور پیاز کے پیکٹ بکھرے پڑے تھے۔ یہ خریداری پروین نے سویرے سویرے کی تھی۔ دوکانیں پو پھٹے کھل جاتی ہیں۔

چترالی صحت کے اُس زریں اصول ''جلدی سوؤ اور جلدی اٹھو'' کی عملی تفسیر ہیں۔ صوفے پر بیٹھی پروین چپ چاپ دروازے سے باہر لان میں پھیلی دھوپ اور اس دھوپ میں نہاتے سامنے پھیلے پہاڑوں کو دیکھ رہی تھی۔ میں نے خالص مسلمانی طریق سے پروین کی دلداری کی۔ ''اللہ کی کوئی مصلحت ہوگی اسمیں بھی باجی۔ چھوڑیئے آیئے چائے پیتے ہیں۔''

چائے کے گھونٹوں میں اگر میں نے اپنا پوشیدہ اضطراب حلق میں اُتارا تھا تو یقیناً پروین نے بھی ایسا ہی کیا تھا کہ جب ہم نے کپ تپائی پر رکھے تو خاصی ہشاش بشاش تھیں۔

باہر بہت گرمی تھی۔ ساڑھے بارہ بج رہے تھے۔ ٹھیک ایک بجے ہم نے لنچ کیا جو بلا شبہ ہماری اوقات کے مطابق تھا۔ تھوڑا سا آرام کرنا ضروری سمجھتے ہوئے لیٹیں۔ تین بجے جب ہم

باہر نکلیں تو جن ہواؤں نے بڑھ کر ہمارا استقبال کیا وہ اگر دوزخ سے نہیں تو جنت سے بھی نہیں نکلی تھیں کہ تند و تیز ہونے کے ساتھ ساتھ نیم گرم بھی تھیں۔ شاہی مسجد کے اندر پروین میری ترغیب پر گئی۔

''چلو نہ چل کر دعا مانگتے ہیں کہ کل آپکا جہاز آ جائے''۔ یہ عصر سے پہلے کا وقت تھا مسجد میں فقہ حدیث اور قرآن پاک حفظ کرنے والے بچے ٹولیوں کی صورت ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ اندر داخل ہوتے سمے کچھ ڈر لگا چترالیوں کی مذہبی وابستگی کی شدت سے آگاہی تھی۔ خوف تھا کہ کہیں نکالی ہی نہ جائیں۔ صد شکر کہ خیریت رہی برآمدے میں کسری نماز پڑھی۔ جب ہاتھ دعا کے لئے اٹھائے تو کھلی آنکھوں نے مسجد کے اندرونی حصے کے نقش و نگار کی دلفریبی کو دیکھا لیکن وہ لمحہ ایسا تھا کہ میں کسی ذی روح یا کسی شے کے دنیاوی حسن سے متاثر ہونے یا داد دینے کے موڈ میں نہیں تھی۔ پروین بھی آنکھیں بند کئے ہاتھ پھیلائے بیٹھی تھی۔ میں جانتی تھی کہ وہ کیا مانگ رہی ہے۔ ہاتھوں کے پھیلانے اور سکیڑنے میں صرف دو پل ہی لگے ہوں گے۔ جب میں کھڑی ہوئی مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرے اور اوپر والے کے درمیان دوبارہ دنیاداری کے دبیز پردے حائل ہو گئے ہیں۔

شاہی مسجد سے نکل کر ہمارا رخ شاہی قلعے کی طرف تھا۔ وہی مغلیہ طرز تعمیر شالا مار باغ کے مین گیٹ جیسا دیوہیکل پیتل کے کیلوں والا چوبی دروازہ۔ ویسی ہی چھوٹی سی کھڑکی جس سے اندر داخلہ ہوا۔ دائیں بائیں درمیانی راستے کو چھوڑتے ہوئے دو ڈھائی فٹ اونچی اور اُتنی ہی چوڑی کُرسی پر بھاری بھر کم ستونوں کے آگے جو کوٹھڑیاں امتداد وقت کے ہاتھوں خورد بُرد ہو رہی تھیں یہ کبھی پہرہ داروں اور سنگین برداروں کی آماجگاہ تھیں۔ آج جو ہم یوں دندناتے اندر داخل ہوئے تھے کہیں سو سال قبل میرا اندر دھرا پہلے قدم والا پاؤں انکی بندوقوں کی زد میں ہوتا۔ داہنے ہاتھ والا زینہ اوپر بالکونی میں جاتا تھا۔ بالکونی کے تختے بھی سال خوردہ ہو کر ٹوٹ پھوٹ رہے تھے۔ تاریک ڈیوڑھی کے آگے چوبی دروازے سے نکل کر کشادہ میدان نظر آتا ہے۔ بائیں ہاتھ

کی فوجی بارکیں مکمل طور پر زمین بوس ہیں۔ دائیں ہاتھ کے مخروطی برآمدوں والے کمرے جو کبھی حکومت کے اعلیٰ عہدیداروں کے لیے مختص تھے آج بھی کسی قدر قابل قبول حالت میں ہیں۔ سامنے والے کمروں کی منفرد طرز تعمیر کی صرف ایک ہلکی سی جھلک یہ بتاتی تھی کہ یہ خاص کمرے ہوں گے اور واقعی یہ مہتر چترال کا دفتر مالیات تھا۔ آنگن میں چنار کے بلند و بالا درخت کے نیچے ایک کونے سے دوسرے کونے تک ڈھولچیوں سازندوں اور موسیقاروں کی جگہ تھی جو کبھی یہاں اپنے فن کا جادو جگاتے ہوں گے پر اب تو چنار کے خاموش کھڑے درخت کے سوا اگر کچھ تھا تو وہ ویرانی سناٹا خوف اور دنیا کی بے ثباتی کا احساس۔

دائیں بائیں سے نگاہیں اُٹھا کر سامنے پھینکیں تو ٹوٹ پھوٹ کا وہاں بھی ایک ایسا سلسلہ نظر آ رہا تھا۔ جولہروں کی صورت دُکھ اور کرب سارے شریر میں پھیلاتا جاتا تھا۔ میں بھی اسی کرب کے بوجھ تلے سسکتے ہوئے مختصر سی راہداری سے اگلی سمت آئی تو سامنے کا منظر کسی قدر مسحور کن تھا۔ موڑ کاٹتا دریائے چترال اور دوسرے کنارے پر چمکتے ٹین کی چھتوں والے خوبصورت گھر۔ اس حسین نظارے سے آنکھیں سینکنے کے بعد دائیں طرف کی نگاہ پھر یاس کی دلدل میں دھکیل دیتی ہے۔ طویل راہداری پر مشتمل اوپر کی منزل کی بالکونی جہاں مہتر چترال کھڑے ہو کر عوام کو اپنا دیدار کرواتے اور خطاب کرتے تھے۔

بیچاری غریب عوام مہتر کے قدموں سے تیس فٹ نیچے کھڑی ہوتی۔ پر زمانہ ماضی کا ہو یا حال کا مہتر ہو حاکم ضلع یا کوئی اور بڑا آدمی۔ یہ فاصلہ تو آج بھی جوں کا توں برقرار ہے۔

داہنے ہاتھ کی چوبی بالکونیوں سے اگلے کمرے جو چوب کاری کا بہترین نمونہ تھے وزراء کے لیے مخصوص تھے۔ آگے تہہ خانے قیدیوں کے لیے اُنکے ساتھ ہی بلند و بالا بُرجیاں بندوق برداروں کے لیے کہ دریا پار سے کوئی دُشمن حملہ نہ کرے۔

ماضی کے اس شکستہ ٹوٹے پھوٹے قلعے سے ٹرن لے کر جب آگے بڑھیں تو گیروے رنگ کی دومنزلہ برامدوں اور شہ نشینوں والی عمارت نظر آئی۔ پہلی منزل کے برآمدے اگر پرانی

توپوں کے نمونوں سے سجے ہوئے ہیں تو بالائی منزل کے برآمدوں کی دیواریں مارخور جنگلی گائے کے سینگوں سے مزین ہیں۔ بجری بچھی روش پر آگے چلتے ہوئے ڈیوڑھی میں بچھے بینچ پر جس آدمی نے عقاب کی طرح جھپٹ کر ہماری پذیرائی کی وہ ادھیڑ عمر ضرور تھا پر آواز کی گھن گھرج اور لہجے کی کرخت توانائی اُسے معمر کہاں ظاہر کرتی تھی۔ دہل کر میں پیچھے ہٹی۔ قلعے میں آنا منع ہے۔ اُسکی نیلی کچور آنکھوں میں برہمی اور سُرخ و سفید رنگت میں خون جیسی لالی تھی۔ میں نے مسکینی اور عاجزی سے مدعا گوش گزار کرنا چاہا جب کسی خونخوار بگیاڑ کی طرح اسکی ''نہیں'' قلعے کے طول و عرض میں گونجی۔ سہم کر میں نے پروین کی طرف دیکھا جس نے زیرلب اُسے لعن طعن کرتے ہوئے مجھے کہا آؤ چلیں۔

میں نے گھائل نظروں سے اُسے دیکھتے ہوئے جیسے کہا۔ ''آؤ چلیں۔ کہاں اور کیوں پینی باجی۔'' آپکی جیب میں پرنس محی الدین کا جو کارڈ ہے یہ کب کام آئے گا۔ میں قلعے کے اندر محل میں جانا چاہتی ہوں۔ جہاں اس جیالے مہم جو اور بہادر پرنس سیف الرحمن کی پری پیکر محبوبہ ہے جو دیر کے نواب کے کسی بیٹے کی منگیتر تھی۔ وادی کی سڑکوں پر سپورٹس کار دوڑانے اور ان خوفناک پہاڑوں میں جہاز اُڑانے والے اس شہزادے نے سینہ تان کر کہا تھا۔ وہ میری پسند ہے۔ اسے کوئی مجھ سے کیسے چھین سکتا ہے۔ اور اسکی اس بات پر ریاست دیر اور چترال ایک دوسرے کے مدمقابل آ کر کھڑی ہوگئی تھیں۔ مجھے تو اُسے دیکھنا ہے اس سے باتیں کرنی ہیں۔

پرنس محی الدین سے ہی تو ملنے جارہی ہوں۔ انہوں نے میری دل گرفتگی کم کرنے کی کوشش کی اور جب ہم قلعے کی کچی دیواروں کے ساتھ باہر جانے والی سڑک پر رواں تھے ہمیں وہ جرمن ملے تھے انہیں بھی اُس نیلی کچور آنکھوں والے سے شکایت تھی۔ ہلمٹ روسومیئر Rosemaire اور Holfelner سے کافی دیر ہا کی اور سیاست پر باتیں ہوئیں۔ میرے چہرے پر بشاشت آئی کہ میں ایک نئے منظر میں داخل ہوئی تھی۔ زرگراندہ محلے میں چترال کی اہم سیاسی شخصیت پرنس محی الدین کی سرگرمیوں کا مرکز ایک لمبی چوڑی عمارت اور

لان کی صورت سامنے تھا۔

یہاں خدام بھی بہتیرے تھے اور چائے پانی کی بھی فراوانی تھی۔ پر صاحب کے بارے میں معلومات کی بہت کمی تھی۔ سیاست اسی کا نام ہے۔ لان میں بیٹھے ابھی زیادہ دیر نہ گزری تھی جب گیٹ سے ایک لینڈ کروزر اندر آئی اور اس میں سے ایک ہنستا مسکراتا دلدار سالڑ کا برامد ہوا۔ جوشند ھور ٹاپ سے آ رہا تھا۔ لمبے اور دشوار گزار سفر کی گرد لینڈ کروزر اور جوان چہرے پر چھائے ہونے کے باوجود دونوں جوانی کی بشاشت اور تازگی سے پور پور بھرے پڑے تھے۔ پروین سے تھوڑی دیر گپ شپ۔ بابا کے بارے میں مکمل لاعلمی۔ اب یہ پروین کی خوش قسمتی کہ جب واپسی کے لیے نکل رہے تھے پرنس محی الدین کی پجارو زن سے پاس آ رکی اور پھر الہ دین کے طلسمی چراغ کی طرح گاڑی کا مسئلہ حل ہو گیا۔ اور جب چترال کا چہرہ تاریکی کی زلفوں سے گہنا رہا تھا ہماری مارچ پاسٹ دینین ریسٹ ہاؤس کی طرف رواں دواں تھی۔

چترال ائیر پورٹ پر مشی خان کی آمد لوگوں کے لیے جیسے خوشبو کا ایک خوشگوار جھونکا تھی۔ اب ایسے میں اظفر جیسے نوجوان اسسٹنٹ کمشنر کا ائر پورٹ پر گھومنا اور پینی باجی کو خوشدلی سے گاڑیاں فراہم کرنا سمجھ میں آتا تھا۔

پینی باجی نے لمبا سانس بھرا تھا اس سانس کے ہر تار میں شکریے کے جذبات تھے۔ کہ انکا عملہ آگے پیچھے کے دونوں جہازوں میں پہنچ چکا تھا۔ ریسٹ ہاؤس میں اُس قلانچیں بھرتی شوخ وشنگ ہرنی کو چائے پینی دو بھر ہو گئی تھی کہ وہ فی الفور بازار جا کر اپنے یار دوستوں کو فون کرنا چاہتی تھی۔ چیو پل سے اتالیق بازار کے آخری کونے تک مشی خان کی آواز کی بھرپور گونج تھی۔ ساتھ نشیلی آنکھوں اور بونے سے قد والی زیب چودھری بھی تھی۔ شاہی بازار کے کارنر سٹور پر کال پہ کال ہو رہی تھی اور پینی باجی کا دل دھڑک دھڑک پڑتا تھا کہ بل معلوم نہیں کتنا آئے گا۔

''ارے آپ چپکی رہیئے ادھر اُدھر کھسک جایئے کرنے دیں انہیں خود پے منٹ''

میں نے ذرا تسلی دی۔

میں ایک جنرل سٹور میں بیٹھی تھی جب پینی باجی چنگیر میں تنوری نان پر گرم گرم تکے لیے میرے پاس آئیں۔ کیسا ممتا بھرا لہجہ تھا انکا جب وہ بولیں ''لوتم کھاؤ''۔

ہم دونوں جب بُرکیاں توڑ توڑ کر کھا رہی تھیں انہوں نے بتایا تھا پورا عملہ سیخ کبابوں کی دوکان پر کھڑا موج میلے کر رہا ہے دوکاندار کی تکوں کی پرات خالی ہوگئی ہے۔ میں بہت خوش ہوں آخر ان لوگوں کی کمائی کا ذریعہ ہم جیسے لوگ ہی تو ہیں۔

مشی خان کے لیے اُنکا سکڑتا دل مقامی غریب لوگوں کے لیے کیسا دریا بنا ہوا تھا۔

سچی بات تھی کہ سارے بازار میں تھرتھلی مچی ہوئی تھی۔ اسسٹنٹ کمشنر اظفر کی جیپ سڑکوں پر دندناتی پھرتی تھی۔ مشی خان اور زیب چودھری سروں پر ہیٹ دھرے جانے کہاں کہاں خجل ہوتی پھر رہی تھیں۔ ڈرامے کا ہیرو ظل عاطف لونگ بوٹس اور واسکٹ کی تلاش میں دوکانوں میں کہیں گم تھا۔

ایک بج رہا تھا اور چترال سے نکلنے کی مجھے کوئی صورت دکھائی نہ دیتی تھی۔ شاہی قلعہ روڈ کے کونے پر کھڑی میں اس تماشے کو دیکھنے کے ساتھ ساتھ ''آج کا دن بھی ضائع ہی ہوا'' کے احساس پر کڑھ رہی تھی۔ چترال کی یہ دوپہر ۳۵ سینٹی گریڈ کے نیچے جل بھن رہی تھی۔ جب پروین گروسری کی دوکان سے نکلی۔ قریب آئی اور بولی۔ پشاور ٹی وی کی آرٹسٹ عفت صدیقی جس نے ڈرامے میں کالاشی بوڑھی عورت کا کردار کرنا تھا ابھی تک نہیں پہنچی۔ ٹیم نے تمہیں یہ کردار دینے کا فیصلہ کیا ہے۔

مجھے یوں محسوس ہوا جیسے پروین کے ہاتھوں میں سنہری و سرخ پنی سے منڈھی اور کروشیے کی لیس سے بجی رنگین ڈنڈی والی پنکھیا ہے جس نے مجھے ہوا دینی شروع کردی ہے اور حرارت میں ڈوبا میرا وجود یکدم لطیف سی خوشگواری محسوس کرنے لگا ہے۔ اسوقت میں کہیں کسی گھی شکر والی پرات پر بیٹھی ہوتی تو پروین کا منہ میٹھے سے بھر دیتی۔ مجھے نیلی چھت والے پر بے اختیار ہی بہت پیار آیا۔ نیازمندی اور عاجزی کا گداز پن میرے قلبی محسوسات کو رقیق کرنے لگا۔

مدتوں سے دماغ میں اظہار خودنمائی کا ایک کیڑا کلبلاتا رہا ہے۔ جو یقین دلاتا تھا کہ اگر گلوکاری کے میدان میں کودوں گی تو جھنڈے گاڑ دوں گی۔ اگر اداکاری کروں گی تو کشتوں کے پشتے لگاتی ہوئی شہرت کے چوبارے کی مٹی پر جا بیٹھوں گی۔

باب نمبر۔۳

کوہ قاف کی پریاں۔ یونانی لڑکیاں

کراکال اور جستھاکن

جیپوں میں سامان کی لدلدائی اور ٹھونسا ٹھونسی بے سلیقگی اور بے ہنگم پن کو نمایاں کرتی تھی۔ پر جونہی ان پر کاجل سے بھری آنکھیں مٹکاتے اور ادائیں دکھاتے دو وجود بیٹھے سب کچھ جیسے پس منظر میں چلا گیا تھا۔

گاڑیاں پشاور روڈ پر تیزی سے آگے پیچھے دوڑ رہی تھیں۔ تقریباً کوئی پون گھنٹے کی ڈرائیو کے بعد سب سے اگلی گاڑی مین روڈ چھوڑ کر ڈھلانی راستے سے نیچے اُترنے لگی۔ ''آیون آ گیا ہے۔'' ڈرائیور نے کہا میں نے دائنی طرف دیکھا تھا اور ڈرائیور کو گاڑی روک دینے کے لیے کہا۔ نیچے اُتر کر سامنے دیکھا۔ سورج کی سنہری چمکیلی چھتنار کے نیچے بلند و بالا سنگلاخ خاکستری پہاڑوں کے دامن میں گھرے سنہرے میں لپٹی وادی نظروں کو حُسن کے نشیلے جام پلانے لگی تھی۔ دریائے چترال اسوقت چاندی کی کسی موٹی لکیر کی مانند آیون کے گرد نیم دائرہ بناتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔ چوکور اور تکونے کھیتوں کے ٹکڑے یوں جان پڑتے تھے جیسے وسیع و عریض قطعہ پر جا بجا سبز قالین بچھے ہوں۔ بلندی سے نشیب کے اس منظر کی دید اسے کچھ زیادہ ہی قاتل بنا رہی تھی۔

معلق پُل سے گزرنے کا تجربہ بہت دلچسپ ہے۔ چھن چھن ہوتی ہے جیسے کہیں پازیبیں بجتی ہوں۔ دریا کی ٹھنڈی ہواؤں میں لپٹے جھلار سے ملتے ہیں جیسے جھولے کو ماں کا ممتا بھرا ہاتھ جھلاتا ہو۔

معلق پُل سے اُترتے ہی گھنے سرسبز درختوں نے اپنی آغوش میں لے لیا۔ پھر ایک اور پُل آیا جسکے نیچے دریائے کیلاش جھاگ اُڑاتا رواں دواں تھا۔ آیون مرکزی وادی ہے۔ کیلاش کی تینوں وادیوں بمبوریت، ریمبور اور بریر کو یہیں سے راستے جاتے ہیں۔

گاڑیاں گُرد بازار میں شہتوت اور اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں تلے جا کر رُک گئیں۔ ساتھ ہی صحن بازار تھا۔ بازار کیا تھا چند دوکانیں تھیں۔ رُکنے کی وجہ عفت صدیقی کے چترال پہنچنے کی اطلاع تھی جسے اے سی صاحب کی ذاتی گاڑی لا رہی تھی۔

اور شیخ جی کی کچے انڈوں والی ٹوکری ٹوٹ گئی تھی جسنے صرف پندرہ کلومیٹر پر محیط آدھ گھنٹے کی ڈرائیو میں انڈوں سے مرغیوں بھیڑ بکریوں گائے بھینسوں اور زراعتی فارم تک کے جان لیوا مرحلے پل جھپکتے میں سکھ سکون سے طے کر لیے تھے۔

''چلو دفع کرو۔ گولی مارو۔ چولہے میں پھینکو شہرت کو۔ آیون کی سیر کرتے ہیں۔'' میں نے اپنے آپ کی دلداری کی۔

پشاور روڈ پر کھڑے ہو کر وادی کے جس نظارے نے قلب ونظر کو جتنا مسحور کیا تھا وادی کے اندر اُتر کر اتنی ہی مایوسی ہوئی۔ گلیاں اور گھر پنجاب کے کسی اُجڑے پُجڑے گاؤں جیسے نظر آتے تھے۔ بے ڈھبے سلیقے طریقے اور صفائی ستھرائی سے عاری گھروں کے آنگن۔ پاؤں راستوں میں بکھری دھول مٹی میں اٹ گئے تھے۔ بہر حال میرے نصیب کا جو آب ودانہ جس جس گھر میں دھرا تھا وہ سب میں نے سمیٹا۔ کہیں نماز پڑھی کہیں چٹائی بنتے دیکھی۔ کہیں کسی نوزائیدہ بچے کے چہرے کو سرونگ (بالوں کی صفائی کے لیے بکری کے جلے سینگوں کا پاؤڈر) میں لت پت دیکھا۔ اور جب گھنٹے بھر کی آوارہ گردی کے بعد آئی۔ پروین کا غصہ ناک پر دھرا تھا۔ پوری بتیسی کھول کر میں نے اُسکے غصے کو شہد بھرے چمچ کی طرح حلق میں اُتار لیا تھا۔

ریت اور مٹی اُڑتی تھی۔ راستہ اکثر وبیشتر مقامات پر تنگ اور عمودی تھا کہ ذرا سی بے احتیاطی کسی حادثے کا فوری سبب ہو سکتی تھی۔ کٹے پھٹے بنجر اور پُر ہیبت پہاڑ سڑک کی بعض جگہوں

پر ڈراؤنے جنوں کی طرح دانت نکوسے جیسے آپکو اپنے آہنی پنجوں میں دبوچنے کے لیے تیار۔ جہاں چڑھائی کے موڑ آتے اور گاڑی ٹرن لیتی تو عقبی منظروں میں برفانی چوٹیوں کی ننگی وحشت بسا اوقات جسم پر لرزہ سا طاری کر دیتی۔ دریائے کالاش کی گہرائیاں کہیں بصارت میں اور کہیں اُس سے کوسوں پرے۔

مجھے دکھ ہوا تھا کیلاش کی وادیاں اپنے قدیم تہذیبی ورثے اپنے عقائد و رسوم اپنی پراسراریت اپنے انوکھے رنگوں ڈھنگوں اور پُر بہار تہواروں سے اندرون اور بیرون ملک سیاحوں کے لیے دلچسپی کا باعث ہیں۔ کیا تھا جو سڑکوں کا ناک نقشہ ذرا ڈھنگ کا ہو جاتا۔

میں نے اب تک کے سفروں میں بالعموم ڈرائیوروں کو از خود ہی گائیڈ کے فرائض سنبھالتے ہوئے دیکھا تھا۔ پر میرے ساتھ بیٹھا ہوا یہ نوجوان سالڑکا جسکی پیشہ وارانہ مہارت عمودی چڑھائیاں چڑھنے ریورس کرنے اور گاڑی سے بغل گیر ہونے کے لیے بیتاب چٹانوں کے شر سے اُسے محفوظ رکھنے میں بلاشبہ بہت مستند تھی سارے راستے جبڑوں کو یوں بھینچے بیٹھا تھا جیسے اُسے دندل کا دورہ پڑا ہو اور جسکی کھولائی بڑے سے چمچ کے بغیر ممکن ہی نہ ہو۔

نیچے چند زیر تعمیر عمارتوں کو دیکھ کر دو بار انکے بارے میں پوچھا تھا۔ تب کہیں جا کر سنا کہ ''آیون کے لئے بجلی گھر زیر تعمیر ہے۔'' دو دریائی نالوں کے ملاپ کے بارے میں جاننے کا بھی یہی حال ہوا۔ مجھے تپ چڑھی۔ جھلا کر بولی۔

''گونگے کا گُڑ کھائے بیٹھے ہو۔ بتاتے نہیں۔ کچھ جاننے کے لیے یہاں ہجل ہو رہے ہیں۔''

''نالہ بمبوریت اور نالہ ریمبور۔'' جواب میں بے نیازی سی بے نیازی تھی۔

پھر ایک پل پر کراسنگ ہوئی اور گاڑیاں دوباش چیک پوسٹ پر رُک گئیں۔ یہاں تھوڑی سی شوٹنگ ہوئی۔ اس چیک پوسٹ کے پہلو سے ایک راستہ دائیں جانب ریمبور اور بائیں جانب والا بمبوریت کیطرح جاتا ہے۔

صد شکر کہ یہاں پروانہ راہداری پاکستانیوں کے لیے بیس اور غیر ملکیوں کے لئے پچاس روپے تھا۔ چلو کہیں تو فارنرز کے مقابلے میں ان بے چاروں کو بھی عزت و تکریم ملی۔ چیک پوسٹ کا انچارج بڑا خوش و خرم اور چہچہانے والا مرد تھا۔ اسکی چترالی ٹوپی پر لہراتے مرغ زریں کے پر سیاہ لباس گوری رنگت اور ہنستا مسکراتا چہرہ بے رونق پہاڑوں سے گھری اُس اُداس سی شام میں تھوڑی سی رنگینی اور زندگی پیدا کرنے کا موجب تھا۔ انگریزی میں سڑک کے ایک طرف نصب بورڈ پر سیاحوں کے لیے ہدایت نامہ درج تھا کہ انہیں کیا کرنا ہے اور کیا نہیں کرنا۔

جب راستے کی تنگی کشادگی میں بدلنے لگی جب ہرے بھرے کھیتوں درختوں اور شام کی سرد ہواؤں نے استقبال کیا۔ تب اُس لڑکے کی دندل ٹوٹی۔ پتہ نہیں کیسے وہ بولا اور خوب بولا۔

''بمبوریت تقریباً بارہ گاؤں پر مشتمل کالاش کی سب سے بڑی وادی ہے۔ چترال سے اس کا فاصلہ کوئی ۳۸ کلومیٹر ہے۔ پہلوواندہ، کندیسار، احمد آباد میں مسلمانوں کی اکثریت جبکہ کراکال، انشیر برون اور بتریک میں کالاشیوں کی کثرت اور شیخاندہ میں مکمل مسلم آبادی ہے۔''

مکئی اور گندم کے کھیت، درختوں کے سلسلے اور مکانات۔ پھر جیسے اس منظر میں سڑک کے کنارے چلتی چند کیلاشی لڑکیاں اُبھریں۔ اُجلی رنگت سیاہ پیرہن اور رنگ رنگیلے موتیوں ہاروں سے مزین۔ گھنیری راتوں میں جیسے چاند چمکے۔

پتہ نہیں مجھے کیا ہوا جیسے دل کسی نے مٹھی میں دبوچ لیا۔ بہت پرے بہت دُور گاؤں میں لالٹین کی روشنی میں کہانیوں کی کتاب ہاتھ میں تھامے چوتھی جماعت میں پڑھنے والی وہ لڑکی سامنے آ گئی تھی۔ جو پوہ ماگھ کی سرد تاریک راتوں میں پڑھتی تھی۔ بہت دور اونچے اونچے پہاڑوں سے بھی دور دریاؤں اور سمندروں سے بھی پرے ایک مُلک تھا جس کا نام کافرستان تھا وہاں پریاں رہتی تھیں۔ اور آج بہت دور دریاؤں سے دور پہاڑوں سے دور ایک جگہ کافرستان اس میں رہنے والی پریاں انکی صورتیں انکے پہناوے انکے زیور۔ میرے بچپن کی ساری فینٹیسی مجسم ہو کر میرے سامنے تھی۔

سڑک کے ساتھ ساتھ درخت چلتے تھے۔ پس منظر میں کھیت اور پہاڑ چلتے تھے پھر جیسے ہوٹلوں کی بارات چلنے لگی۔ بے نظیر، تاج محل، فرنٹیر، ٹورسٹ، کیلاش، جناح اور لاہور ہوٹل۔ غیر ملکی اور ملکی سیاح کندھوں پر کیمرے لٹکائے بازار میں دوکانوں اور سڑکوں پر بکھرے پڑے تھے۔

فضا میں خنکی تھی۔ نورستان کے پہاڑوں سے آنے والی ہواؤں نے ململ کی قمیض اور ڈوپٹے میں لپٹے وجود کو ہلکی سی کپکپاہٹ دے کر اُسے سکیڑنے کی کوشش کی تھی۔

اور یہاں سڑک ختم ہوتی تھی۔ وادی ختم ہوتی تھی اور یہیں ایک جیسے پہاڑوں درختوں ندی نالوں اور کھیتوں کھلیانوں میں وہ لائن بھی تھی جسکے آر پار دو ملک بستے تھے۔ اس وادی کے آخری کونے میں وہ ریسٹ ہاؤس تھا جس کے لان میں جانے کب سے اخروٹ کا قدیمی درخت پر پھیلائے کھڑا تھا جس کے نیچے بچھی کرسیوں میں سے ایک پر میں بیٹھی۔ اور سامنے اور پشت کے پہاڑوں سے آنے والی افغانی ہواؤں میں سانس لیتے ہوئے ان جھنجھٹوں اور جھمیلوں کو دیکھنے لگی جس میں پروین عاطف اُلجھی ہوئی تھی۔

رات کو ڈرامہ ''دروازہ کھلا رکھنا'' کی شوٹنگ تھی۔ کافرستان کی اصلی پریوں اور نقلی پریوں کی۔ نقلی پریوں کے سیاہ سنگھاش (سیاہ چوغے) کوپیسی (کوڈیوں والی ٹوپی) نیلے پیلے ہاروں کے بنڈل بیڈوں پر بکھرے پڑے تھے اور تیاریاں زور شور سے جاری تھیں۔

ٹارچ کی روشنی کا چھوٹا سا دائرہ تاریک اور ڈراؤنی رات کے سینے میں کسی تیز اور نوکیلے برمے کی مانند سوراخ کرتا اور راستہ دکھاتا جس پر میں ہانپتے کانپتے گرتے پڑتے رُکتے سانس درست کرتے چلتی جاتی تھی۔ پہاڑ کی اس چوٹی پر گھروں کے اوپر چارسو (ڈانس گھر) کی جانب ملکی وغیر ملکی لوگوں کے ساتھ مقامی آبادی کے لوگ بھی رواں دواں تھے۔

اوپر لالٹینیں جلتی تھیں اور ڈھول بجتا تھا۔ ویڈیو کیمرے کی روشنیاں سیٹ ہو رہی تھیں۔

اونچے اونچے قہقہے سیٹیاں اور آوازوں کا شور سناٹے کو لیر لیر کرتا تھا۔

پھر سین شروع ہوا۔ دو معمر مرد برچھی نما لاٹھیاں ہاتھوں میں تھامے نظریں جھکائے

دائرے میں داخل ہوتے ہیں۔ ایک اجنبی زبان کا گیت فضا میں بکھرتا ہے۔ ھوھو کی آوازوں کا شور مچتا ہے۔ مشی خان کو اپنے گھیرے میں لیے خواتین چاروں طرف دائرہ بناتی آہستہ آہستہ ھوھو کی لمبی ہیکوں کے ساتھ آگے پیچھے ہوتی ہیں۔ گیت ختم ہوتا ہے۔ ڈھول کی دھما دھم اور سیٹیوں میں تیزی آتی ہے۔ رقص بھی تیز ہوتا ہے۔ فلیش کی روشنی میں انکے تروتازہ چہرے سیاہ لبادے رنگین ہاروں کے گچھے ٹوپیوں پر مرغ زریں کے پروں کے گچھوں سے بنے پھول سبھی ماحول کو سحر زدہ سا کرتے ہیں۔

یہ گنہگار آنکھیں اب تک رقص کے نام پر جسمانی اعضا پھڑ کانے مٹکانے بے ہنگم اُچھل کود اور جذبات برانگیختہ کرنے والی حرکات ہی دیکھتی چلی آئی تھیں۔ اس ٹھنڈے سے چل چلاؤ دھیرے دھیرے دھول اُڑاتے آگے پیچھے جاتے پاؤں اور ھوھو کی آوازوں والے رقص جس کی چاروں کھونٹ دھوم تھی اور جسے دیکھنے کے لئے دم نکلا جاتا تھا۔ کو دیکھ کر قدرے مایوس ہوئی تھی۔ اُس کالاشی لڑکے کی بات دل کو لگتی تھی جس نے نیچے سے آنے والے لڑکوں کی لوفرانہ حرکات پر سیخ پا ہو کر کہا تھا۔

''یاد رکھیں یہ ہماری عبادت ہے۔''

نور پیر کے تڑکے آنکھ کھلنا میرا ہمیشہ کا معمول ہے۔ ریسٹ ہاؤس میں سارا عالم ابھی سوتا تھا۔ باہر مظاہر فطرت جاگتے اور دل لبھاتے تھے۔ نماز کے لئے مسجد بھی نظر آ گئی تھی۔ بلند و بالا چوبی ستون اپنے ڈیزائن اور بناوٹ و قامت کے اعتبار سے وادی کی طرح ہی منفرد تھے۔ مرکزی دروازے پر 'زخاک آفریدہ خداوند پاک پس ای بندہ گی کن جونمرگ' لکھا ہوا تھا۔

نمازی جانے کہاں تھے۔ مسجد میں سناٹا تھا۔ برآمدے کے چوبی ستونوں کا گہرا فیروزی مائل سبز رنگ بولتا تھا۔ پتھروں اور شہتیروں سے بنے صحن کے نیچے تہہ خانے میں بہتے کھال پر وضو کے لیے جگہ اور بیت الخلا تھے۔ فرش پر خشک نرم گھاس صفوں کی مانند بکھری پڑی تھی۔ اسی پر

ماتھا ٹیک دیا۔

میرے اندر دُکھوں کا بھانبڑ جلتا تھا۔ مجھے فکریں مضطرب رکھتی تھیں۔ اندیشہ ہائے دور دراز چین نہیں لینے دیتے تھے۔ دو قطرے آنسوؤں کے کیا نکلے جیسے میرا مُو مُو اسکے حضور ہاتھ باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ ہچکیاں تھیں۔ بھل بھل گرتے آنسوؤں کی برسات تھی۔ پروردگار بیٹی پڑھائی سے فارغ ہونے والی ہے اُسکے لیے نیک لائق لڑکا۔ مولا رشتہ چل کر میرے گھر آئے کسی کو کہنے سے مجھے اپنی سُبکی محسوس ہوتی ہے۔

کچھ پتہ نہیں کب اس بہاؤ میں کمی آئی۔ بس جب سر اُٹھایا تو اشکوں سے بھری آنکھوں نے پہاڑوں کے اوپر سے جھانکتی روشنی کی سنہری کرن کو دیکھا اور وہاں سے نگاہ پلٹی تو سبزے کا دلفریب منظر سامنے تھا۔

کہیں اندر سے یقین و بے یقینی کی کیفیت میں لپٹا سوال ہوا۔ یہ مژدہ قبولیت کی علامت تو نہیں۔ پتہ نہیں میری ذات ہست ونیست کی گھمن گھیریوں میں کیوں اُلجھی رہتی ہے؟

یہاں وارث شاہ کے اس کلام کی صداقت سے بھی انکاری ہے۔

اک لاہ لباس گلوں پھرن اُداس   اک نانوں چاہ نت ہار سنگھار دا اے
اک چُپ چپیتیاں مُراداں پاؤندیاں نے   اک سدا پکاردیاں رِیندیاں نے

ٹھیک ہے اُس نوازنے والے کے رنگ نرالے پر یہ بھی نہیں کہ سدا پکارنے پر تشنہ کام رہو۔ یوں وہ واقعی قبولیت کی گھڑی تھی کہ ایک ماہ بعد مجھے حسب مراد بھی کچھ ملا تھا۔

باہر نکلی مسجد کے دروازے پر دو آدمی بیٹھے تھے۔ کہنہ سالہ اور نوخیز۔ میری وادی کے بارے میں کچھ جاننے کی خواہش پر وہ رعنا نوجوان یوں کھڑا ہوا جیسے کوئی تابعدار شاگرد اُستاد کے سوال کا فوری جواب دینے کے لیے کھڑا ہوتا ہے۔

"یہ بمبوریت کی آخری مسلمان وادی شیخاندہ ہے۔ چلیے آیئے۔" کہتے ہوئے

جب اُس نے قدم اُٹھائے تو ساتھ ہی گائیڈ کے فرائض بھی سنبھال لیے۔افغانستان اسکے ساتھ سر سے لے کر پاؤں تک جڑا ہوا ہے۔

نورستان کے پہاڑوں سے اُترنے والے نالے کے اٹھکھیلیاں کرتے چاندی جیسے شفاف پانی کو سورج کی اُبھرتی کرنوں کی روشنی میں دیکھنا مکئی کے کھیتوں کی وٹوں اور پگڈنڈیوں پر چلنا۔ندی کے پار کے گھروں سے اُٹھتے دھوئیں کی دید۔فشریز ڈیپارٹمنٹ کی سیر حوضوں اور تالابوں میں ٹراؤٹ مچھلی کی پیدائش سے بلوغت تک مختلف مراحل کے نظارے سب دلچسپ اور معلوماتی تھے۔

اب مجھے ناشتے کی ضرورت تھی۔چائے کی طلب تھی۔درختوں پر لٹکتی تازہ خوبانیوں اور شہتوتوں کو میں نے صرف چکھا تھا۔عبدالرب کو خدا حافظ کہہ کر ریسٹ ہاؤس آئی۔یہاں ڈرامے کی اداکارائیں شوٹنگ کے لیے تیار ہو رہی تھیں۔مرد لوگ غالباً لوکیشن کی تلاش میں نکلے ہوئے تھے۔اور پروین عاطف جانے کہاں تھیں۔

تقریباً تین کلومیٹر کا یہ ڈھلانی راستہ تھا جسے پیدل طے کرتی میں کڑاکال پہنچی تھی۔ وادی کے آغاز سے اختتام تک یہی کچی روڈ ہے۔جس کی گہرائیوں میں دریائے بمبوریت شور مچاتا گیت گاتا اُچھلتا کودتا بہتا ہے۔سڑک کے اوپر والے پہاڑ کتنے عاجز اور مسکین سے نظر آتے تھے جھکے ہوئے جیسے کمریں ٹوٹی ہوئی ہوں جیسے آپکو تعظیم دیتے ہوں۔مکئی کے کھیتوں کا ایک سمندر پھلدار درخت دو منزلہ چوبی گھر جنکی کشادہ کھڑکیوں سے اندر کی سیاہی جھانکتی تھی اور پھر وہ اپسرائیں وہ سیاہ پیرہن پہنے موتیوں سیپیوں سے بجی پریاں کہیں کھیتوں میں بکھری کہیں راستوں میں بجی کہیں بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتی آپکو حیرت زدہ کرتی تھیں۔

پر ایک اور منظر بھی خاصا حیران کن تھا تقریباً چھ سات غیر ملکی نوجوان لڑکیاں کیلاشی بچوں کے ایک جم غفیر کے ساتھ بے ڈھبے انداز میں لمبے لمبے ڈگ بھرتی چلی جاتی تھیں جینز کے نیچے موٹے موٹے گورے گورے پاؤں قینچی چپلوں میں پھنسے سڑک کی دھول مٹی سے اٹے پڑے

تھے۔ پتہ چلا کہ یہ ٹولہ یونان ٹیچرز سوسائٹی کی طرف سے ان بچوں کی تعلیم و تربیت کے لیے دو ماہ کے لیے یہاں آیا ہوا ہے۔

یہ Thenvsis Leronnis, Maria Kokicini, Ourenia, Helen Ziti اور Lena Kokin تھیں۔

اب میں ان کے ساتھ ہوئی کہ چلو دیکھیں تو سہی یہ سب ہے کیا۔ سکول میں ٹیننگی پر ان ننھی مُنی بچیوں کے ہاتھ دُھلاتے ہوئے جب ماریا کولیسینی اور ہیلن زٹی نے کلاشوار (کلاشیوں کی زبان) میں انہیں ہدایات دیتے ہوئے بولنے میں جو تیزی اور رفتار دکھائی۔ میں تو حیرت کی جیسے دلدل میں گر گئی۔ پھر وہ اس ریوڑ کو ہانکتی ہوئی کلاس میں لے گئیں۔ اب یہ انکی آرٹ کلاس تھی۔

''یہ یونانی ہیں۔ الیگزینڈر دی گریٹ کی فوج کے اُن سپاہیوں کی اولاد جو بیماری کے باعث یہاں رہ گئے تھے۔ انکے نقوش میں یونان جھلکتا ہے انکے رسم و رواج یونانی تہذیب کے نمائندہ ہیں۔ گریک گورنمنٹ انکی بہبود کے لیے بہت کوشاں ہے۔'' مجھے ہیلن زٹی نے مطلع کیا۔

ان باہر والوں کی ممتا کتنی پھٹی پڑ رہی ہے ان کے لیے۔ میری سوچ میں کڑواہٹ تھی۔ اب حکومت ان کے زمانوں پرانے کلچر رسم و رواج انکی تہذیب کو مسلمان اور عیسائی مبلغوں سے محفوظ رکھنے میں نہایت سرگرم ہے کہ وادی اس کے لیے سونے کا انڈا ثابت ہو رہی ہے۔ دنیا بھر کے سیاح ان انوکھے لوگوں کو دیکھنے کے لیے پینڈے مارتے چلے آتے ہیں۔ کچھ تو سامان انکی دید کا ہو۔ پر آگہی کے اس دور میں جب دنیا گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر گئی ہے اور خود یہ لوگ جو اب تعلیم آرٹ اور علم کے بہاؤ میں بہنے شروع ہو گئے ہیں کب تک نئے رجحانات کے سامنے مدافعت کے بند باندھیں گے۔

ساری دوپہر ان کے دو منزلہ چوبی گھروں کی دید میں گزری۔ شیر خان نامی لڑکا میرا

رضا کارانہ گائیڈ بن گیا۔ سنگلاخ پہاڑوں کی چوٹیوں سے بہتا ٹھنڈا ٹھار پانی ندی نالوں کے ساتھ ساتھ زینہ در زینہ کھیتوں پھلدار اور سایہ دار درختوں سے گھرے یہ گھر جن کے آنگن دیودار جیسی قیمتی لکڑی کے ڈھیروں سے بھرے پڑے تھے۔ چوبی زینے جن پر سنبھل سنبھل کر چلنا پڑتا تھا۔

سیاہی سے اٹے ہوئے گھر کہ یوں گمان گزرے جیسے کوئلے کی کان میں داخل ہوئے ہوں۔ تختوں پر دھرے ایلومینیم چینی اور لکڑی کے برتن۔ تخت پوش اور کسی گھر میں ایک آدھ کرسی میز بھی۔ بڑے کمرے کے وسط میں آگ جلتی تھی اور چیستان (چاول کے بھُس اور رسیوں کی آمیزش سے بنی) چٹائیاں بچھی تھیں۔

کہیں تپاک محبت بھری مسکراہٹیں ٹوٹی پھوٹی باتیں۔ کہیں بے اعتنائی بیزاری سبھی جذبوں سے واسطہ پڑا۔

اب میں تھوڑی دیر کہیں بیٹھنا چاہتی تھی۔ ستانے کو دل کرتا تھا۔ اس گرم دوپہر میں فطرت کا خاموشی سے نظارہ کرنا بھی مقصود تھا۔

شیر خان سے معذرت کرتے ہوئے میں ایک کشادہ سے میدان میں اخروٹ کے گھنے درخت تلے پڑے ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ میرے آس پاس درختوں نے اپنے پھل یوں زمین پر گرائے ہوئے تھے کہ جیسے اپنے مال کی زکوٰۃ نکالی ہو۔ یہ اور بات ہے کہ اس زکوٰۃ کو لینے والا کوئی نہیں تھا۔

گندم کٹ کر سمیٹی جا چکی تھی۔ اور اب ہر طرف مکئی کے ہرے کچور پودوں کا راج تھا۔ انکی ہریالی اور گھنیرا پن آنکھوں کو طراوت اور دل کو شادمانی دیتا تھا۔

میں نے اپنے سامنے دیکھا تھا۔ خاموش پُر اسرار بھید بھرے پہاڑ جانے کب سے کھڑے تھے۔ وادیوں کی خوشیوں غموں کے بے زبان سنگی۔ انکے رازوں کے امین۔ اس گرم دوپہر میں ان کی طرف مسلسل دیکھنا گویا اپنے آپ کو ایک ہولناکی سے دوچار کرنا تھا کہ وہ توچپ چاپ آپکو گھورتے چلے جاتے ہیں۔ دید کے ہر لمحے نئی نئی خوفناک صورتوں کا روپ دھارتے

دھیرے دھیرے آپ کی رگ رگ میں خوف سرایت کرتے چلے جاتے ہیں۔

میں نے کوہساروں سے منہ موڑ کر اُن بچیوں کی طرف توجہ کی جو میرے اردگرد اکٹھی ہو گئی تھیں۔ پر یہاں ادائیں تھیں اور پیسوں کی طلب۔ میں حسن پرست تو نہیں پر حُسن سے متاثر ضرور ہوتی ہوں۔ اور یہ چہرے متاثر کن تھے۔ اپنے روایتی ملبوسات میں شہابی رنگتوں نیلی اور بھوری آنکھوں اور رسیلے ہونٹوں کے ساتھ کم عمری اور آگہی کے جدید ذرائع سے دوری کے باوجود حسین بننے والے کچھ لوازمات کی لیپا پوتی اُن چہروں پر تھی۔

قریبی بہتی کھال کے پانی سے میں نے منہ ہاتھ دھویا اور اُسے پیا۔

اُس پانی میں کیسی خنکی کیسی مٹھاس سی تھی کہ جس نے میرے اندر جا کر ساری حرارت کو جذب کر لیا تھا۔ یہ چھوٹی سی کھال بلندیوں سے آ رہی تھی۔ وادی کے کھیت کھلیان اور لوگ ان کوہساروں کے کس قدر احسان مند تھے کہ جو سرمائی شدتوں کی سوغاتیں اپنے سینوں میں سمیٹ کر اُنہیں اس موسم میں حیات بخش تحفے کی صورت میں عنایت کرتے تھے۔ ہزاروں فٹ گہرے ندی نالے آبپاشی کے لیے کب موزوں تھے۔

میں نیچے سڑک پر آئی۔ اور ایک نئے منظر سے آشنا ہوئی۔ یہ سڑک سے قدرے ہٹ کر پختہ سرخ اینٹوں کا ایک بند کمرہ تھا جس کے دروازے پر کھڑی چند لڑکیاں ہنستی تھیں۔ دو تین داہنی دیوار کے ساتھ چپکی ہوئی تھیں۔ میرا سارا بچپن چھوٹے چھوٹے دیہاتی ریلوے سٹیشنوں کے ساتھ اسی طرز تعمیر والے کمروں کو دیکھتے گزرا تھا۔ لڑکیاں کھی کھی کرتیں چہرہ چھپاتی اور ادائیں دکھاتی تھیں۔

پھر میرے ہتھے ایک گائیڈ چڑھا۔ جس کے کندھے پر لٹکے تھیلے میں بہت سی نادر چیزیں تھیں۔ پہلا مرحلہ تصویروں کا تھا۔ کالاشی لڑکیوں، قبرستان میں دھرے ٹوٹے پھوٹے تابوتوں میں بکھرے انسانی اعضاء اور کھوپڑیاں، چوب کاری کے اعلیٰ نمونوں والے دو منزلہ گھر۔

''میں نے تو اب تک ایک بھی ایسا گھر نہیں دیکھا۔ تم نے کن کی تصویر کشی کی ہے؟''

میں نے بے اختیار پوچھا۔

''یہی گھر ہیں۔فرق نئے اور پرانے کا ہے۔''

بہر حال تصویروں کی چھانٹی ہوئی۔ پیسوں کی ادائیگی کے بعد وہ اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوا۔''یہ بشالینی ہے'' میرے استفسار پر وہ گویا ہوا۔''آپ اسے لیڈیز نرسنگ ہوم کہہ سکتی ہیں ہمارے مذہبی عقیدے کے مطابق ایام کے دنوں میں عورت ناپاک اور نجس ہوتی ہے وہ گھر میں عام لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ بشالینی اسی مقصد کے لیے ہے۔ کہ یہاں عورت تکلیف کے ان ایام کو آرام فراغت اور ساتھی خواتین سے گپ شپ لگا کر گزارے۔ نہ پکانے کا جھنجھٹ نہ بھیڑ بکریاں چرانے کی ذمہ داری نہ فصلوں کی گڈائی نلائی اور کٹائی۔ بس موج ہی موج۔ پکا پکایا کھانا گھر والے دروازے پر رکھ جاتے ہیں۔''

عورت بھی میں عمر رسیدہ سی تھی اور موضوع گفتگو بھی نسوانی عالمگیریت کا حامل تھا۔کوئی ایسا ڈھکا چھپا مسئلہ بھی نہ تھا پھر بھی پیشانی عرق آلود تھی شاید اس لیے کہ ماحول اور معاشرے نے ہمیشہ اسے ایک مخفی رکھنے والا ناپسندیدہ عمل سمجھا اور سمجھایا۔ایام میں جب بھی تکلیف کے باعث بستر پر لیٹے۔ابا چچا میں سے کسی نے پوچھا اماں نے ترت جواب دیا۔ ''ارے سر میں درد تھا پیٹ میں اپھارہ کی شکایت ہے۔'' بیٹی تھی تو یہی سُنا۔ماں بنی تو یہی کچھ سُنایا۔

''اور جب لڑکی پہلی بار بالغ ہوتی ہے۔سلسلہ کلام دوبارہ جڑا۔خاندان کی بزرگ عورتیں لڑکی کی سہیلیاں پھل اور پھولوں کی سنگت میں اُسے بصد عزت واحترام بشالینی لاتی ہیں۔''

کیسا فراخ دل معاشرہ ہے۔کہیں کلک ہوا۔ایک جھماکا سا۔منظر سامنے تھا۔ساتویں میں پڑھنے والی گیارہ بارہ سال کی لڑکی دومنزلہ گھر کی چھت پر بنی لیٹرین سے دو دو چھلانگیں مارتی نیچے ڈیوڑھی میں اپنی ماں اور ماسیوں کے پاس آئی تھی۔اُڑی رنگت خوف سے پھٹی آنکھیں کانپتے لرزتے ہاتھوں اور ہونٹوں کے ساتھ۔ماں نے اپنے سینے پر دوہتڑ مارا اور روتے ہوئے کہا قسمت

کھوٹی۔ سیاپا پے گیا۔ ماسیوں نے صورت حال کو سنبھالا۔ رات گئے تک ماں کا واویلا کرنا اُسے آج بھی یاد تھا۔ کہ حیض کی آمد نے اُسکی بیٹی کے ناتے قد کی بڑھوتری پر ٹھپہ لگا دیا تھا۔

پھر جیسے میرے اندر کھد بُد سی ہونے لگی۔ اندر جا کر تو دیکھوں۔ پر لڑکا بھی بڑا کائیاں تھا۔ ''وہاں کوئی مقامی عورت نہیں جاسکتی۔ اور آپ کس کھیت کی مولی ہیں۔''

میں نے پلٹ کر اس ایف۔ اے پاس گائیڈ کو دیکھا جو محاوروں کی صورت اپنی علمیت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ میرے بچے میں تو دو کنال کے گھر کی چھوٹی سی کیاری کی مولی بھی نہیں اور تم بات کرتے ہو کھیت کی۔ پھر یوں ہوا کہ بشالینی کے اندر کا اسرار گھسیٹ کر مجھے وہاں لے گیا۔ ادھ کھلے دروازے میں گاٹی ڈالنے کی دیر تھی کہ چار پانچ خونخوار آنکھیں چیلوں کی طرح مجھ پر جھپٹیں۔ بھاگی۔ ذرا فاصلے پر گائیڈ کی آواز سنائی دی۔ سامنے سے ایک جیپ بھی آتی نظر پڑی۔ غصیلی آواز کچھ ایسی تھی۔ آپ کو بتایا تھا کہ بشالینی ناپاک ہو جاتی ہے اور ایسی حماقت کرنے والا بھی ناپاک ہو جاتا ہے۔ صد شکر کہ جیپ ڈرامہ یونٹ والوں کی تھی جو دوپہر کا کھانا کھانے ریسٹ ہاؤس جا رہے تھے۔ میں اس میں بیٹھی اور اونچے سے بولی۔

''میاں بشالینی تو پہلے ہی ناپاکیوں سے لپی پتی ہے رہی میں تو مجھے چھوڑو۔''

ریسٹ ہاؤس میں دال چاول منتظر تھے۔ اُن سے نپٹ کر ندی پر آئی۔ خیر سے یہاں مشی خان پتھروں پر بیٹھی کپڑے دھونے کا شوق پورا کرتی تھی اور مردانہ عملہ اُسکے ساتھ چہلوں میں مصروف تھا۔

سہ پہر پھر کراکال کی نذر ہوئی۔ کالاشیوں کے گڑھ اس گاؤں کا قبرستان بھی زمانوں پرانا ہے۔ جب کالاشی بہت معصوم تھے مُردے کے ساتھ اس کے زیور کپڑے بھی تابوت میں رکھ کر اُسے سونپ آتے تھے۔ آیون کے ہوشیار اور چالاک لوگ انہیں اُڑانے میں بڑے طاق۔ اب یہ بھی سیانے ہو گئے ہیں صرف چارپائی کی ہی قربانی دیتے ہیں۔ قبرستان ٹوٹے پھوٹے لمبے لمبے تابوتوں سے اٹا پڑا تھا ان میں لیٹی ہڈیاں۔ بکھری کھوپڑیاں سال خوردہ چارپائیاں دہشت

پھیلاتی تھیں۔ درختوں کے جھنڈ تلے بیٹھ کر میں ایک پل کے لیے بھی خود کو اس تابوت میں ہونے کا تصور تک کرنا نہیں چاہتی تھی۔ بلھے شاہ صوفی شاعر ہی نہ تھا انسانی نفسیات کا رمز شناس بھی تھا تبھی تو بول اٹھا تھا۔

بلھے شاہ اساں مرنا ناہیں　　　　گور پیا کوئی ہور

میں بھاگی تھی۔ چوبی پُل کے پار زندگی کی رنگینی حرکت اور خدمت کے جذبے سے لبالب بھری آبشار کے نظارے سے بجھی ہوئی آنکھوں اور احساس کو طراوت دینے کے لیے۔ کراکال وادی کو روشنی یہی آبشار دیتی ہے کہ ۴۰ کلوواٹ کا بجلی گھر اسی کے دم قدم سے آباد ہے۔

جستھا کن نیا تعمیر شدہ تھا۔ ستونوں چھت اور دروازوں کی نئی نکور لکڑی کی عبادت گاہ میں پھیلی مخصوص سی باس ستونوں پر گھوڑے کے منہ والے مجسموں کی آرائش دیواروں پر بھیڑ بکریوں اور بے معنی سی پینٹ شدہ تصویریں سب مل جل کر ایک پُر اسرار سا ماحول پیدا کرتے تھے۔ سرما کے تہواروں کی رقص گاہ بھی یہی ہے۔

مرلی کی دلنواز دھن مجھے کشاں کشاں اخروٹ کے اُس درخت کے پاس لے گئی جس کے نیچے بڑے سے پتھر پر بیٹھی سولہ سترہ سن کی وہ مہ لقا بانسری بجارہی تھی۔ اسکی نیلی کچور آنکھیں ہنستی تھیں۔ دور کھیتوں میں دو عورتیں چارہ کاٹتی تھیں۔ فضا پر بکھرے سناٹے کو ندی کا شور اور بانسری کی تان توڑتی تھی۔ میرا گائیڈ بھی مجھے کھوجتا یہیں آ گیا۔ گیت کے بارے میں استفسار پر وہ بولا۔

''یہ جو گا رہی ہے بہار کا گیت ہے۔ بہار کا وقت ہے گل و بلبل کا موسم ہے۔ اے میرے پھول تو میری طرف آ جاتا کہ میرا دماغ بھی تیری خوشبو سے معطر ہو جائے۔''

''چلو کچھ کالاش کی تمدنی زندگی پر بات ہو جائے۔''

''اس معاشرے میں مرد کو اونچا مقام حاصل ہے کالاشی عورت بہت کمتر سمجھی جاتی ہے۔''

''لومر دتو قدیم وجدید ہر سوسائٹی ہر معاشرے ہر تہذیب میں ہمیشہ ٹلے پر چڑھا رہا۔
بیچاری عورت زمانوں سے پِس رہی۔ نیچے کے معاشرے میں آج بھی پاؤں کی جوتی ہے جب چاہا
پہنی جب چاہا اُتار پھینکی۔''

''نر جانور کا گوشت اُسے منع ہے۔''

''بھئی یہ نر کی تخصیص کیوں؟ ویسے گوشت تو اب ڈاکٹروں نے خوراک سے منہا کرنا شروع کر دیا
ہے۔''

''ہاں کالاشی مرد عورت پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھاتا۔ اُسے لعن طعن نہیں کرتا۔''

''یہ ہوئی نہ قابل تعریف بات۔ میں ہنسی۔ ارے میاں نیچے تو اچھی بھلی پڑھی لکھی
کماتی کھاتی عورت روئی کی طرح دھنک دی جاتی ہے۔ ذرا سی بات پر گھر سے نکل جانے کی
دھمکی۔ جہیز نہ لانے پر جلائے جانے کی وارداتیں۔ بیچاری بڑی مظلوم ہے۔''

لڑکا بولے چلا جا رہا تھا۔ میری ٹانگوں میں اینٹھن تھی۔ چائے کی طلب تھی۔ سامنے
والے پہاڑوں پر دھوپ کے رنگ سبزے کی آمیزش کے ساتھ اتنے بھلے لگتے تھے کہ اُنہیں
خاموشی سے ایک ٹک دیکھنا بھی نہایت دلچسپ تھا۔

اور جب میں ریسٹ ہاؤس میں چائے پیتی اور اپنے آپ سے کہتی تھی کہ۔ اگر مجھے کسی
مقامی فیملی کے ساتھ رہنے کا موقع مل جائے تو کتنا اچھا ہو۔

اجنبی جگہوں پر دعائیں کتنی جلدی قبول ہو جاتی ہیں۔

باب نمبر۔۴

شنگبھائے۔ بیشا کے پھول
شیشاؤک ٹوالی اور دکن

ریسٹ ہاؤس کے لان میں چند مقامی لوگ داخل ہوئے۔ یہ مشی خان کے ساتھ تصویریں اُتروانے کے خواہشمند تھے۔ مڈ بھیڑ میرے ساتھ ہی ہوئی۔ میں مشی خان کو باہر لے آئی یوں ایک چھوڑ کئی تصویریں بن گئیں۔ عورتیں نہال ہوگئیں۔ میرے مسئلے کا جاننے پر فی الفور انہوں نے اپنے گھر کی پیشکش کردی۔ سفر وسیلہ ظفر یونہی تو نہیں کہا گیا۔ چلیے میں پروین کو خدا حافظ کہہ کران کے ساتھ گاڑی میں لدگئی۔

یوں میں بتریک گاؤں کے اس مسلمان گھرانے کی مہمان ہوئی جسکی عورتیں اور مرد اُردو سے خاصی شناسائی رکھتے تھے۔ پڑھے لکھے تھے ہوٹل چلاتے اور سرکاری ملازمتیں کرتے تھے۔ پھولوں پھلوں سبزیوں درختوں پودوں اور سبزے سے سجے اس گھر میں چائے پلانے کے فوراً بعد ہی وہ مجھے آتلاخ خان جو بتریک وادی کی سرکردہ شخصیت ہیں کے گھر چھوڑ آئیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ رات کا کھانا انکے ساتھ کھانا ہے۔ اس چھوٹے سے کمرے میں صاحب خانہ کے ساتھ اسکا خاندان بھی موجود تھا۔ وادی میں داخلے کے وقت سے میں ایک بڑے سے سوال کی گرفت میں تھی۔ کیسے اور کس طرح اس بے حد قدیم قوم نے وقت اور زمانے کی آندھیوں اور طوفانوں نے قبائل اور قوموں کی یلغاروں سے اپنے اردگرد موجود مختلف نسلوں اور مذاہب کے لوگوں سے ارتباط کے باوجود اپنے عقائد رسم ورواج اور طور طریقوں کو بعینہ ویسے ہی سنبھالے

رکھا۔ان کے ساتھ بہت سے سوالیہ نشان ہیں اُنکے جواب کیا ہیں؟

اپنے آغاز کے بارے میں وہ یوں گویا ہوئے۔ ''ہمارے بارے میں بے شمار آرائیں ہیں۔ چند زیادہ مستند ہیں۔ ''جنیمی'' نے ہماری اصل دراوڑ کی اُس شاخ سے جوڑی ہے جو ابتدا میں مہا ندیو کے ماننے والے چینی تھے۔ ہماری مرن جیون کی رسومات قدیم اسرائیلیوں سے بھی ملتی ہیں۔ چند مصنفوں نے مغربی افریقہ کی ایک قوم ''چوس'' سے ہمارا ناطہ جوڑا ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ہمارے جدامجد یونانی تھے جو سکندر اعظم کے ساتھ آئے تھے اور پھر یہیں رہ گئے۔ چند جرمنوں نے ہمیں آریاؤں کی اولاد بھی ثابت کیا ہے۔ کالاشیوں کی اکثریت اپنے آپ کو سیام (تھائی لینڈ) سے وابستہ کرتی ہے کیونکہ ہمارے مذہبی گیتوں میں سیام کا ذکر ملتا ہے۔

جب بارشیں رکنے کا نام نہ لیں تب ہماری عورتیں گیت گاتی ہیں کہ اے خدا تو ہم سے بمبوریت لے لے اور ہمارا سیام ہمیں لوٹا دے۔

بعض یورپی سیاحوں نے بھی اسکی تصدیق کی ہے کہ ہماری جیسی اقدار والے چند قبائل تھائی لینڈ میں رہتے ہیں۔ البتہ کچھ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہم افغانستان کے علاقے کافرستان سے ہیں جسے اب نورستان کہا جاتا ہے۔ وہاں کے کافر لال اور ہم کالے ہیں۔ چند محقق ہمیں چترال کے باشندے ثابت کرتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اب تک ہم نے اپنی نسل کو بیرونی اثرات سے بچائے رکھا ہے۔ مگر اب مشنریاں ہمیں عیسائی اور مولوی ہمیں مسلمان بنانے پر کمر بستہ ہیں۔ خود ہمارے نوجوان ایک طرف اگر سیاحوں سے الرجک ہیں تو دوسری طرف اپنی اقدار سے بھی کسی حد تک گریزپا ہیں۔'' وہ جونہی رُکے مجھے بولنے کا موقع مل گیا۔

''بھئی جب آپکے بچوں کو ایٹی کیٹس سکھانے کے لیے ٹیچرز یونان سے آئیں۔ وادی میں سترہ سکول کھلے ہوں جس میں پہلی جماعت سے انگریزی لازمی مضمون کے طور پر پڑھائی جاتی ہو۔ وادی میں پوری دنیا سے سیاحوں کی بھرمار ہو۔ آپکے ہر گھر میں ریڈیو اور ٹرانسسٹر بجیں۔ اب ایسے میں آپ خود سوچیئے۔ بشالینی میں خاتون خانہ کو بھیج کر آپ اُسے ایک ہفتے کے لیے گھریلو

دھارے سے الگ کر دیتے ہیں۔ زچگی بھی وہ بیس دن تک بشالینی میں خاندان سے الگ ہو کر گزارتی ہے اناڑی دائی کے ہاتھوں مر جائے تو منحوس ٹھہرتی ہے مردوں کے لیے اسکے جنازے کو کندھا دینا ممنوع۔ اب ایسے میں جو تہذیبی انقلاب آپکے دروازوں پر دستک دے رہا ہے اس سے خوف زدگی کیسی۔''

تھال میں خوبانیاں اور توت سجے تھے۔ اخروٹ کی گریوں کا ایک چھوٹا سا ڈھیر تھا۔ سیاہی سے اٹے کمرے میں نمدے پر بیٹھی کوڈیوں سیپیوں اور بکری کے سینگوں کی راکھ کے تلوں سے سجی عورت چپ چاپ ہماری گفتگو سنتی تھی۔ بہو نے لوبیا پکایا تھا توے پر پتلے آٹے کو پوڑے کے انداز میں ڈال ڈال کر روٹیاں بناتی تھی۔

پھر جب رات کا چڑھاؤ ہوا۔ تب کچھ لوگ مجھے لینے آئے۔ جن کا آنا مجھے اچھا لگا۔ زارولی خان کے ہاتھ میں لالٹین اور نشرف بی بی اور بی بیتاج نے ٹارچیں پکڑی ہوئی تھیں۔ رات کی سیاہی خوفناک تھی۔ پہاڑوں سے ڈر لگتا تھا۔ درختوں کو دیکھ کر سارا شریر لرزہ براندام تھا۔ اونچے نیچے راستوں پر لالٹین کی مدھم اور ٹارچ کے گول دائرے کی روشنی بڑی مہربان سی لگتی تھی۔ زارولی خان کی آواز سنائی دی کسی جگہ کی طرف اسکے ہاتھ اشارہ کرتے دکھائی دیئے۔

''یہ وہ جگہ ہے جہاں موسم بہار کے تہوار چلم جوشی کے رقص ہوتے ہیں۔'' میں نے راستے سے نظریں اُٹھا کر اشارے کی سمت ضرور دیکھا۔ پر تاریکی میں دیکھنے سے بھلا تفصیلات کیا دکھتیں۔ گاڑھے اندھیرے میں ہر چیز تو بھوت پریتوں کے ہیولے بن بن کر سامنے آتی تھی۔ ٹھنڈی ہواؤں کا زور شور سے چلنا اور چشموں کا گونج سے بہنا سبھی جسم و جان پر ہلکا ہلکا لرزہ طاری کرتے تھے۔

جس کمرے میں کھانا چنا ہوا تھا۔ وہ چھوٹا ضرور تھا پر بڑا صاف ستھرا تھا۔ لالٹین کی روشنی گو دھیمی سی تھی پر اس دھیماؤ میں بھی ایک رومانوی ٹچ تھا۔ یا شاید مجھے محسوس ہوا تھا۔ کھانا سادہ مگر ذائقہ دار تھا۔ اُبلے چاول گوشت اور سلاد۔ کھانے پر دو موضوع زیادہ زیر بحث رہے۔ پہلا اس

گھرانہ کا چترال کی کٹور فیملی سے تعلق جو تیمور لنگ کی اولاد ہے۔ اور دوسرے وادی میں سیاحوں کی آمد سے مسائل کا پیدا ہونا۔ جن میں ہوٹلوں کی کثرت سے تعمیر اور انکی تعمیر میں بنیادی اُصولوں کا فقدان جن میں سپٹک ٹینک کا نہ بننا سرفہرست ہے جنگلات کو بہت نقصان پہنچ رہا ہے۔ جس پیمانے پر ان کی کٹائی ہے پیدائش نہیں۔ اب زار ولی خان اور شکور ولی خان جو خود فرنٹیئر ہوٹل چلاتے ہیں اور دعویدار ہیں کہ انہوں نے تعمیر میں بنیادی اُصولوں کا خیال رکھا ہے۔

شب بسری جہاں اور جس کے ساتھ ہوئی وہ بھی خوب تھی۔ میل خوردہ نمدے پر میں اور وہ ساتھ ساتھ لیٹیں۔ پھر میرا جی کسی چھوٹے بچے کی طرح ہمک کر اسکے سینے سے چمٹ جانے کو چاہا کہ مجھے لگا تھا ماں جی اُوپر سے اس وادی میں مجھے اپنی صورت دکھانے آ گئی ہیں۔ نیند اور جاگ کی لُکن میٹی ساری رات چلی کہ کمرے کی سیلن نے نہایت شوخ وشنگ قسم کے کھٹمل پال رکھے تھے جو کسی ستم گر کی طرح چٹکی کاٹتے اور غائب ہو جاتے۔ اب نیند کا جالاتنی آنکھوں سے زخم خوردہ حصوں کو سہلاتے ہوئے انکو ادھر اُدھر کھوج کرتے کہ مل جائیں تو بھرتہ بنائیں۔ نمدے پر ایک چھوڑ کنئیوں کو طمطراق سے چلتے پھرتے دیکھ کر تذبذب میں کہ کسے ماریں اور کسے چھوڑیں والی کیفیت۔ دوسری جانب اگر ان سے یاری تھی تو بڑھاپے کی عنایت کردہ نوازشات نے جابجا دردوں کی صورت نیند عذاب کر رکھی تھی کہ ہاتھ کبھی ٹانگوں کی جانب اُٹھتے اور کبھی شانوں کی۔ فجر کی نماز ہم دونوں نے اکٹھی پڑھی۔ پھر میں نے انہیں دبایا۔ ٹانگوں سے لے کر بازو شانے کمر۔ جی بھر کر دبا چکنے کے بعد جونہی سیدھی ہوئی میرے گلے میں بوڑھے بازو نے ہاتھ ڈال کر میری پیشانی کو قریب لا کر اس پر بوسہ دیا۔ سالہا سال گزر جانے پر آج بھی اُس بوسے میں چھپی شفقت اور محبت کی یاد میری آنکھیں نم کر دیتی ہے۔

اور جب میں باہر جانے کے لیے جوتا پہن رہی تھی زار ولی خان چائے کی چھوٹی ٹرے کے ساتھ اندر داخل ہوا۔ ”ارے میں جیسے مسرت کی پھوار میں نہا سی گئی۔ گھر سے باہر گھر جیسی نیاشی دیتے ہو جیتے رہو۔“ میں نے اُس چائے کو خنکی سے لبریز اُس صبح کو چسکیاں لیتے ہوئے

یونہی پیا تھا جیسے واڈ کا، شیمپئن یا وسکی کا ایک شوقین ڈرنکر اپنی من پسند ڈرنک کو اسکے جلد ختم ہو جانے کے خوف سے دھیرے دھیرے چھوٹی چھوٹی چسکیوں میں پیئے۔

وادی بتریک کے پون فرلانگ پر محیط اس ڈھلانی میدان میں ولی خان سے میں سُنتی تھی۔ موسم بہار کے چلم جوشی تہوار کا ٹھ یہیں ہوتا ہے۔

سردیوں کے طویل بیزار کن اور کمروں میں بند دنوں کے بعد ڈھول کی دھما دھم کے ساتھ ڈھوپچی کی شنگھائے رسم ادا کرنے کے لیے پکار گویا حیات نو کے لیے ایک آواز ہے۔ وادی انگڑائی لیتی ہے۔ مرد وزن جنگلوں کی طرف بھاگتے ہیں۔ بیشا کے زرد پھول اور اخروٹ کی سبز شاخیں لانے کے لیے پر اس احتیاط کے ساتھ کہ عورت پھولوں کو نہیں چھوتی اور مرد سبز شاخوں کو ہاتھ نہیں لگاتے۔ پھر ان سے گھروں مویشی خانوں عبادت گاہوں اور گلیوں دوکانوں کے چہرے مہرے سجتے ہیں۔

اور شب کے دوسرے پہر گھر کے کسی چھوٹے بچے کو نہلا دُھلا کر پیالی میں بکری کے دودھ کا اسکی دو اُنگلیوں سے پھولوں اور شاخوں پر چھڑکاؤ کر کے گویا گھر سے جنوں کو دیس نکالا دے دیتے ہیں۔ گھی دودھ اور پنیر سے برتن بھرتے ہیں۔ پرانی شرابیں نکلتی ہیں۔ تب ایک اور دن طلوع ہوتا ہے "شیشاؤک" گاؤں بھر کی نوجوان لڑکیاں نئے لباس حسن کی آرائشی اشیاء لیے ندی کنارے ایک لمبی قطار کی صورت میں تن پر جمی مہینوں کی میل پانیوں کو سونپتے ہوئے نئی سج دھج کے ساتھ گھنگھرو بجاتی دھرتی کے سینے پر غرور اور تمکنت سے چلتی واپس آتی ہیں۔ وادی پھولوں اور پھلوں کی خوشبو میں مہکتی اور سورج کی کرنوں میں مُسکراتی ہے اور یہ منظر دیکھتی ہے کہ کالاشی عورتوں کے جتھے توے پراتیں آٹے کی تھیلیاں اور خشک ایندھن پکڑے اخروٹ کے درختوں کی چھاؤں میں چپاتیاں پکاتی اور گھروں میں تقسیم کرتی ہیں کہ اس صدقے کے طفیل اُن کے بچے اور مویشی خنک ہواؤں اور اخروٹ کی ٹوٹتی شاخوں سے پناہ میں رہیں۔

وہ صبح بڑی نشاط انگیز ہوتی ہے جب ڈھول بجتا ہے۔ معمر لوگ لاٹھیاں ہاتھوں میں

اُٹھائے کانوں میں اخروٹ کی سبز ٹہنیاں اُڑسے ناچتے گاتے تعاقب میں جوان لڑکیاں اور انکے عقب میں بوڑھی عورتیں رقص کرتے چلتے آتے ہیں۔ ایک وادی سے دوسری تیسری اور پھر رنگوں کی برسات میں نہایا یہ قافلہ بتریک کی اسی جگہ آرُکتا ہے۔ یہ دن سیٹیوں اور ڈھول کی آوازوں میں لڑکے اور لڑکیوں کے مخلوط رقص سگریٹ اور مے نوشی اچھے کھانے اور دل پسند مردوں کے ساتھ فرار بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست کی تفسیر بن جاتے ہیں۔

دھوپ نے میدان میں جس سرعت سے پاؤں پسارے تھے اُس نے گفتگو میں میرے حد درجہ انہماک کے باوجود مجھے چونکا سادیا۔ میں نے ولی خان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جناح اور بہرام شاہ سے مجھے ملنا ہے۔ تم بتاؤ ان سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے۔

برون میں جناح کا ہوٹل ہے اور بہرام شاہ پہلوواندہ میں رہتے ہیں۔ چلیے اب ناشتہ کریں۔ پھر برون چلیں گے۔ ایک کلومیٹر کا تو فاصلہ ہے۔ ناشتے میں شہد کے ساتھ اخروٹ کی گری کے آمیزے سے بنائی ہوئی روٹی تھی اور انڈے کا آملیٹ تھا جسے کھاتے ہوئے یقیناً لطف آیا تھا۔ شہد تازہ تھا گھر کا تھا۔ جس کمرے میں اس وقت ہماری نشست تھی اسکی بیرونی دیوار کے ساتھ لکڑی کے بڑے سے جالیدار بکس میں شہد کی مکھیاں شہد بنانے میں تن دہی سے مصروف تھیں۔ یہ گھریلو صنعت کالاش کی تینوں وادیوں میں بہت عروج پر ہے۔ لیکن کالاشی عورت کے لیے اسکا چکھنا حتیٰ کہ چھونا تک مذہبی نگاہ سے ممنوع ہے۔ کیونکہ انکے عقیدے کے مطابق عورت نجس ہے اسکے کھانے کی صورت میں اُس گھر سے شہد مفقود ہو جاتا ہے۔ مرغی اور انڈہ دونوں کو کالاشیوں نے اپنے اوپر حرام کر رکھا ہے۔ اس عقیدے کے بارے میں دو آرائیں ہیں۔

پہلی خدا نے باقی جانوروں کے مقابلے میں اسے اُڑنے کی صلاحیت سے محروم کر رکھا ہے۔ یہ گندی مندی چیزیں کھاتی ہے۔ دوسری وجہ زمانوں پہلے کالاش کے ایک مذہبی رہنما کی چترال کے ایک بااثر آدمی سے دشمنی ہوگئی۔ چترالی اُسے جان سے مارنے کے لیے کالاش آیا۔ گھر نہیں پہچانتا تھا مگر اس بدذات مرغ نے بانگ دے کر گھر کی نشان دہی کر دی۔ یوں مذہبی رہنما

قتل ہو گیا۔ تب سے دونوں چیزیں حرام ہوئیں۔ پر نئی نسل دونوں چیزیں چھپ چھپا کر کھاتی ہے اور مزے اُڑاتی ہے۔

دو منزلہ جناح ہوٹل سبزے میں گھرا کالاش کی قدیم تہذیب کے بہت سے رنگوں کی نمائش کرتا تھا۔ جناح تو نہیں ملاہاں زوئے سے ملاقات ہوئی۔ این۔ سی۔ اے کا گریجوایٹ سمن آباد کا رہائشی جو آیا تو یہاں آرٹ اور کلچر کی سٹڈی کے لیے تھا پر جانے کیسے اس جادونگری کا حصہ بن گیا۔ اور اب جشن پوڑ میں کالاش دوشیزہ کو اغوا کرنے کا ارادہ رکھتا تھا۔

اور جب میں قربان گاہ جانے کے لیے چڑھائیاں چڑھتی اور ہانپتی کانپتی تھی اور یہ سوچتی تھی کہ انسان نے خود کو کائنات کی گنجل گھیریوں میں کیسے اُلجھا رکھا ہے۔ عقائد کی جھوٹی سچی رسموں کے گرد ساری زندگی کوپے چڑھائے کولہو کے بیل کی طرح چک پھیریاں لیتا رہتا ہے۔ اور ایک دن دھڑام سے گر جاتا ہے۔ مجھے گائیڈ کرنے والا لڑکا بتاتا تھا۔ کالاشی چار دیوتاؤں کو مانتے ہیں۔ مہاندیو، ورن، پرابہ اور گریمون۔

''اب انکے کام بتانا مت شروع کر دینا۔'' میں نے رُک کر درختوں کے جھنڈ تلے ستاتے ہوئے کہا۔

''آپ جانتی ہیں۔'' نور علی نے پوچھا۔

''ہاں تو اور کیا۔ حیاتی کے سارے کاموں کے سلجھاؤ کی پنڈیں کالاشیوں نے ان کے مونڈھوں پر تو رکھ دی ہیں۔ ارے کالاشیوں پر ہی کیا دنیا بھر کے لوگوں کا یہی چلن ہے۔''

برون گاؤں بہت نیچے نظر آتا تھا۔ جنگل بھی پیچھے رہ گیا تھا۔ یہاں مالوش (قربان گاہ) کس قدر خوفناک سناٹے میں سانس لیتا تھا۔ چوبی پھاٹک کھول کر میں اندر داخل ہوئی۔ خوف کی لہریں میرے رگ و پے میں دوڑنے لگیں۔ چوبی تختوں پر بے شمار اُلٹی سیدھی لکیریں اور شکلیں تھیں۔ قدرتی پتھروں کے سائے میں چار چوبی گھوڑوں کے سروں والے بت کھڑے تھے۔ ایک طرف آگ کی راکھ تھی اور انکے سروں کے نیچے تختوں پر خون کے چھینٹے تھے جو خوف زدہ کرتے

تھے۔

نور شاہ قربان گاہ میں خاموش کھڑا تھا۔

کسی زمانے میں کالاش میں گھوڑوں کی حکمرانی تھی۔ اسی لیے گھوڑے کو دیوتا کا درجہ دیا گیا ہے۔ عبادت گاہیں بھی ان کے سروں سے ہی سجتی ہیں۔

برون سے پہلو وانده جانا اور بہرام شاہ سے ملنا دونوں کام حد درجہ سہولت اور آنا فانا ہو گئے تھے۔ بہرام شاہ کالاشی قوم کا سرکردہ رہنما سیلانی آدمی جس کا گھر ملنا خاصا مشکل اسوقت وادی بریر کے ایک نوجوان کے ساتھ موجود تھا۔ درمیانی عمر کا بہرام شاہ جس کی تانبے جیسی رنگت میں اس کے چکنے رخسار صحت کی لالی سے دمکتے تھے خلوص اور محبت سے ملا۔ گھر کے اندر بیٹھے جہاں اُن کی بیوی کیلاڑ پکاتی تھی (دودھ پنیر اور میدے کے آمیزے کی روٹی)۔ بات چیت شروع ہوئی تو دونوں نے اس پر شدید رنج کا اظہار کیا کہ چترالی انہیں پرکاہ برابر بھی اہمیت نہیں دیتے۔ اُنہیں کافر ملعون اور انتہائی ناپسندیدہ قوم گردانتے ہیں۔

میری ہنسی چھوٹ گئی۔

کبھی اُن سے بھی تو پوچھیں جو شاکی ہیں کہ پانچ چھ ہزار کی آبادی نے پورا چترال یرغمال بنایا ہوا ہے۔ مُلکی اور غیر مُلکی میڈیا نے صرف ان تین وادیوں کو فوکس کیا ہوا ہے۔ چترال کی اپنی پہچان اپنی شناخت پس منظر میں ہے۔ گلے شکوے چھوڑیں ملک کے جس حصے میں بھی چلے جائیں یہی رنڈی رونے ہیں۔

تواضع کے لیے جو کچھ سامنے آیا تھا اس میں کیلاڑ نے کچھ اتنی لذت نہ دی شاید ذہن اسکے ذائقے سے ناآشنا تھا۔ تازہ خوبانیوں خشک توت اور گرم گرم چائے کے کپ نے مزہ دیا۔ اور جب وہ دونوں چٹکی بھر نسوار اپنے گالوں میں رکھتے تھے میں اُن سے سوال کرتی تھی۔

ڈنڈی نہیں چلے گی ٹھیک بتانا ہوگا۔ کتابی اور شخصی مطالعہ نے ایک سوال کھڑا کر دیا ہے کہ چلم جوشی (مئی کے وسط) مرچ وکی نٹ (جون کا پہلا ہفتہ) پوڑ (ستمبر کا آخری ہفتہ) اور

چاؤمس (۲۰ دسمبر) کے تہواروں کے لیے آخر تاریک راتوں کا انتخاب کیوں کیا جاتا ہے۔ کیا چاندنی راتوں سے کالاشیوں کی کوئی ناراضگی ہے؟

دونوں ہنسے۔ جو ابشارہ خان نے دیا جو حقیقت پسندی اور صاف گوئی کا مظہر تھا۔

دو باتیں ہیں۔ پہلی کالاشی رومان پسند اور عیش پسند لوگ ہیں۔ لڑکی کو بھگا لے جانا دراصل شادی کا ایک طریق کار ہے۔ اس میں جدت اور رنگ آمیزی کرنا اس عمل کو مزید رومان پرور اور دلکش بنانے کے لیے ہے۔ رات کی تاریکی پہلی اہم ضرورت ہے۔ فرار کنواری اور بغیر بچے والی شادی شدہ عورت ہر دو کا ہوتا ہے۔ والدین اور شوہر کا صورت حال جان کر تعاقب بھی ضروری ہے۔ لڑکا مکمل رازداری برتتے ہوئے اپنے ساتھیوں کے ساتھ منصوبہ بندی۔ ٹارچوں کی فراہمی۔ جائے مقام کا تعین اور وقت طے کرتا ہے۔

بالعموم جب رقص اپنے جوبن پر ہو۔ جوڑا اپنے عزیز رشتہ داروں کو ڈاج دیتا ہوا فرار ہوتا ہے مختلف سمتوں میں متعین ساتھی روشنی دکھا کر حالات کے تسلی بخش یا صورت حال کے مخدوش ہونے کا اشارہ دیتے ہیں۔ اگر روشنی صرف ایک بار ہو تو مطلب ہے او کے۔ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ اگر اشارے دو ہوں تو پھر گڑ بڑ والی بات ہے۔ اور تین اشاروں کا مطلب حالات کی سنگینی ہے۔ ایسے میں بالعموم وفادار ساتھی لڑکی کو کہیں چھپا کر دوست کو ادھر ادھر کر لیتے ہیں۔ شب کے آخری پہر لڑکی کو لڑکے کے گھر لے جایا جاتا ہے جہاں اگلے چند دنوں میں لڑکی کے والدین یا شوہر اُسے واپسی کی ترغیب دیتے ہیں مگر آخری فیصلہ صرف لڑکی کے پاس محفوظ ہے۔ دوسری وجہ لڑکیوں کا آزادانہ سگریٹ چرس اور مے نوشی کا استعمال ہے۔ شب کی تاریکی میں ہر کام کھلم کھلا ہوتا ہے۔

تقریباً دس دنوں پر پھیلے چاؤموس کی تفصیلات لمبی چوڑی بھی تھیں اور دلچسپ بھی۔ لڑکے لڑکیوں کا آگ کے گرد رقص آلاؤ کے شعلوں کی بلندی کا مقابلہ اور پھر جیتنے والوں کا ہارنے والوں کو لعن طعن۔ گوبر کی راکھ گھروں چھتوں اور مویشی خانوں میں بکھیر کر بدروحوں کو

بھگانا۔ گھروں اور جسموں کی صفائی۔ عبادت گھروں میں ڈھول کی دھیمی دھیمی تھاپ اور دھیمے دھیمے رقص کے ساتھ دیواروں پر برش اور سیاہی سے تصاویر بنانا۔ سرگوشیوں میں باتیں کرنا اگلی صبح شوروغل مچا کر عبادت گاہوں میں پینٹ کیے جانوروں کو بھگانا مُردوں کی روحوں کو کھانے کے لیے بُلانا اور اپنی اپنی دل پسند لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ رقص کرنا۔ گھر کے بڑے بیٹے کا مویشی خانے کی چھت پر بیٹھ کر ہر فرد کے لئے اخروٹ اور نمک کے آمیزے والی پانچ پانچ روٹیاں پکانا اور تقسیم کرنا۔

آگے چلو۔ کچھ اور بتاؤ۔ میں دلچسپی سے پوری طرح اسکی طرف متوجہ تھی۔

کالاشی لوگ رومان پسند ہیں۔ اساطیری دیو کی طرح ان کی جان رقص وموسیقی کے طوطے میں ہے۔ اپنے دیوتاؤں کو منانے محبوب کو رجھانے لبھانے نئی زندگی کو خوش آمدید کہنے اور دنیا سے رخصتی کے سمے انہیں رقص کرنا ہے ڈھول کی ڈھم ڈھم اور بانسری کی تانوں میں ان کے سانس چلتے ہیں۔ انکے رقص کے نرت بھاؤ اور موسیقی کی تانوں کی مماثلت کسی قوم کے ثقافتی ورثے سے میل کھاتی ہے یا نہیں۔ میں لاعلم ہوں۔ ہر کالاشی مرد عورت محبت کرنا فرض سمجھتے ہیں۔ شادی کے لیے سات نسلی پیڑھیوں کی دوری ضروری ہے۔

''یہ تو ڈاکٹروں والا پوائنٹ ہے۔'' میں نے خود سے کہا اور پھر اسکی طرف دیکھا۔

والدین کی طرف سے ارینج کردہ شادی کی نسبت ٹوالی اپنی دلکشی اور رنگینی کے باعث زیادہ ہر دل عزیز ہے۔

''ٹوالی؟'' میں نے حیرت سے اپنی آنکھوں پر بھنویں اُتارتے ہوئے لڑکے کو گھورا۔

''محبت کرنے والے مرد اپنی محبوباؤں کو بھگا لے جاتے ہیں۔''

میرا جی چاہا تھا میں کسی نوخیز چلبلی لڑکی کی طرح زور سے سیٹیاں بجا کر ''واؤ'' کہوں۔ پر ''بوڑھے منہ مہاسے کرنے چلے تماشے'' والی پھبتی میں اپنے اوپر کسوانا نہیں چاہتی تھی۔

دل مسوس کر رہ گئی۔ نیچے والوں کی ہولناکیوں کا تصور ہی حد درجہ لرزہ براندام تھا۔ بد بخت اگر کسی سے دل لگا کر چلی گئی تو پاتال کی تہوں سے نکال کر ٹوٹے ٹوٹے کر دی جاتی ہے۔

اور لڑکا اسوقت کسی داستان گو کا روپ دھارے بولتا تھا۔ چاؤ موس (سردیوں کا تہوار) کی برفانی راتوں میں اور جوشی (بہار کا تہوار) کے پُر بہار رُتوں میں جب ان کے بال اور جسم جڑی بوٹیوں کے پانیوں سے غسل کے بعد چمکتے ہیں۔ جب انکے نئے نکور لبادوں میں گھنگھرو بولتے ہیں جب انکے چہرے آرائشی چیزوں سے گلنار ہوتے ہیں جب جوانوں کے لیے مخصوص کردہ دنوں میں وہ باہم رقص کرتے اور گیت گاتے ہیں۔ تب وہ اپنی دلپسند لڑکیوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔

خوب کس قدر دل خوش کن تصوراتی نظارہ سامنے تھا۔ محظوظ ہوتے ہوئے میں نے پھر اسے دیکھا۔

''اگر کوئی شادی شدہ بغیر بچے والی عورت کسی دوسرے مرد کو پسند کر لے تو اسکے ساتھ جانے کی صورت میں سابقہ شوہر کے لیے دکن کی ادائیگی ضروری ہے۔''

''دکن؟'' لفظ میرے ہونٹوں پر اُبھرا۔ اور آنکھوں میں استفسار پیدا ہوا۔

کالاش معاشرے کا ایک اہم قانون جس کی رُو سے پہلے شوہر کو اسکی دلجوئی کی خاطر اسکا اپنی شادی پر خرچ کردہ مال کا دوگنا دینا ضروری ہے۔ دکن کی ادائیگی کیئے بغیر اغوا کرنے والا مرد اپنی محبوبہ کو چھو نہیں سکتا۔ بے شک وہ اسکے گھر میں ہو اور دکن کا تصفیہ ہونے میں مہینے لگ جائیں۔ بس پھر نہ کوئی گلہ نہ شکوہ نہ لڑائی نہ جھگڑا۔

''چلو باغبان خوش رہے راضی رہے صیاد بھی'' والی صورت حال ہے نا۔

ازدواجی بندھن میں باندھنے کا طریق کار بھی خاصا دلچسپ ہے۔ اغوا کے بعد کی ساری کاروائیوں کے اختتام پر ایک شب گاؤں کے معتبروں کا لڑکے کے گھر اکٹھ ہوتا ہے۔ لڑکے والے تین چار بکروں کو بڑے بڑے ٹکڑوں کی صورت دیگوں میں پکاتے ہیں۔ جمع شدہ پنیر اور

بالائی نکالی جاتی ہے۔ پوڑے نمار وٹیاں بنتی ہیں۔ بکرے کا جگر پکا کر اُسے محفل میں موجود دولہا دلہن کے ہاتھوں میں پکڑایا جاتا ہے ایک بہت قریبی عزیز حاضرین کی اجازت سے تیز چھرے کے بھرپور وار سے اُس جگر کو دو ٹکڑوں میں کاٹ دیتا ہے۔ ایک ٹکڑے کا مرد کے ہاتھ میں اور دوسرے کا عورت کے ہاتھ میں رہ جانا نکاح کی علامت ہے۔ اسکے فوراً بعد لڑکی کے والد کا اپنے داماد سے کسی قیمتی چیز کا مطالبہ ہے۔ دعائیہ جملوں کے بعد کھانے کا عمل ہے۔

کالاشی مرد جھگڑالو نہیں۔ امن پسند ہے۔ کالاش سوسائٹی میں اسکی حیثیت کا اندازہ اسکی بیویوں کی تعداد سے ہوتا ہے۔

کمبخت مارے دنیا بھر کے مردوں کو کیسا ہوکا ہے شادیوں کا۔

شلوار پہناؤ رسم میں چھ سال کے بچوں کو پہلی بار سیاہ اُون کی شلواریں پہنا کر بکروں کی قربانیوں دعوتوں اور بچوں کو تنہا پرابہ (دیوتا) بھیج کر کالاشی بنایا جانا بھی ہمارے معاشرے کی ایک دلچسپ رسم ہے۔

اور پھر چاؤ موس تہوار کا سب سے خوبصورت اور دلچسپ پروگرام جانجا۔ تاریک رات کا پہلے پہر کا سناٹا ڈھول کی آوازوں سے تھرا اُٹھتا ہے۔ سیاہ پیرہنوں میں لپٹی گھنگھرو بجاتی نک سک سے آراستہ عورتیں اور چترالی ٹوپیوں پر مرغ زریں کے پروں کے پھول سجائے مرد حضرات ہاتھوں میں چیڑ کی جلتی لکڑیاں تھامے ناچتے گاتے اوپر قربان گاہ کی طرف جاتے ہیں۔ پوری رات برف پر رقص اور مے نوشی ہوتی ہے۔ دیوتاؤں کے حضور قربانیاں اور سردار کا انتخاب۔ سردار کا گوبر کے ٹکڑے میں سوراخ کرنا اور اس میں سے آسمان کو دیکھتے ہوئے پیشین گوئیاں کرنا۔ پھر قربانی اور خون کے چھینٹوں کا لوگوں پر چھڑکاؤ۔

لاکھ شارہ خان کا انداز بیان سادہ اور افسانوی ٹچز سے مبرا تھا۔ پر میں اپنے تصور کی اُس آنکھ کا کیا کرتی جو وادی کے طول وعرض پر پھیلے کینوس پر ایک ایک منظر کو پینٹ ہوئے دیکھتی تھی۔ یاس میں ڈوبی بڑی لمبی آہ میرے سینے سے نکل کر ہونٹوں تک آئی تھی جس نے پوچھا تھا۔

چاؤ مٹوس کو اگر دیکھنا ہو تو دسمبر میں یہاں آنے کی صورت کیا ہے۔

بڑی ابتر۔ اسکا لہجہ قطعیت سے پُر تھا۔

لواری ٹاپ بند۔ Flights کو تو عام دنوں میں بھی موسم کی ذراسی چھینکوں پر نہ آنے کا بہانہ چاہیے۔ دسمبر میں تو بیچارہ شدید قسم کے فلو میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ پشاور سے افغانستان کے شہر جلال آباد کے راستے ارندو موڑ سے جس پر آج کل سفر خطرے سے خالی نہیں۔ یوں اگر چترال پہنچ بھی جائیں تو ہم تک آنے کے لیے دس بارہ فٹ برف سے اٹے راستے حائل ہوں گے۔

چلو قصہ ختم۔

آیون میں گاڑیوں کا اڈہ کبھی آیون کا پولو گراؤنڈ تھا۔ پر اب اڈہ تھا جہاں دُھول اور مٹی اُڑتی تھی۔ سہ پہر کی دھوپ کا جوبن آنکھوں کو چُندھیاتا تھا۔ لوگوں کی گہما گہمی تھی۔ مشروبات کی ایک دوکان کے سامنے کھڑے ہو کر پانی کا گلاس پیتے ہوئے میں نے کسی سے پوچھا۔

''سیار بابا کا مزار کہاں ہے؟''

''وہ سامنے والے پہاڑوں کے دامن میں۔'' میں نے تیز دھوپ میں نظریں دوڑائیں۔ سوچا کہ چلو لگے ہاتھوں یہ معرکہ بھی سر کرلوں کہ کھوار کے اس عظیم شاعر کے مزار پر حاضری بھی ضروری ہے۔ تھوڑا سا چلی بھی۔ پر یقیناً کوئی شُبھ گھڑی ہی تھی کہ جس نے بڑھتے قدموں کو روک دیا وگرنہ دھوپ میں یہ لاحاصل مہم جوئی اس شام مجھے چترال سول ہسپتال میں پہنچا سکتی تھی کہ سیار بابا بیچارہ وہاں کہاں تھا۔ اب یا تو لڑکا لاعلم تھا یا پھر مجھے بیوقوف بنا گیا تھا۔

واللہ علم بالصواب۔

باب نمبر۔۵

پریس کلب۔شاہی قلعہ
اور دینین کا ایک گھر

شام گرم تھی پر چترال پریس کلب کے سر سبز لان میں کرسی پر بیٹھے حیات اللہ گرزی کی باتوں سے چھلکتی تلخی اور گرمی دونوں موسم سے کہیں سوا تھیں۔ قہوہ انہوں نے خود بنایا تھا اور بصد اصرار مجھے دوسری پیالی دیتے ہوئے کہا تھا ''اسے ضرور پیئیں یہاں کے خشک موسم کا مقابلہ کرنے کے لئے بہترین ہے۔''

سیاہ اور سفید رنگی کھچڑی داڑھی گھنی مونچھوں طنز سے لبریز آنکھوں اور زہریلی گفتگو کا گولہ بارود برساتے ہونٹوں والا اونچا لمبا یہ درویش سا شخص پریس کلب کے لمبے چوڑے خالی کمرے میں بستر بند پر لیٹا ہوا تھا جب میں نے کمرے میں داخل ہو کر اپنا تعارف کروایا تھا۔

'' آیئے آیئے'' خوشدلی سے کہتے ہوئے وہ اٹھے کرسی میری طرف بڑھائی۔

اندر کے مقابلے پر باہر کا موسم زیادہ خوشگوار تھا یہی سوچتے ہوئے میں نے قدم دروازے کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''چلیئے باہر بیٹھتے ہیں۔''

گفتگو کے پہلے مرحلے میں انہوں نے پریس کلب کی زمین، بینظیر کی طرف سے ملنے والی پانچ لاکھ گرانٹ، بلڈنگ کیسے اور کس طرح بنائی گئی وغیرہ کا ذکر کیا۔ گفتگو کا دوسرا مرحلہ صحافیوں کی زبوں حالی اور اخباروں کی طرف سے ملنے والے قلیل معاوضے سے متعلق تھا۔ چار

پانچ سو کا معاوضہ جبکہ فیکس کا خرچ بھی صحافی کے ذمے۔ بڑی جاندار شکایات تھیں۔

تیسرے مرحلے میں آغا خان ایجوکیشنل فاؤنڈیشن کے تحت صوبے بھر میں چلنے والے تعلیمی ادارے زیر بحث آئے۔

گفتگو کا چوتھا مرحلہ بڑا خوفناک تھا۔ اُنکی آنکھوں اور ہونٹوں کے زاویے طنزیہ انداز کے بھرپور عکاس تھے۔

چترال سنٹرل ایشیا کا گیٹ وے ہے۔ بہتر ہے اسے امریکہ کو لیز پر دے دیا جائے۔

''کیوں آخر'' میں نے بوکھلا کر کہا۔

اس لئے کہ ہم پاکستان سے چھ ماہ کے لئے کٹ جاتے ہیں۔

میں ابھی کچھ کہنے ہی والی تھی کہ اُنکا ساتھی جو پاس ہی بیٹھا ہوا تھا اُٹھا اور اندر سے ڈیلی مسلم کا ایک تراشہ لا کر میرے ہاتھ میں تھما دیا۔ میں نے پڑھنا شروع کیا اس میں وہی کچھ لکھا تھا جو وہ مجھے بتا رہے تھے۔ آپکو پتہ نہیں یہاں کا بااثر طبقہ امریکی ایجنٹ ہے ہر ماہ امریکی سفیر قلعے میں آتا ہے دعوتیں اُڑتی ہیں۔

بڑی زہریلی قسم کی مسکراہٹ تھی جو حیات اللہ گرزی کی آنکھوں ہونٹوں اور مونچھوں کے بالوں میں پھنسی ہوئی تھی۔

''مگر ہوگا کیا۔ یہ سب لوگ مل کر چائنا کے خلاف ہونگے اور میزائلوں کی لڑائی میں یہ پُرامن خطہ تباہ ہو جائے گا۔''

یقیناً اس سے زیادہ سُننے کی مُجھ میں تاب نہ تھی۔ آسمان پر شام بہت تیزی سے اُتر رہی تھی میں نے پھر کسی دن آنے کا کہتے ہوئے اجازت لی اور باہر آ گئی۔

اسپتال روڈ سے شاہی قلعہ روڈ پر آ کر میں نے لمبا سانس بھرا قدموں کو تیز کیا اور اُس موڑ پر آ کر رُک گئی جہاں میرے سامنے شاہی قلعہ اور بائیں ہاتھ شاہی مسجد تھی۔

مغرب کی اذان ہو چکی تھی۔ ''نماز کہاں پڑھوں''۔ شاہی مسجد میں۔ توبہ میں نے

کانوں کو ہاتھ لگایا۔ مسجد خالی ہوتی تو ایک بات بھی تھی۔ آدھا چترال اس وقت یہاں موجود ہوگا اور لینے کے دینے پڑ جائیں۔

''شاہی قلعہ میں'' میں نے اپنے آپ کو مخاطب کیا۔

اُجاڑ ویران اور شکستہ قلعہ خوف کی ٹھنڈی لہریں میرے سارے سر یر میں اُترنے لگیں۔ وہ نیلی چھت والا محافظ ہوگا۔ لکڑی کے سال خوردہ بڑے سے گیٹ کے چھوٹے سے دروازے سے اندر داخل ہوگئی اور گھاس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا اُس عظیم ہستی کے حضور جس نے بقا کو صرف اپنے لئے مخصوص کر رکھا ہے۔ کسری نماز دو منٹ میں ختم۔ ''دعا'' دریا کے کنارے۔ دل نے کہا۔

''باہر چلو'' سناٹے اور ویرانی سے ہول کھاتے ہوئے میں نے کہا۔ یہ نئی نئی جدتیں کسی مصیبت میں نہ مبتلا کر دیں۔

کس قدر گھمبیر ویرانی تھی۔ غلام گردشوں میں ہُو کا عالم اعصاب کو چٹخا رہا تھا۔ چنار کے بوڑھے پھیلے ہوئے درخت نے فضا کی دہشت کو اور بھی بڑھا دیا تھا۔

وسوسوں اور اندیشوں کو زوردار ٹھوکریں مارتے ہوئے میں قلعے کی عقبی سمت بھاگی۔ ٹوٹی پھوٹی راہداریوں اور بالکونیوں میں سے کسی بگولے کی مانند چکر کھاتی ہوئی وہاں جا کھڑی ہوئی جس کے سامنے خوبصورت مکانات اوپر نیلا آسمان اور درمیان میں دریائے چترال چنگھاڑیں مارتا بہہ رہا ہے۔ دائیں ہاتھ پھر ٹوٹی ہوئی گیلریوں اور بالکونیوں کے سلسلے ہیں۔

اندھیرے کی چادر میں لپٹی جاتی اُس شام کے ماند پڑتے حُسن کی چھاؤں میں میرے ہاتھ دعا کے لئے اُٹھ گئے تھے۔ میری دعائیں کیا ہیں۔ ممتا کے خودغرض تانوں بانوں میں اُلجھی ہوئیں۔ جب راز و نیاز کے سلسلوں سے فارغ ہوئی۔ ہوش کی آنکھوں نے گردوپیش پر چھائے اندھیرے میں سارے ماحول کو آسیب زدہ سا دیکھا تو حلق سے چیخ نکلتے نکلتے بچی۔ بھاگی بگٹٹ بھاگی۔ قلعے کے دروازے سے باہر آئی۔ ایک جگہ ٹھوکر بھی کھائی شکر ہے گری نہیں۔ دھک دھک کرتا دل سڑک پر آ کر پُرسکون ہوا۔

چلتے چلتے میں نے سوچا رات کے لئے کچھ خرید لوں۔ ''پر کیا''۔

کباب وغیرہ ہرگز نہیں۔ معدہ اب اس قابل نہیں تھا کہ ایسی چیزوں کو ہضم کر سکے۔ پھل۔ کونسے پھل؟ میں نے جل کر اپنے آپ سے کہا۔ خوبانی کہیں سوغات کے طور پر بھی نظر نہیں آئی تھی۔ توت کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ سیب ابھی بیچارہ مُنا چُنا سا درختوں پر بچپنے کے سُنہری دنوں کے مزے لوٹ رہا تھا۔ لے دے کے بس ایک آم تھا جو میرے لئے گھر کی مرغی دال برابر کے مترادف تھا۔ مغرب کے بعد چترال بازار بند ہو جاتا ہے۔ جلدی کرنی چاہیئے کا سوچتے ہوئے میں رُکی کہ اس سمت سے آتی کسی گاڑی سے لفٹ لوں۔

تیز روشنیوں نے مجھے گویا کسی گاڑی کا سگنل دیا۔ میں نے ہاتھ ہلایا پجارو میرے قریب آ کر رکی جسے پندرہ سولہ سال کا ایک نوعمر لڑکا چلا رہا تھا۔ میں نے کھڑکی سے جھانکتے اسکے چہرے پر نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔

'' بیٹے مجھے چیو پل تک جانا ہے اگر آپ اس طرف جا رہے ہیں تو مجھے لفٹ دے دیں۔''

خوش مزاج لڑکے نے فوراً دروازہ کھول دیا۔ گلہری کی طرح پھدک کر میں اندر تھی۔

تعارف کے مراحل طے ہوئے تو مجھے احساس ہوا میرا امان بہت ملنسار اور بیبا بچہ ہے۔ باوجود نوعمری کے بھاری اور قیمتی گاڑی کو احتیاط سے چلا رہا ہے۔ کاروباری سوجھ بوجھ رکھتا ہے۔ بڑے بھائی اور والد کے ساتھ مل کر پٹی کا بزنس کرتا ہے۔ چیو پُل کو کراس کرتے ہی اُس نے کہا۔

''آنٹی دینین میں میرا گھر ہے۔ آپ چلیئے۔ میری بہنیں اردو بول اور سمجھ سکتی ہیں۔ میری ایک بھاوج پشاور میں کافی عرصے سے رہ رہی ہیں وہ بھی آجکل یہیں ہیں یقیناً اُن سے آپکی ملاقات مفید رہے گی۔''

''لو بھلا اندھا کیا چاہے دو آنکھیں''۔ میں خوش ہو گئی تھی۔

دینین روڈ پر گاڑی تیزی سے بھاگی جا رہی تھی۔ تقریباً ڈیڑھ میل چلنے کے بعد گاڑی

مڑی اور پھر عمودی چڑھائی کے ساتھ ہی ایک بڑے سے گیٹ میں داخل ہوگئی۔

میر امان مجھ سے آگے چلتا تھا۔ اور قدم قدم پر رک کر مجھے گائیڈ کرتا جاتا تھا۔ آنٹی یہاں سے آنٹی اس طرف سے۔

گھر میں داخلہ کچن کے راستے ہوا۔ بڑے سے چولہے پر دھری توی پر دو خوبصورت لڑکیاں بڑی بڑی روٹیاں پکانے میں پسینہ پسینہ ہو رہی تھیں۔ میر امان کی بھاوج اور بہن ایک اجنبی خاتون کے اندر آنے پر اُٹھیں۔ میر امان نے کھوار زبان میں تیز تیز بولتے ہوئے اُنہیں کچھ بتایا۔ مسکراتے ہوئے انہوں نے حال احوال دریافت کیا اور پھر بڑے کمرے میں قالین پر سب کے ساتھ نشست جم گئی۔ میر امان کی پشاور والی بھابی کہیں گئی ہوئی تھیں۔

یہ خاصا بڑا کمرہ تھا۔ پوربی سمت کی ساری دیوار شیشے کی تھی۔ بڑے خوبصورت جدید چینٹ والے پردے تھے۔ گھر خاصا ماڈرن اور نیا تعمیر شدہ تھا۔ قالین پر چھوٹے بڑے ہر سائز کے بچے لوٹنیاں لگا رہے تھے۔ ٹی وی آن تھا اور کمرہ خوب گرم تھا۔ میری موٹی قمیض کے نیچے میرے بدن سے پسینے کی دھاریں بہہ بہہ کر اُسے بھگو رہی تھیں۔ اُس سمے اگر کہیں میری بیٹی سامنے ہوتی تو یقیناً میں اسکی تکہ بوٹی کر ڈالتی جس نے ماں کو ماڈرن بنانے کی چاہت میں اُسکے کپڑوں کو جولاہے کے جنوائی کی طرح کلف سے اکڑا دیا تھا۔ وہ کلف اب مجھے بچھوؤں کی مانند کاٹ کھائے جا رہی تھی۔ جی چاہتا تھا بھاگ جاؤں اور دریائے چترال میں چھلانگ مار دوں جو چند بالشتوں کے فاصلے پر مست خرامی سے بہہ رہا تھا۔

تبھی میں نے ایک بے حد دلکش لڑکی کو ڈیپ فریزر میں سے گوشت کی ٹرے نکال کر باورچی خانے کی سمت جاتے دیکھا۔

خطرے کی گھنٹی کہیں میرے قریب بجی۔ یہ اہتمام یقیناً میری خاطر مدارت کے سلسلے میں ہے۔ یہ گوشت پکانے بیٹھ گئیں تو رات یہیں ہو جائے گی۔

''ارے'' میں نے اُسکا دامن پکڑا جب وہ میرے پاس سے گزری۔

''یہ کس کے لئے پکانے لگی ہیں؟''

''آپکے لئے۔'' اُسنے ہنستے ہوئے اپنی نشیلی آنکھوں سے میری طرف اشارہ دیا۔

''خدایا۔'' میں نے فی الفور کھڑے ہوکر ٹرے اُسکے ہاتھوں سے پکڑلی۔

میں صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوئی تھی۔ بمبوریت کے پہاڑوں سے ٹکریں مارنے کے بعد آیون میں بھی تھوڑی سی کوہ پیمائی کرآئی تھی۔ میری آنکھوں میں تھکن جالوں کی صورت اُتر رہی تھی۔ بصارت دُھندلا رہی تھی۔ میرا جسم وہیں قالین پر لم لیٹ ہونے کو چاہ رہا تھا۔

میں نے اُس گل رنگ چہرے پر محبت پاش نظریں ڈالیں اور ملتجی لہجے میں کہا جو گھر میں پکا ہوا ہے بس وہی لے آؤ۔

''ارے بھنڈی پکائی ہے۔'' میرامان کی بہن کی ہنسی خفت بھری تھی۔

''لو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ بھنڈی تو میری پسندیدہ ڈش ہے۔''

چاولوں کی قاب آئی۔ بھنڈی آئی۔ کٹا پیاز اور ٹماٹر کا سلاد آیا۔

میں کھانے سے فارغ ہوئی ہی تھی جب میرامان کی پشاور والی بھاوج اور اسکا بڑا بھائی نور شاہدین جو A.K.R.S.P میں بطور مینجر ڈیپوٹیشن پر دو سال کے لئے پشاور سے چترال آیا ہوا تھا کمرے میں داخل ہوئے۔ دھان پان سی میرامان کی یہ بھاوج کسقدر ملنسار تھی۔ اسمیں محبت کی گرمی اور بے پایاں خلوص کی مہک تھی۔

باتیں شروع ہوئیں۔ میرا اگلے دن کا پروگرام زیر بحث آیا۔ میں نے شوگرام اور ریشن جانے کے متعلق بتایا۔

''سیار بابا کی زیارت پر جانا چاہتی ہیں۔'' نور شاہدین نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ہم لوگ صبح مستوج جا رہے ہیں۔ شوگرام راستے میں ہے۔ آپکو وہاں ڈراپ کر دیں گے۔ ریشن میں عزیز ہیں۔ اُن سے آپکا تعارف بھی کروا دیں گے۔ آپکے لئے آسانی ہو جائے گی۔ سچی بات ہے کہ یہ اتنی فراخدلانہ پیشکش میری آنکھوں سے نیند اور میرے جسم سے تھکن یوں لے اڑی تھی جیسے ٹرائے کا شہزادہ یونانی شہزادی ہیلن کو لے اُڑا تھا۔

میں جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ میرامان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے تہہ دل سے اس فیملی کا شکریہ ادا کیا جو رات کے سناٹے میں میرے لئے گھر کے کمپاؤنڈ میں ایک

باب نمبر۔٦

شوگرام سیار بابا۔ ریشن اور یارمن ہمیں

اُس سمے آسمان اتنا نیلا اتنا شفاف اور اتنا روشن نظر آیا تھا کہ اسکی سمت دیکھتے ہوئے میری ساری حسیات عجیب سے محسوسات کی زد میں تھیں۔ دھوپ کی تیزی کو ہوائیں کاٹ رہی تھیں۔ دریائے مستوج کا سیمنٹ گھلا پانی فضا پر چھائے اس الوہی سناٹے کو چیختے چنگھاڑتے اور شور مچاتے توڑ رہا تھا۔ دریائے مستوج کے طول بلد کا حساب کتاب تو خیر ذرا مشکل بات تھی پر عرض بلد تو میدانی علاقے کی کسی عام نہر جتنا ہی تھا۔ میدانی علاقوں کی نہروں کی کیا بات کس سُبک خرامی کس وقار اور کتنی عاجزی سے بہتی ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ شاذ و نادر ہی آپے سے باہر آنے کی نوبت آتی ہے۔ اور یہاں گھن گرج کا وہ عالم تھا کہ جیسے شیر جنگل میں دھاڑتا ہو۔

میں مستوج روڈ پر کھڑی تھی چُپ چاپ گُم سُم تن تنہا اور کسی قدر خوف زدہ سی۔ نور شاہدین اور جیلانی صاحب مجھے اُتار کر آگے بڑھ گئے تھے۔

میں نے دیکھا تھا پتھریلا ڈھلانی راستہ آگے جا کر معلق پُل سے جاملتا تھا۔ لکڑی کے تختوں اور لوہے کی تاروں سے بنا یہ پُل دیکھنے میں کچھ اتنا مضبوط نظر نہیں آتا تھا۔ پھر عمودی چڑھائی تھی اور پار یقیناً شوگرام کا گاؤں تھا۔

میرا جی وہیں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ شاید میں فضا پر چھائے سناٹے کو اپنے اندر اُتار لینا چاہتی تھی۔ شاید میں دعائیں مانگنے کی آرزومند تھی۔ پر وہاں سایہ نہیں تھا۔ پھر میں نے دھیرے

''یہ کس کے لئے پکانے لگی ہیں؟''

''آپکے لئے۔'' اُسنے ہنستے ہوئے اپنی نشیلی آنکھوں سے میری طرف اشارہ دیا۔

''خدایا۔'' میں نے فی الفور کھڑے ہوکر ٹرے اُسکے ہاتھوں سے پکڑلی۔

میں صبح پانچ بجے کی اٹھی ہوئی تھی۔ بمبوریت کے پہاڑوں سے ٹکریں مارنے کے بعد آیون میں بھی تھوڑی سی کوہ پیمائی کر آئی تھی۔ میری آنکھوں میں تھکن جالوں کی صورت اُتر رہی تھی۔ بصارت دُھندلا رہی تھی۔ میرا جسم وہیں قالین پر لم لیٹ ہونے کو چاہ رہا تھا۔

میں نے اُس گل رنگ چہرے پر محبت پاش نظریں ڈالیں اور ملتجی لہجے میں کہا جو گھر میں پکا ہوا ہے، بس وہی لے آؤ۔

''ارے بھنڈی پکائی ہے۔'' میرامان کی بہن کی ہنسی خفت بھری تھی۔

''لو یہ تو اور بھی اچھی بات ہے۔ بھنڈی تو میری پسندیدہ ڈش ہے۔''

چاولوں کی قاب آئی۔ بھنڈی آئی۔ کٹا پیاز اور ٹماٹر کا سلاد آیا۔

میں کھانے سے فارغ ہوئی ہی تھی جب میرامان کی پشاور والی بھاوج اور اسکا بڑا بھائی نور شاہدین جو A.K.R.S.P میں بطور مینجر ڈیپوٹیشن پر دو سال کے لئے پشاور سے چترال آیا ہوا تھا کمرے میں داخل ہوئے۔ دھان پان سی میرامان کی یہ بھاوج کسقدر ملنسار تھی۔ اسمیں محبت کی گرمی اور بے پایاں خلوص کی مہک تھی۔

باتیں شروع ہوئیں۔ میرا اگلے دن کا پروگرام زیرِ بحث آیا۔ میں نے شوگرام اور ریشن جانے کے متعلق بتایا۔

''سیار بابا کی زیارت پر جانا چاہتی ہیں۔'' نور شاہدین نے پوچھا۔

''جی ہاں۔'' ہم لوگ صبح مستوج جا رہے ہیں۔ شوگرام راستے میں ہے۔ آپکو وہاں ڈراپ کر دیں گے۔ ریشن میں عزیز ہیں۔ اُن سے آپکا تعارف بھی کروا دیں گے۔ آپکے لئے آسانی ہو جائے گی۔ سچی بات ہے کہ یہ اتنی فراخدلانہ پیشکش میری آنکھوں سے نیند اور میرے جسم سے تھکن یوں لے اڑی تھی جیسے ٹرائے کا شہزادہ یونانی شہزادی ہیلن کو لے اڑا تھا۔

میں جانے کے لئے کھڑی ہوئی۔ میرامان کے ساتھ گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے تہہ دل سے اس فیملی کا شکریہ ادا کیا جو رات کے سناٹے میں میرے لئے گھر کے کمپاؤنڈ میں ایک دوسرے کے پاس پاس کھڑے تھے۔

باب نمبر-٦

شوگرام سیار بابا۔ ریشن

اور یارمن ہمیں

اُس سے آسمان اتنا نیلا اتنا شفاف اور اتنا روشن نظر آیا تھا کہ اسکی سمت دیکھتے ہوئے میری ساری حسیات عجیب سے محسوسات کی زد میں تھیں۔ دھوپ کی تیزی کو ہوائیں کاٹ رہی تھیں۔ دریائے مستوج کا سیمنٹ گھلا پانی فضا پر چھائے اس الوہی سناٹے کو چیختے چنگھاڑتے اور شور مچاتے توڑ رہا تھا۔ دریائے مستوج کے طول بلد کا حساب کتاب تو خیر ذرا مشکل بات تھی پر عرض بلد تو میدانی علاقے کی کسی عام نہر جتنا ہی تھا۔ میدانی علاقوں کی نہروں کی کیا بات کس سُبک خرامی کس وقار اور کتنی عاجزی سے بہتی ہیں کہ کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ شاذ و نادر ہی آپے سے باہر آنے کی نوبت آتی ہے۔ اور یہاں گھن گرج کا وہ عالم تھا کہ جیسے شیر جنگل میں دھاڑتا ہو۔

میں مستوج روڈ پر کھڑی تھی چُپ چاپ گُم سُم تن تنہا اور کسی قدر خوف زدہ سی۔ نور شاہدین اور جیلانی صاحب مجھے اُتار کر آگے بڑھ گئے تھے۔

میں نے دیکھا تھا پتھریلا ڈھلانی راستہ آگے جا کر معلق پُل سے جا ملتا تھا۔ لکڑی کے تختوں اور لوہے کی تاروں سے بنا یہ پُل دیکھنے میں کچھ اتنا مضبوط نظر نہیں آتا تھا۔ پھر عمودی چڑھائی تھی اور پار یقیناً شوگرام کا گاؤں تھا۔

میرا جی وہیں بیٹھنے کو چاہ رہا تھا۔ شاید میں فضا پر چھائے سناٹے کو اپنے اندر اُتار لینا چاہتی تھی۔ شاید میں دعائیں مانگنے کی آرزو مند تھی۔ پر وہاں سایہ نہیں تھا۔ پھر میں نے ڈھیرے

دھیرے پاؤں جما جما کر ڈھلانی راستہ اُترنا شروع کیا۔ مستوج روڈ کی دیوار میرے داہنے ہاتھ کو سہارا دیئے ہوئے تھی۔ دفعتاً میرا پاؤں بجری پر پھسلا اور میں قدرے لڑھکتی ہوئی پُل کے ستون سے جا ٹکرائی۔ صد شکر کہ یہ ٹکراؤ ستون کے ساتھ ہی ہوا۔ پشت پتھروں کی دیوار سے ٹکاتے ہوئے لمبی سانس بھرتے ہوئے میں نے خود سے کہا تھا۔ میاں ٹھیک ہی کہتا ہے۔ ''چین نہیں تجھے آرام کی گرانی لڑتی ہے۔''

سُورج سے بچاؤ کی جو تھوڑی سی جگہ مجھے نظر آئی وہیں کھڑے ہو کر نظاروں کو اپنے اندر جذب کرتے ہوئے بے اختیار میں نے کسی انسانی صورت کسی آواز کسی جانور یا پرندے کی چہچہاہٹ کو دیکھنے اور سُننے کی خواہش کی پر وہاں دریا کی شوریدہ سر لہروں کے شور کے سوا کچھ نہیں تھا۔

پُل کے لوہے کے رسے کو پکڑ کر چلنا شروع کیا۔ ہوائیں اتنی تیز تھیں کہ لگتا تھا جیسے جی جان سے چاہتی ہوں کہ مجھے اُٹھا کر دریا میں پھینک دیں۔ قمیض کا دامن اور ڈوپٹہ ہاتھوں سے نکل نکل جاتے تھے اُس ناراض فلمی ہیرو کیطرح جو اپنی دلنواز محبوبہ کی بانہوں کے دائروں کو رکھائی سے جھٹکتا اور توڑتا باہر بھاگتا ہو۔ لکڑی کے تختے چلنے سے جھولتے تھے۔ دریا کی شوکریں دل دہلائے دیتی تھیں۔ دفعتاً میرا جی پُل کے تختوں پر بیٹھ کر لوہے کی تاروں کے جال سے بنے سہاروں میں ٹانگیں پھنسا کر انہیں نیچے دریا پر لٹکانے کو چاہا۔ ایک لمحے کے لئے رُک کر میں نے اپنی اس بے تکی خواہش کی معقولیت کا جائزہ لیا۔ دوسرے لمحے اپنے آپ سے گفتگو کرنے کا انداز بڑا تاسف بھرا تھا۔ نہایت فضول عورت ہوں میں بھی۔ کبھی کوئی معقول بات کوئی تک کی سوچ تو ذہن میں آئے گی نہیں جب سوچوں گی ایسی ہی بونگی اور بے تکی باتیں۔ مہم جوئی میں جتنے پنگے لے سکتی ہوں چلو وہ تو ٹھیک ہے۔ پر ان پنگوں میں بھی مزید پنگے لینا کہاں کی دانائی ہے۔ لہٰذا بندی بنو۔ آنکھ جھپکنے تک کے وقفے میں سینکڑوں فٹ نیچے جا سکتی ہو۔ پچھلے بیچارے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے اگر تمہیں یہاں بھیج بیٹھے ہیں تو کچھ ان کی عزت و آبرو کا خیال کرو۔

زمین پر پاؤں رکھا۔ خدا کا شکر ادا کیا۔ ایک نظر دریا پر اور دوسری اپنے سامنے عمودی چڑھائی پر ڈالی۔ عین اُسوقت باتھ روم جانے کی ضرورت کا شدت سے احساس ہوا۔ یہاں اس ویرانے میں اس کارخیر کے لئے جگہ تو بہتیری تھی پانی بھی ٹنوں کے حساب سے موجود تھا۔ پر ''اگر'' کے سلسلے ہراساں کئے دیتے تھے۔ کسی انسانی صورت کا اچانک ظہور پانی تک رسائی کے لئے خوفناک اُترائی ایک اور آپشن صحرائی خشکی والی بھی سامنے تھی۔ لیکن وہ مجھے قبول نہ تھی۔ اجنبی جگہوں پر مختصر کسری نماز کے سجدے جو لطف و انبساط اور سرُ ور بخش رہے تھے اُن سے محرومی مجھے ہر گز گوارہ نہ تھی۔ روح کا گند اور زنگ دونوں اُتر رہے تھے ایسے میں بدنی پاکیزگی کا متاثر ہونا بھی پسند نہ تھا۔

''اُف میرے اللہ مجھے صُبح اتنا سارا پانی نہیں پینا چاہئیے تھا'' میں نے روئکھی آواز میں اپنے آپ سے کہا۔

دراصل گذشتہ چند سالوں سے ڈی ہائیڈریشن کا مسئلہ جان سے چمٹ گیا ہے۔ گردوں کی فلٹریشن ہمہ وقت ہونی ضروری ہے۔ ہر صُبح اُٹھنے کے بعد میرا پہلا کام ڈھیر سارا پانی جسم کے اندر کرنا ہوتا ہے۔ آج سویرے آنکھ دیر سے کھلی باہر نکل کر دیکھا چترال کی یہ صبح اپنے اندر ہلکی ہلکی سی خنکی لئے ہوئے بہت خوبصورت لگی تھی۔ چونکہ سات بجے روانگی تھی اس لئے پانی اُس تواتر سے نہ پیا گیا یوں بھی دو معزز مردوں کے ساتھ سفر کرنا تھا۔ چائے کا ایک کپ پینے کے بعد میں تیار ہو کر ریسٹ ہاؤس سے باہر درخت کے سائے میں پتھر پر بیٹھ گئی میرے لئے یہ بات ہمیشہ ناپسندیدہ رہی کہ اپنے ساتھ لے جانے والا شخص مجھے کھوج کرتا پھرے۔

اچانک مجھے اپنے کلیجے میں جلن کا احساس ہوا۔ خیر سے تیز چائے اپنا کام دکھا رہی تھی۔ ''یار کوئی پرابلم نہ ہو جائے'' خوف زدہ سی اپنے آپ سے بولتی ریسٹ ہاؤس کیطرف بھاگی کچن کے فرج سے ٹھنڈی ٹھار بوتل نکال کر لبالب بھرے دو گلاس پئیے اور پھر سارا معاملہ اللہ کے سپرد کرتے ہوئے دوبارہ اُسی جگہ آ کر بیٹھ گئی۔ ٹھیک سات بجے A.K.R.S.P کی گاڑی سڑک

پر رُکی نور شاہدین صاحب نے مزاج پُرسی کی۔ نئ نویلی گاڑی کا بیک ڈور کھولا۔ ہم دونوں نے آمنے سامنے کی سیٹیں سنبھالیں۔ ڈرائیور کے ساتھ فرنٹ سیٹ پر بیٹھے ایک اور صاحب سے تعارف ہوا گنگھریالے بالوں والا اُونچا لمبا کوہستانی مرد جیلانی صاحب A.K.R.S.P میں بطور مینجر کام کرتے تھے۔ وزیراعظم بھٹو کے دور میں بنائی گئی یہ سڑک بہت شاندار ہے۔ بونی تک کارپیٹڈ آگے شندھور تک کچی۔

گاڑی نئ ڈرائیور ماہر سڑک عمدہ اور دو مقامی لوگوں کی سنگت باتوں میں راستے کی خوبصورتی اور حُسن پر دھیان دینے کی فرصت ہی نہ ملی۔

پھر لواری ٹنل سے متعلق وہ سوال میرے ہونٹوں پر آ گئے جنہیں میں نے اپنے مختصر سے قیام کے دوران ہر چترالی کی دُکھتی رگ کے طور پر محسوس کئے تھے۔

''آخر کیا وجہ ہے؟ حکومت اس معاملے میں دلچسپی نہیں لیتی فنڈز کی دستیابی کا کوئی مسئلہ ہے؟ کوئی بیرونی عنصر اسکی تکمیل میں رُکاوٹ کا باعث ہے؟''

نور شاہدین گورنمنٹ ملازم تھے۔ ڈیپوٹیشن پر آغا خان دیہی ترقیاتی پروجیکٹ پر پشاور سے دو سال کے لئے چترال آئے ہوئے تھے یوں رہنے والے چترال کے ہی تھے۔ میرے سوالوں کی یلغار پر رسان سے بولے۔

''بھٹو کے زمانے میں کام تو شروع ہوا تھا پھر بند ہو گیا۔ دراصل دیر اور چترال کے درمیان ۱۰۵۰۰ فٹ بلند اس درّے پر اخراجات کا جو تخمینہ لگایا گیا تھا وہ اسکی افادیت کے مقابلے میں بہت زیادہ تھا۔''

''کمال ہے ایسے اہم منصوبوں کی پلیننگ دیہاڑی ڈنگوں کے لئے تھوڑی ہوتی ہے اُنکا دائرہ کار تو سینکڑوں سالوں پر محیط ہوتا ہے۔''

سرکاری افسر نے مسکرا دینے میں ہی اپنی عافیت جانی تھی۔ کہتا بھی کیا۔ حکمرانوں کو اپنے اللّے تللّوں اور اپنے مفادات کے تحفظ سے فرصت ملے تب نا بھاڑ میں جائیں لوگ اور

چولہے میں جائیں انکے زندگی وموت سے متعلق مسائل۔

ریشن پہنچ کررُکے۔ گاڑی کا بیک ڈور کھولتے ہوئے نور شاہدین نے سڑک پر چھلانگ مارتے ہوئے کہا۔ ''آیئے اپنے عزیزوں سے آپکا تعارف کروادوں۔ شوگرام سے فارغ ہو کر اس وادی میں آجائیں۔''

میں قدرے احتیاط سے اُتری۔ چھلانگیں مارنے والی عمر اب نہیں رہی تھی لہذا ڈرتی تھی۔ سڑک پر کھڑے ہو کر تازہ خوشگوار اور ٹھنڈی ہوا سے اپنے آپکو نہال کرتے ہوئے گردوپیش پر نظر ڈالی۔ سڑک کے دائیں ہاتھ چند دوکانیں تھیں۔ بائیں طرف درختوں سے گھرے دو تین مکان اوپر سے بہتی آتی ننھی مُنی سی کھال۔

نور شاہدین کی عزیزہ گھر کے سامنے مرغیوں کے بچوں کی دیکھ بھال میں مصروف تھیں۔ چھ فٹی قامت پر قدرے بھاری وجود طباق سے چہرے پر موٹی موٹی محبت بھری آنکھیں نور شاہدین کھوار زبان میں تیز تیز جانے کیا کیا بولے چلا جارہا تھا اور وہ ہنس رہی تھیں۔

مجھے گلے لگاتے ہوئے انہوں نے میرے رخسار پر بوسہ دیا۔ پھر انہوں نے شاہدین کو گھر کیطرف زوروشور سے بُلانا شروع کر دیا۔ پر شاہدین ہاتھ ہلاتے ہوئے کچھ بولتے ہوئے گاڑی کیطرف بھاگ رہے تھے۔ میں بھی اُنکے تعاقب میں تھی۔ گاڑی میں لدائی کے بعد جب ذراسانس درست ہوئی نور شاہدین کی آواز پر میں نے باہر کی جانب توجہ کی۔

دیکھئے ذرا سرخ مٹی سرخ پہاڑ سیار بابا کا کہنا تھا۔ کہ ان پہاڑوں اور اس مٹی نے انکے محبوب کے ہونٹوں کی لالی چُرائی ہے۔

یہ عاشقی بھی کیا چیز ہے زمین وآسمان کے قلابے ملانا سکھادیتی ہے۔

دفعتاً گاڑی کی رفتار بہت مدھم ہوگئی۔ یہاں سڑک ٹوٹی پھوٹی تھی بارش کے پانی کے لئے چینل بن رہے تھے پہاڑوں کے دامنوں میں دھواں دھار قسم کا کام ہورہا تھا۔

اور پھر شوگرام آگیا۔

عمودی چڑھائی چڑھ کر جب میں ہانپتی کانپتی ایک جگہ ستانے کے لئے کھڑی ہوئی مجھے داہنے ہاتھ ایک بوڑھی عورت دکھائی دی۔ بے سرے سے ملگجے کپڑے تبتیوں کی طرح نقش و نگار والا چہرہ سیدھی مانگ میل سے اٹے ہوئے بال جنکی گُندھی ہوئی مینڈھیاں پتلے اور لاغر سانپوں کی مانند اسکے سینے پر دوڑی پھرتی تھیں۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُسکی تکونی آنکھوں نے پھیلنے کی پوری کوشش کی۔ آنکھوں کے اس پھیلاؤ سے میں ڈر سی گئی۔ یکدم میں نے کہا۔"سیار بابا کی زیارت۔"

زیارت زیارت زیارت اُسنے اپنے سینے پر ہاتھ مارا دُور پہاڑوں کی طرف اشارہ کیا پھر پوپلے مُنہ کو کھول کر ٹوٹی پھوٹی بتیسی کی نمائش کرتے ہوئے جانے کیا بولنا شروع کر دیا۔ میں ہونقوں کیطرح کھڑی اُسے دیکھتی اور سُنتی تھی۔

پھر اسکے کھردرے خشکی سے پھٹے ہاتھوں نے میری کلائی تھامی اور مجھے گھسیٹنا شروع کر دیا۔ یقیناً وہ مجھے سیار بابا کی زیارت پر لے جانا چاہتی تھی پر زیارت سے پہلے ایک مسئلہ حل کرنے والا تھا۔ میں نے اُسے سمجھانا چاہا پر اُسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی۔ تھوڑی دیر اُسکے ساتھ جھک مارنے کے بعد میں نے عملی مظاہرہ کرنے کا سوچا۔ میرے ایکشن کو اُسنے سمجھا۔ شفقت بھری ہنسی اُسکی آنکھوں میں پھیلی اور وہ مجھے ہاتھ سے تھام کر ایک ایسی جگہ لے آئی جو یقیناً مویشیوں کا باڑہ تھی۔

گوبر توڑی اور گندمند سے فرش اٹا پڑا تھا شکر تھا کہ چھت نہیں تھی وگرنہ بو سے سر پھٹنے لگتا۔

پنجاب کے گاؤں کے مویشیوں کے باڑوں میں جانے کا مجھے خاصا تجربہ ہے۔ پتھروں کی دیواریں خاصی اونچی تھیں۔ دروازہ مضبوط تھا۔ تفصیلی جائزے نے مجھے مطمئن تو کر دیا پر مسئلہ پانی کا تھا۔ میں نے اونگے بونگے طریقے سے اُسے مدعا سمجھایا وہ باہر گئی اور جب چھوٹی سی کھڑکی کے راستے اندر داخل ہوئی تو اُسے دیکھتے ہی میری ہنسی چھوٹ گئی اُسکے ہاتھ میں مٹی کا بڑا سا روڑا تھا۔

"خدایا" میں نے ہنسی روک کر آب آب کہا یہ سوچتے ہوئے کہ کھوار اور فارسی میں

قریبی رشتے داری ہے۔

اب پھر وہی ہونقوں والی صورت حال تھی۔ لہذا میں نے اپنی مدد آپ کرنے کا فیصلہ کیا اور کھڑکی کے راستے باہر آنگن میں آ گئی۔ وہاں اُسکا پوتا بہو اور چند نوخیز بچے تھے۔ دس سال کے ایک لڑکے نے میری بات سمجھی اور لوٹے میں مجھے پانی لا کر دیا۔

آنگن میں اُگے شہتوت کے درخت کی چھدری چھاؤں تلے بچھے پلاسٹک کے قالین جسے گھر کے مرد نے آناً فاناً وہاں بچھا دیا تھا پر بیٹھ کر میں نے کنال کے رقبے میں گھرے گھر کی کھڑکیوں دروازوں روشندانوں سوراخوں اور درزوں سے جھانکتی غریبی کو بے طرح محسوس کیا تھا۔

لعل خان کراچی کی کسی فیکٹری میں ملازم تھا۔ گندم کی کٹائی کرنے کے لئے ایک ماہ کی چھٹی پر آیا ہوا تھا۔

سیبوں کی طرح دہکتے ہوئے گالوں والے لڑکے نے چشمے کے ٹھنڈے ٹھار پانی کا کٹورہ میرے ہاتھوں میں تھما دیا۔ جسے جی بھر کر پینے کے بعد میں نے لعل خان سے اُسکی زمینوں کے بارے میں استفسار کیا۔

کراچی کی ہواؤں اور محنت کی چکی نے لعل خان کی سُرخ وسفید رنگت کو جھلسا کر رکھ دیا تھا۔ اس پر یاس اور دُکھ کے جو رنگ بکھرے۔ اسکی شربتی آنکھوں میں حُزن کا جو الاؤ دہکا وہ مجھے مضطرب کرنے کے لئے کافی تھا۔

''بس چھ سات ماہ کے گزارے کی گندم مل جاتی ہے۔ کچھ بھیڑ بکریوں کے لئے چارہ ہو جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی کو دھکا دیتے دیتے ہانپنے لگا ہوں۔ بہت خواہش ہے کہ مہمانوں کے لئے ایک کمرہ کھڑا کرلوں پر۔۔۔۔۔۔''

اُسنے جملہ اُدھورا چھوڑ دیا تھا۔ میں نے اُسکی دلداری کے لئے محبت سے کہا۔

''مایوس نہیں ہوتے۔ گھروں کا کیا ہے مکینوں کی خیر ہو وہ تو بن ہی جاتے ہیں۔''

یونہی گردن موڑ کر اپنی پُشت پر پانچ فٹ اونچے اور ڈیڑھ فٹ چوڑے کچے کوٹھے کو کیا

دیکھا لگا جیسے کسی نے فلیش بیک کا بٹن کھٹ سے دبا دیا ہو۔ اس کوٹھے میں نصب ایک فٹ لمبائی چوڑائی والے دو پٹوں کے کھردرے سے دروازے نے میرے ہاتھوں میں کھجلی سی کردی۔ گاؤں میں دادی کے گندم کے پڑولے یاد آئے تھے جن میں ٹھکے ایسے ہی دو پٹوں کے دروازوں کی کنڈیاں میرے ننھے منے ہاتھ دھیرے دھیرے کھول کر گندم کے دانوں سے میلی چُنی کا دامن بھر لیتے۔ پھر گاؤں کی ہٹی سے رنگ برنگی مچھیوں (میٹھی گولیاں) مرونڈوں اور تل والی گچک کا تبادلہ ہوتا۔ جیٹھ اور ہاڑ کی تپتی دوپہریں میرے ایسے ذائقوں چوریوں اور آوارہ گردیوں کی گواہ تھیں۔ زبان کے چٹخارے قیمتی گندم کے دانوں کی چوری اور اواگونیوں کے راز جب طشت از بام ہوئے تو جھونٹے پکڑ پکڑ کر جس جس انداز میں زدوکوب کیا گیا کوسنوں اور بددعاؤں کی بارش میں جیسے نہلایا گیا اسکی تفصیل قطعاً خوشگوار نہیں۔

اواگون جیسا خطاب اور مُتّی رہ جاویں" (یعنی سوئی رہ جاؤ۔ مرجاؤ) جیسی بددعا مستقل دعا کی صورت میں نصیب ہوئی۔ جب بھی چھٹیاں گزار نے دادی کے چرنوں میں حاضری دی ان سوغاتوں سے جی بھر کر مالا مال ہوئے۔ اور اب کہیں اگر جنت کے کسی روشندان سے مجھ پر اُن کی نظر پڑ جائے اس اجنبی جگہ پر اجنبی لوگوں کے درمیان بیٹھا دیکھ کر زمانے بھر کی تیوریوں سے ماتھا سجا کر اور ہونٹوں کے زاویے سکوڑ کر یہی کہیں گی۔ "اے اسکے تو پور پور میں آوارہ گردی رچی ہوئی ہے۔ سدا کی اواگون"

اور میں نے شفاف آسمان کے سینے پر جمی نگاہوں کو فی الفور جھکا کر چلو بھر پانی کی بجائے اپنے گریبان میں جھانک کر مرنے کو بہتر جانا تھا کہ بیچارہ کچھ تو میری آبرو کے بھرم رکھنے کا سزاوار تھا۔

یادوں کے گلشن کھلوانے والے پڑولے کے بارے میں پوچھنے پر پتہ چلا کہ اس میں گرمی سے بچاؤ کے لئے دودھ رکھا جاتا ہے۔ اب بھلا یہ کیسے ممکن تھا کہ اتنی اہمیت کی حامل شے کو اندر سے نہ دیکھا جاتا۔ دیکھا۔ جگہ اندر سے ٹھنڈی اور اندھیری تھی پر اُس مخصوص باس نے لپک کر

استقبال نہ کیا جو کہیں ناک کے راستے دل و دماغ کے کسی گوشے میں سکڑی بیٹھی تھی اور اس وقت میں اُسکے سحر میں اُلجھی ہوئی اُسے سونگھنے کی متمنی تھی۔

''مزار پر چلنا چاہیئے'' میں کھڑی ہوگئی۔

''ابھی بیٹھیۓ'' لعل خان میرے ساتھ ہی کھڑا ہوگیا تھا۔لڑکا خوبانیاں توڑنے گیا ہے۔بس آتا ہی ہوگا۔کچھ کھالیں۔

''واپسی پر''

لعل خان آگے میں پیچھے اور میرے تعاقب میں مقامی بچوں کا ریوڑ۔کھیتوں کی چھوٹی چھوٹی سی وٹیں۔دائیں بائیں گندم کی سنہری پکی فصل کٹنے کے لئے تیار اور کہیں پولھوں کی صورت کٹی پڑی۔شفتل کے کھیتوں سے اٹھتی بھینی بھینی خوشبو شہتوت کے درختوں سے گرے ہوئے پکے رسیلے توت جنہیں میں چلتے چلتے رُک کر اٹھا کر کھانے سے باز نہ رہ سکی چمکتا سورج جسکی دھوپ سے بچنے کے لئے میں اطراف میں اُگے درختوں کے چھوٹے سے چھوٹے سائے میں بھی چلنے کو ترجیح دیتی اور اس کاوش میں دوبار کنارے کی چھوٹی سی کھال میں پھسل کر دایاں پاؤں کیچڑ سے لت پت کروا بیٹھی تھی۔

''میں آپکو شوگرام کے ایک بہت پڑھے لکھے آدمی کے پاس لے جارہا ہوں وہ آپکی رہنمائی بہتر انداز میں کرے گا۔''

''یہ تو بہت اچھا ہوا'' لعل خان کی بات پر میں نے خوشی کا اظہار کیا۔

اونچی نیچی پگڈنڈیوں کے خاصے فاصلے طے کرنے کے بعد ایک بڑے دروازے سے جس گھر کے اندر داخل ہوئے تھے اُسے دیکھ کر میں ایک خوشگوار حیرت سے دوچار ہوئی تھی۔بسنتی قرمزی اور سرُخ پھولوں سے اٹا پڑا لان جسکے بیچوں بیچ چار فٹ کا راستہ بہت خوبصورت جدید وضع کے مہمان خانے تک جاتا تھا۔بڑے گیٹ کے عین سامنے لمبا چوڑا سیمنٹ کا پختہ چبوترہ جس پر چنار کے گھنے درخت کی گھنی چھاؤں تلے موٹے پائیوں والی دو چار پائیاں بچھی تھیں۔ان

چار پائیوں پر انتہائی قیمتی قالین دھوپ لگوانے کے لیے ڈالے ہوئے تھے۔

سامنے کی طرف مقامی گھر جسکی کچی دیواریں اور چوڑے دروازے یہ بتاتے تھے کہ چترالی خواہ کتنا ہی امیر کیوں نہ ہو اُسے سکون اور طمانیت اپنے پرانے طرز تعمیر والے گھر میں ہی ملتی ہے۔

چہرے پر چشمہ سجائے کھلتی ہوئی گندمی رنگت والا نوجوان مسکراتے ہوئے ہماری پیشوائی کے لئے آگے بڑھا وہ صاحب خانہ سردار زمان ایم۔اے۔بی۔ایڈ تھے۔ پشاور یونیورسٹی سے پڑھے تھے اور ریشن ہائی سکول میں بطور سنئیر ٹیچر کام کر رہے تھے۔

تعارف ہوا۔ چبوترے پر پڑی دو کرسیوں میں سے ایک انہوں نے میری طرف بڑھائی میں سکون سے بیٹھنا چاہتی تھی کہ صاحب خانہ صاحب علم تھا اور علاقے کی صورت حال پر سیر حاصل بحث ہو سکتی تھی۔ ایک چارپائی کے قالین کو اکٹھا کرتے ہوئے میں نے جوتے اُتار کر الانی چارپائی پر بے تکلفی سے بیٹھتے ہوئے کہا۔

''معاف کیجئے گا میں ایسے زیادہ ٹھیک ہوں۔''

چنار کی ٹھنڈی چھاؤں سامنے دائیں بائیں بلند و بالا پُر ہیبت پہاڑ۔ ہنستے مسکراتے پھول سرسبز لان اور ہاتھ میں پکڑا روح افزا کا گلاس۔ جی چاہا تھا آنکھیں بند کرلوں اور فطرت کی گود میں سو جاؤں۔

خالی گلاس ابھی ٹرے میں ہی رکھا تھا کہ کروشیے کے سفید رومال سے ڈھنپا خوبانیوں کا تھال آ گیا یہ تحفہ لعل خان کے گھر سے آیا تھا۔ خوان پوش کا سرکنا تھا کہ سامنے سنہری رسیلی اور دلربا خوبانیوں کا جہان نظر آیا۔ جنت میں اگر ایسے ہی پھلوں کی بشارت ہے تب وہاں نہ جانا کتنے افسوس کی بات ہوگی۔ اپنی آنکھوں کا ندیدہ پن اپنی زبان کا رال ٹپکانا اور اپنے ہاتھوں کا اُن پری وشوں کا قیمہ بنانے کا اضطراب مجھ پر آشکارا ہو گیا تھا۔ میں نے سب کو کھلی چھٹی دے دی۔ کسی پر بند لگانے کی کوشش نہیں کی۔ ظاہر ہے جب صورت حال اتنی حوصلہ افزا ہوگی اور حملہ آور ایسے دلیر

اور جری ہوں گے تو کشتوں کے پشتے لگنا فطری بات ہے۔

جب سیار بابا کی زیارت کے لئے روانہ ہوئے اسوقت دھوپ پورے عروج پر تھی۔ گو مزار کا راستہ کشادہ تھا۔ پر چڑھائی اور اُترائی دونوں سانس پُھلائے دیتی تھیں۔ اطراف میں اُگی سنجور کی جھاڑیاں دامن پکڑتی تھیں۔ قبر شکستہ تھی۔ بانس کے ڈنڈوں سے لٹکتے رنگ برنگے پھریرے منتوں اور مرادوں کی تکمیل کے نمائندے تھے۔ قبر کے سرہانے اور پائنتی زنگ آلود لوہے کے دوفٹ لمبے پتر ے گڑے تھے۔

ان کی غرض وغایت کے بارے میں پوچھا تو پتہ چلا کہ یہ سُنی اور آغا خانی قبروں کی تخصیص کے لئے ہیں۔ فاتحہ خوانی کے لئے ہاتھ اٹھائے اختتام پر چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے ہالے میں لیتے ہی میری نظریں ادھر اُدھر پھیل گئیں۔

شوگرام پائین کی خوبصورت وادی عین میرے سامنے بہت نیچے کسی خوبصورت انگوٹھی میں چمکتے دمکتے ہیرے کی مانند نظر آئی تھی۔ داہنی سمت زوموسور کا وہ پہاڑ تھا جہاں بیٹھ کر سیار بابا اپنی محبوبہ کے گاؤں کو دیکھتے اور اس کے عشق میں ڈوب کر شاعری کرتے۔ میری پُشت پر وہ پہاڑ تھے جن کے سینوں پر بہت سی دیواروں کے آثار سردار زماں کی نشاندہی پر میں نے دیکھے تھے۔ یہ لوگ کون تھے؟ کہاں سے آئے تھے کیوں آئے اور پھر کہاں چلے گئے؟ پتھروں کی دیواریں ٹوٹے پھوٹے گھر آگ جلانے کی جگہیں برتن کچھ ادھوری داستانیں سُناتے ہیں۔

اس سے انسانی حیات اور اسکی ہجرتوں کی بابت بے شمار سوال ذہن میں پیدا ہوئے انکے جوابات کا سلسلہ کہیں تاریخی کہیں جغرافیائی کہیں مذہبی اور کہیں معاشی اور معاشرتی عوامل کے حوالوں سے اتنا گنجل دار تھا کہ میں نے گھبرا کر سر جھٹکا اور پستہ قد سبز جھاڑیوں اونچے لمبے درختوں چمکتی دمکتی دھوپ اور وادی کے حُسن میں خود کو مصروف کیا کہ یہ وقت صرف ان چیزوں کے لئے تھا۔

''شوگرام پائین چلتے ہیں'' میری خواہش پر سردار زماں آگے بڑھے۔

اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے راستوں دھان کے کھیتوں کی پگڈنڈیوں اور چھوٹے چھوٹے کھالوں کے ساتھ ساتھ چلتے ہم وادی میں اُترتے گئے۔ باتوں کا سلسلہ جاری رہا۔ شوگرام بالا و پائین پانچ سو سے زیادہ نفوس والی آبادی کا گاؤں ہے۔ لڑکے لڑکیوں کا پرائمری سکول ہے۔ پاس ہی کے زیست گاؤں میں ڈسپنسری ہے۔ جو اپنی مدد آپ کے اصولوں کے تحت کام کرتی ہے۔ چاول گندم جوار اور سبزیوں میں وادی اپنی ضروریات کے لئے خود کفیل ہے۔ پڑھائی کا اتنا رواج ہے کہ مسجد بھی مکتب بنی ہوئی ہے۔ چھٹی جماعت سے بچے بچیاں ریشن کے مڈل اور ہائی سکول چلے جاتے ہیں ریشن تقریباً تین چار میل کے فاصلے پر ہے۔

وادی کی سیر کے دوران لوگوں سے علیک سلیک ہوتی رہی۔ سیاسی صورت حال پر بھی باتیں ہوئیں۔ بھٹو سے لوگ محبت کرتے ہیں اُسے مانتے ہیں۔ مہتروں کے دبائے ہوئے مظلوم انسان کو اُسنے عزت نفس دی تھی۔ چترال کے لئے اسنے بہت کام کیا۔ پیپلز پارٹی کی جڑیں عوام میں تھیں۔ گو اب بھی کسی حد تک ہیں مگر لوگ بے نظیر سے مایوس ہوئے ہیں۔ دوسرے نمبر پر جماعت اسلامی ہے۔ اس جماعت کے کارکن کام کرتے ہیں۔

''اور مسلم لیگ کی صورت حال کیا ہے؟'' میرے اس سوال پر سردار زمان نے بتایا۔ مسلم لیگ کی رُوٹس (roots) نہیں ہیں یہاں۔ صرف پرنس محی الدین کا ذاتی ووٹ بینک ہے وہ اسے جدھر چاہیں کیش کروالیں۔

اب سورج نصف النہار پر تھا۔ میری قمیض کی پشت سے پسینہ بارش کے قطروں کی صورت بہہ رہا تھا۔ اخروٹ کے ایک گھنے درخت کے نیچے ستانے کے لئے رُکے ایسی سرشاری والی ٹھنڈک تھی وہاں کہ دل کچھ دیر بیٹھنے کو چاہا۔ موضوع سخن اب سیار بابا تھے۔ سردار زماں صاحب بول رہے تھے۔

کھوار شاعری کو اُن پر فخر ہے۔ اُنکا سارا کلام ایک طرح سینہ گزٹ تھا۔ لوک ورثہ والوں نے اب لوک کہانیوں کے حوالے سے اُن پر کچھ کام کیا ہے۔ عشق مجاز سے عشق حقیقی کی

طرف سفر کرتے ہوئے انکے جذبوں نے جو شاعری تخلیق کی وہ استعاروں، تشبیہوں اور خوبصورت بندشوں سے سجی ہوئی ہے ذرا دیکھئے۔

خوشو کو سیروژاغہ باغ اوچ بیاباں مہ بوخوش

آلتی پستیمان بکوسار نو آلتی آرماں مہ بوخوش

ترجمہ: دل جہاں گھومتا ہے وہ راستے وہ باغ وہ بیابان مجھے عزیز لگتے ہیں۔ وصل حاصل کرنے سے مجھے فراق کی حالت میں وصل کی خواہش زیادہ پسند ہے۔

پونگاں زینہ مودیت چھکے مہ ہر دیا چھونی

پونگاں مکھی ہردیہ ہردیو چھومیکوت دونی

ترجمہ: تو اپنے پاؤں زمین پر نہ رکھ بلکہ تیرے قدموں کے لئے میرا دل فرش راہ ہے۔ تو قدموں کو میرے دل پر رکھ اور میرے دل میں درد کا اندازہ کر۔

زمان نے اُنکی مشہور نظم ''یارمن ہمیں'' سے مزید بند سنائے۔ اُنکی محبوبہ ''یارمن ہمیں'' کے بارے میں پُر لطف قصے سُنے شادی شدہ ''یارمن ہمیں'' کو مرزا سیار نے ایک تقریب میں دیکھا اور عشق میں مبتلا ہوا۔ ایسے کہ عشق درد بنا درد شاعری میں ڈھلا۔ شاعری عام ہوئی تو راز راز نہ رہا۔ ایک دن غُصے میں ''یارمن ہمیں'' مرزا سیار کو لعن طعن کرنے شوگرام چلی موسم دُھند کہر اور ژالہ باری میں لپٹا ہوا تھا۔ دل کو دل سے راہ ہوتی ہے۔ مرزا سیار بھی محبوبہ کو ایک نظر دیکھنے ریشن کی جانب چلا۔ ٹکراؤ تنگ پُل پر ہوا۔ اب صورت کچھ یوں تھی کہ آگے بڑھنے میں محبوب کے جسم سے ٹکراؤ یقینی پیچھے پلٹنے میں محبوب کی طرف پیٹھ کرنے کی بے ادبی۔ لہٰذا اُلٹے پاؤں چلنا شروع کیا تو پھسلن کی وجہ سے دریا کی موجوں میں پڑا۔ تیرتا ہوا ریشن جا نکلا۔ یارمن ہمیں کے ایک ہمسائے کے گھر پناہ لی۔ اتنی سردی میں یہ حالت۔ استفسار پر جواب شعروں کی صورت میں تھا۔ بس تو یہی اشعار دل کے رازوں کو زبان زد عام کر گئے۔

ایک بار محبوبہ کا چرخہ بنانا پڑا۔ مرزا نے لکڑی کے حصول کے لیے بے شمار خوبصورت

درختوں کا قیمہ کیا۔ دھاگہ ڈوری کے لیے ہندوستان گیا۔ محبتوں چاہتوں اور جذبوں کی آمیزش سے اسے تیار کرنے میں دن نہیں مہینے نہیں سال لگائے پھر کمر پر اُٹھا کر محبوبہ کو دے کر آیا۔

اور یہ سب سُنتے ہوئے میں سوچتی تھی۔ بعض عورتیں کیسی بخت ور ہوتی ہیں شوہروں اور عاشقوں دونوں کو نچوڑتی ہیں۔

ساتویں پیڑھی پر پہنچ کر سردار زماں کا شجرہ نسب سیار بابا سے جاجڑتا ہے۔ ''اپنے جد امجد کی طرح آپ نے بھی کوئی معرکہ مارا۔'' میں نے مسکراتے ہوئے زمان کی طرف دیکھا۔

زمان کھلکھلا کر ہنسا تھا۔

جب گھر واپسی ہوئی ڈیڑھ بج رہا تھا۔ چنار کی چھاؤں تلے بیٹھ کر ابھی دم ہی لیا تھا کہ لوہے کی سفید پینٹ شدہ میز پر کھانا چُن دیا گیا۔ مُرغی کا سیاہی مائل شوربہ اس بات کی تصدیق کر رہا تھا کہ چترالی لوگ سالن میں سُرخ مرچ کا استعمال بہت کم کرتے ہیں اور گوشت کی بھُنائی خوب کی جاتی ہے۔ سلاد کے نام پر پلیٹ میں جو سجایا گیا تھا وہ ہری دیسی پیاز کے آخری سرے جنہیں پنجابی زبان میں پھوکیں کہتے ہیں کی صورت میں موجود تھا۔ ان پھوکوں کو میں نے کم وبیش ہر چترالی گھر میں کھانے کے ساتھ کھاتے دیکھا۔ صافی میں لپٹی ہوئی روٹیاں اور پلیٹ میں دہی تھا۔ دہی بنانے کا طریقہ بھی بڑا مختلف ہے۔ گھر کی سوانی کچے دودھ کو کسی برتن میں ڈال کر گرمی والی جگہ پر رکھ دیتی ہے۔ جب وہ پھٹ جائے تب اُسے دہی بن گیا ہے خیال کیا جاتا ہے۔ سالن اپنی کالی رنگت کے باوجود نہایت لذیذ تھا۔ دہی مزیدار تھا۔ روٹی میں خستگی اور مٹھاس تھی۔ اور پھوکوں کو سلاد کے طور پر کھانا ایک نیا تجربہ تھا۔ نئے اور پرانے تجربوں سے لُطف اندوز ہوئی۔

''چائے'' سردار زمان نے پوچھا۔

''چائے میں آپکے اہل خانہ کے ساتھ آپکے کچے گھر میں بیٹھ کر پیوں گی۔'' میں نے ظہر کی نماز کے لئے اُٹھتے ہوئے کہا۔

اور جب مجھ سے پوچھا جا رہا تھا کہ جائے نماز اندر مہمان خانے میں بچھا دیا جائے یا

باہر بھوری آنکھوں والے سردار زمان کے دس سالہ بیٹے نے اپنی بانہوں کے ہالے میں باپ کی گردن نیچی کرتے ہوئے اُسکے کانوں میں سرگوشی کی۔

باپ نے ہنستے ہوئے اچھا اچھا کہا اور گردن اسکی گرفت سے آزاد کی۔ میری مسکراتی ہوئی آنکھوں میں تجسس سا محسوس کرتے ہوئے وہ بولے۔

''سری لنکا کا سکور بتا رہا تھا۔''

میرے اللہ میں ہنسی اس دُور افتادہ جگہ جہاں ابھی ٹی وی اور ڈش نہیں پہنچا چھوٹے بچے بھی کس قدر کرکٹ کریز کے مارے ہوئے ہیں۔

کمرے کے عین وسط میں جلتی آگ اسوقت بُجھی ہوئی تھی پر کھانا چونکہ یہیں پکتا تھا اس لئے گرمی تھی۔ ملگجے سے نمدے پر بیٹھتے ہوئے میں نے چائے کا پیالہ ہاتھوں میں تھاما۔ اوپر تلے کے بچوں والی نوعمر ماں کے طور طریقوں اور رکھ رکھاؤ میں بالعموم جو طریقہ سلیقہ ہوتا ہے وہی یہاں کار فرما تھا۔ گندے برتنوں کا ڈھیر، رضائیوں اور کپڑوں کا کھلارا۔ یہ خاتون خانہ کی راجدھانی تھی۔ زمان صاحب کا ذاتی کمرہ میں مہمان خانہ کے ساتھ دیکھ آئی تھی۔ سیلف میڈ پڑھے لکھے کوہستانی مرد نے اسکی تزئین اچھے انداز میں کی ہوئی تھی۔

''زمان میں خود بڑی بدسلیقہ اور پھوہڑ عورت ہوں۔ شرمندگی والی کوئی بات نہیں چھوٹے بچوں کے ساتھ سب چلتا ہے۔'' میں نے اُٹھتے ہوئے کہا۔

سردار زمان کی اس خواہش کے اظہار پر کہ آپ تھوڑی سی خوبانیاں اپنے ساتھ لے جائیں میرے اندر کی لالچی اور کفایت شعار عورت جیسے یکدم کھل سی اُٹھی۔ چند خوبانیاں اور ایک کپ چائے۔ ناشتے کا جھنجھٹ سرے سے ختم۔ ریسٹ ہاؤس میں فرج موجود ہے آسانی سے چند دن نکل سکتے ہیں بلکہ رات کا کھانا بھی گول کیا جا سکتا ہے۔

پر اس کڑوی سوچ نے ساری بچتوں کے راستوں پر بند لگا دیئے کہ بوجھ اٹھانے سے پاؤں رپٹ سکتا ہے۔ لینے کے دینے پڑ سکتے ہیں۔ ریسٹ ہاؤس کے ملازم وہ خواہ میدانی علاقے

کے ہوں یا پہاڑی ماشاء اللہ کم وبیش ایک نمبر کے چٹورے اور ہیرا پھیری میں ماہر ہوتے ہیں۔ فرج میں رکھے مکھن انڈے ڈبل روٹیوں اور دیگر اشیاء پر دل کھول کر ہاتھ کی صفائی دکھاتے ہیں۔ پروین عاطف کی بچتوں کی جیسے فیتی فیتی ہوئی تھی اُنکی تو میں عینی شاہد تھی۔ میری یہ بیچاری خوبانیاں تو اُنکے دو پھکوں کی مار تھیں۔

''زمان صاحب رہنے دیں۔ میں نے پبلک ٹرانسپورٹ میں سفر کرنا ہے۔ ابھی ریشن جانا ہے۔ رات وہاں رہنا ہے۔ یہ پیکٹ تنگ کرے گا۔''

پرگتے کے ڈبے میں توت کے پتوں پر خوش نظر اور خوش ذائقہ خوبانیوں کو سردار زماں یوں سجا رہے تھے جیسے کوئی ماہر بیوٹیشن دُلہن کو سجاتی سنوارتی ہے۔ میرے لئے اُن پہاڑوں میں ان اونچی نیچی پگڈنڈیوں پر اپنے من سے بھی زیادہ وزن کے وجود کو سبک رفتاری سے اٹھائے اٹھائے پھرنا ہی خاصا کٹھن کام تھا اب اس پیکٹ کو بھی تھامنا۔ میرا انکار اور انکا اصرار۔ مجھے خاموش ہونا پڑا۔

سوزوکی جیپ کا پتہ کرنے جولڑ کے گاؤں گئے تھے۔ انہوں نے آ کر خبر دی کہ اسوقت ایک بھی گاڑی موجود نہیں۔

''آپ موٹر بائیک پر بیٹھ جائیں گی؟'' زمان نے تذبذب سے پوچھا۔

''ارے موٹر بائیک چھوڑ ریڑھی میڑھی گھوڑا گدھا خچر سائیکل سبھوں پر بیٹھ سکتی ہوں۔ جو چیز آسانی سے دستیاب ہو جائے ٹھیک ہے۔''

مجھے وداع کرنے وادی کے بہت سے لوگ آ گئے تھے۔ تین بج رہے تھے۔ لان میں زمان کے بیوی بچے اُسکی بہنیں بھاوجیں چچیاں تائیاں سب موجود تھیں۔ میں اُنکی محبتیں سمیٹ رہی تھی۔

''آپ آج رات ٹھہرتیں'' زمان نے کہا۔

''دراصل ریشن بہت بڑی وادی ہے اسکے سیر سپاٹے میں وقت لگنا ہے۔''

ریشن میں پہلے تو خجل خواری ہوئی۔ مطلوبہ گھر جانے کہاں گم ہو گیا۔ بیچارے لڑکے کی سڑک پر چک پھیریاں شرمندہ کیے جاتی تھیں۔ بارے خدا مشکل حل ہوئی۔ اندر گئی اور دو مسرتوں سے بیک وقت گلے ملی۔ گھر والی کا والہانہ انداز استقبال گھر کی دیواروں پر انگور کی بیلوں اور اُن میں لگے بے حساب پھل کا پھیلاؤ۔ ''پروردگار'' میں نے بچوں جیسی حیرت و مسرت سے اسے دیکھا۔ گھر کے آنگن میں بچھے جہازی تخت پر بیٹھتے ہوئے میں نے خاتون خانہ سے سیار بابا کی محبوبہ کا پوچھا۔ انہیں تو کچھ نہیں پتہ تھا۔ انکی پڑھی لکھی بہو اور وادی کے تعلیم یافتہ چند لوگ جوان کے بلانے پر آئے تھے سبھی لاعلم تھے۔ بس تو میں نے جانا کہ یہ سب تو حال میں زندہ ہیں اور ماضی سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔ یارمن ہمیں کا گھر زمانے کی دست وبُرد کی نذر ہوا اور کسی کو اسکا پتہ نہیں۔ چلو چھوڑو۔ ریشن کی سیر کر لیتے ہیں۔

''ریشن بہت بڑی اور خوبصورت وادی ہے۔'' چیئر مین صوبیدار افسر علی شاہ نے مجھے اپنی گاڑی میں بٹھاتے ہوئے کہا۔

ریشن گول میں جرمنی کے تعاون سے بننے والا پاور ہاؤس تو بس میں نے باہر سے ہی دیکھا۔ راغین میں ہائی سکول پولو گراؤنڈ اور اسپتال کا دیدار کیا۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت اور اسکے باغ کی سیر کی۔ ڈیڑھ دو گھنٹے میں پوری وادی گھوم چکنے کے بعد میں نے سوچا تھا اب رات یہاں کس لیے ٹھہروں۔

جب گھر آئی خاتون خانہ چولہے کے پاس تھیں۔ مجھے انہوں نے اپنے پاس بچھے نمدے پر بٹھایا موٹی سی روٹی توے پر پکتی تھی۔ پھر اس روٹی کی سینکائی چولہے کی ایک دیوار کے ساتھ کھڑی کر کے کوئلوں پر کی گئی۔ راکھ کو پھونکوں کے ساتھ جھاڑا گیا۔ مقامی ساختہ ڈولی سے تازہ مکھن کے پیالے سے اس پر ایک پیڑا رکھا گیا۔ میرے بچپن کا ایک جانا پہچانا منظر میری ماں اور دادی مکئی کی روٹیاں اسی انداز میں سینکتی تھیں۔

چائے کے گھونٹ کے ساتھ میں نے نوالہ مکھن میں لتھیڑ کر منہ میں رکھا تو جس ذائقے

سے آشنا ہوئی اُس نے بہت سی یادوں کو آنکھوں کے سامنے لا کھڑا کیا۔ دوسرا نوالہ اور چائے کا دوسرا گھونٹ ابھی بھرا ہی تھا جب خاتون خانہ کے بڑے بیٹے نے باہر سے آ کر کہا۔ A.K.R.S.P کی ایک گاڑی ہم نے روکی ہے جو چترال جا رہی ہے۔ جلدی کیجئے۔ تیسرا نوالہ منہ میں ڈالا اور چوتھا ہاتھ میں پکڑ کر باہر کی طرف دُھڑ کی لگائی۔

وہ مکھن گرم روٹی کے وہ نوالے خاتون خانہ کا مجھے روک کر ماتھا چومنا اور انکی بہو فاطمہ کا میرے ہاتھوں پر ٹاپس رکھنا جیسی یادوں کے ساتھ ساتھ ایک کاش بھی ہے۔ کاش میں اُس مکھن کے ساتھ وہ پوری روٹی کھا سکتی۔

باب نمبر۔ ۷

وادی شغور۔ محل
اور راجہ فیملی

صُبح کے کوئی ڈیڑھ دو گھنٹے تو اسی تگ و تاز میں گزر گئے کہ کہیں سے کوئی مُفتا ہاتھ لگ جائے۔ چُیو پُل کے پاس ایئر پورٹ روڈ پر پہاڑوں کی قدرتی کھوہ میں کھڑے ہو کر بہتیری گاڑیوں کو ہاتھ دیئے پر جب بات نہ بنی تو خود سے کہا۔ میاں اڈے پر چلو۔

گرم چشمے کے لئے جو گاڑی تیار تھی۔ اُسکی فرنٹ سیٹ پر مقامی عورتیں قابض تھیں پیچھے کی کھلی ہواؤں اور کھلی فضاؤں میں ڈرائیور نے کمال مہربانی کرتے ہوئے مجھے ایک گوشے میں تھوڑی سی جگہ دیتے ہوئے ایک چھوٹے سے بچے کو میرے ساتھ جوڑ دیا۔ چلو شکر ہے میں نے چادر سے چہرے کو ذرا ننگا کرتے ہوئے اپنے ہمراہیوں کو کھلے ڈھلے انداز میں دیکھا۔ پہلا تصادم تو ان دو سکھ لڑکوں سے ہوا جنہوں نے آنکھیں چار ہوتے ہی مجھے ''ماں جی نمستے'' کہہ کر عظمت و تقدس کے منبر پر بٹھا دیا۔ میں نے بھی اس منبر پر آرام سے بیٹھتے ہوئے اُنکی یہاں موجودگی اور دیگر تفصیلات جاننی چاہیں۔ افغانستان میں اُنکا کاروبار تھا۔ (یہ ۱۹۹۷ء کی بات ہے افغانستان ابھی بیچارہ نہیں بنا تھا) وریام سنگھ اور بسنت سنگھ نام تھے۔ شملے سے تعلق تھا بس گھومنے پھرنے چترال نکل آئے تھے۔ گاڑی میں بیٹھے بقیہ لوگ سیدھے سادھے مقامی تھے سوائے اُس نوجوان کے جو تعلیم یافتہ نظر آتا تھا اور میرے لئے مفید ثابت ہو سکتا تھا پر وہ ابھی اپنی تعلیم کے گھمنڈ اور ذرا لفٹ دیئے کے چکر میں نظر آتا تھا۔ میں نے بھی اسکی کلف ولف اترنے کا سوچتے ہوئے انتظار کو

ترجیح دی۔

میرا پہلا پڑاؤ وادی شغور تھا جہاں مجھے کرنل راجہ مطاع الملک سے ملنا تھا۔

سکھ لڑکوں کی انگریزی خاصی رواں تھی ۔ کاروباری سلسلے میں وسط ایشیا کی ریاستوں میں آنا جانا رہتا تھا۔ نوعمری کے باوجود گفتگو میں زمانہ شناسی کی جھلک تھی۔ مشاہدے کے تجربے کا عکس تھا۔ یقیناً یہی وجہ تھی کراچی یونیورسٹی کا بی۔ اے پاس سلطان محمود بہت جلد گفتگو میں شامل ہو گیا۔

وادی شغور تک موغ مردان پرابیگ اور دوآلہ بیس بیس پچیس پچیس دیہاتوں پر مشتمل وادیاں ہیں۔ اس راستے میں تین مقام ایسے تھے کہ جو ابھی بھی حافظے میں محفوظ ہیں۔ سنگ مرمر کے پہاڑوں سے پتھر نکالا جارہا تھا۔ تازہ نکلا ہوا پتھر دھوپ کی شعاعوں میں نہاتا بصارت کو قوس قزح کے رنگوں سے شاد کرنے لگا۔ ذرا آگے پہاڑوں کا ایک چھوٹا سا سلسلہ اس درجہ پُر ہیبت اور ڈراؤنا تھا کہ پل بھر کے لئے میں نے خوف سے آنکھیں بند کرلیں۔ پھر گاڑی ایک جگہ خراب ہوگئی۔ ان راستوں میں گاڑی کا خراب ہونا ایک یقینی امر ہے۔ سواریاں اُتر گئیں۔ میرے لئے ادھر ادھر تا کا جھانکی کے لئے موقع غنیمت تھا۔ یہاں وہاں بکھرے ہوئے قدرت کے جلال کے نمائندہ مظاہر کی ثناء آنکھیں اور زبان بیک وقت کررہے تھے۔ تنگ راستے سے ذرا آگے یکدم کشادگی کا احساس ہوا۔ سڑک سے اوپر قدرے بلندی پر پہاڑوں سے گھرا ہوا ایک کشادہ پتھریلا قطعہ تھا جہاں نالے کا پانی بہہ بہہ کر نیچے سڑک کو بھگوتا دریائے گرم چشمے میں گر رہا تھا۔ میں اوپر چڑھی بھاگتی ہوئی آگے تک گئی۔ پیاس کا احساس ہو رہا تھا۔ میٹھا ٹھنڈا شفاف پانی مزے مزے سے پیتے ہوئے خاصی دیر بعد جب میں نے رُخ پھیرا میرے پورے وجود نے دہشت کا ایک خوفناک جھٹکا کھایا تھا کہ میری پھٹی پھٹی آنکھیں اپنے چاروں طرف بلند و بالا پہاڑوں کو دیکھ رہی تھیں۔ وہ سڑک جسے میں نے آگے تک جاتے ہوئے دیکھا تھا جانے کہاں تھی۔ گم سم حواس باختہ بولائی سی میں ادھر ادھر دیکھ رہی تھی مجھے اپنے حصار میں لئے یہ کیسا طلسم کدہ

تھا کہ جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ مجھے نظر نہیں آ رہا تھا۔

شفاف نیلا آسمان اور اپنی پوری آب و تاب سے چمکتا سورج بھی میرے دل کی دھڑکن کو قابو کرنے میں ناکام ہو رہا تھا۔ پھر جیسے دریائے گرم چشمے کے شور مچاتے پانی نے مجھے ذراسی ڈھارس دی میں نیچے بھاگی مجھے نشیب میں سڑک نظر آئی۔ سڑک پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی راستے کے شگاف دکھائی دیئے۔ سانس ابھی بے قابو تھا۔ پچھلی سمت بھاگی تو دور گاڑی اور لوگوں کو دیکھ کر سانس اور اعتماد دونوں بحال ہوئے۔

شعور اُتری تو ماں جی کے دونوں سکھ بیٹوں نے بہت عقیدت و محبت سے اُسے پرنام کیا۔

انہیں دعائیں دیتے ہوئے میں نے اپنا گرم چشمہ جانے کا پروگرام اور سلطان محمود کی رہنمائی کی ضرورت دونوں باتیں اسکے گوش گزار کرتے ہوئے اسکی مدد چاہی۔

''حاضر سائیں'' اسنے سینے پر ہاتھ رکھا کل گیارہ بجے خاکسار گرم چشمہ روڈ پر آپکا انتظار کرے گا۔ گاڑی میری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی پر میں ہنوز سڑک پر کھڑی تھی۔ میرے سامنے خاصی بلندی پر جھروکوں اور بالکونیوں والی ایک ایسی عمارت تھی جسکی پور پور سے کہنہ سالی ٹپک رہی تھی جو جانے کتنے سرد و گرم موسموں کے اُتار چڑھاؤ کی چشیدہ تھی۔

مغل طرز تعمیر کی نمائندہ جس پر ایرانی اور کشمیری ثقافت کے رنگ غالب تھے۔

دریائے گرم چشمے کا پاٹ یہاں چوڑا تھا۔ پار جانے کے لئے پل نیا تھا مجھے پار نہیں جانا تھا پر پھر بھی میں کچھ دیر پل پر کھڑی ماحول کی رعنائی فضا کی تنہائی سے اور چند لمحوں کے لئے ہاتھ آئی آزادی اور سرشاری سے لطف اندوز ہوتی رہی۔

پھر مجھے دو لڑکے نظر آئے جو اوپر سے نیچے اُتر رہے تھے۔ قریب آنے پر تعارف ہوا یہ دونوں سنگین علی شاہ اور تکبیر خان تھے کراچی میں رہنے کی وجہ سے سُتھری اُردو بول رہے تھے۔ اب وہ بضد کہ۔۔ میری رہنمائی تو اسی صورت میں ہوگی جب پہلے میں انکے گھر جاؤں۔ ''چلو بابا''

اصرار اتنا شدید تھا کہ جھکنا پڑا۔ اونچے چوبی دروازے اور فصیلوں والے محل کے ہمسائے میں یہ غریبانہ گھر معاشرے کے طبقاتی نظام کا منہ بولتا ثبوت تھا۔ پر گھر والیاں دل کی اتنی تونگر کہ جنہیں یہ سمجھ نہیں آتی تھی کہ وہ مجھے کیا کھلائیں کیا پلائیں کہاں اٹھائیں کہاں بٹھائیں۔

محل تک جانے کے لیے خاصی اونچی چڑھائی ہے۔ اس چڑھائی کے کناروں پر دورویہ درختوں کی چھدری چھاؤں میں نہاتے ہوئے وسیع وعریض قطعے میں نیلے فیروزی رنگے اُس چوبی دروازے کے سامنے آ کھڑی ہوئی جسکی قامت کو دیکھنے کے لئے مجھے اپنی گردن کو خم دینا پڑا تھا۔ کھڑکی نما دروازے سے اندر داخل ہوئے۔ دائیں بائیں نیلے ستونوں کے ساتھ زمینی فرش سے دوفٹ اونچے چوکے بنے ہوئے تھے۔ آگے باغ تھا۔ جاپانی پھل کا بڑا سا درخت کچے پھل کے ساتھ اور ناشپاتی کا درخت پکے پھل سے لدا پھندا کھڑا تھا۔ کاسنی گلابی نارنجی پھولوں سے بھری چھوٹی چھوٹی جھاڑیاں منظر کے حسن میں اضافے کا باعث تھیں۔

داہنے ہاتھ نیلا پینٹ شدہ چوبی محل کھڑا تھا جسکے ستون مارخور اور آ ئیبکس کے سینگوں سے سجے تھے۔ راہداریوں سے گزرتے ہوئے لڑکے مجھے چھوٹے سے نیلے دروازے سے تنگ و تاریک سیڑھیاں چڑھا کر اوپر لے آئے۔ یہ ہال کمرہ تھا۔ میں نے لمبی سانس بھری صوفے اگر ٹوٹے پھوٹے تھے تو کشمیری آرٹ کی چوب کاری سے مزین میزیں اور تپائیاں گرد سے اٹی پڑی تھیں۔ مضبوط لیکن بھدی دیواروں پر پُرانے فریموں میں سجی تصویریں قریب سے دیکھے جانے پر اپنے نادر ہونے کا پتہ دیتی تھیں کہ گزری ہوئی عہد ساز ہستیاں ان میں زندہ تھیں۔ لارڈ ولنگڈن، نظام حیدر آباد دکن، چیف کمشنر دہلی انکی بیگم ڈاکٹر اجیت کر، وائسرائے کونسل کے ممبران، صاحبزادہ عبدالقیوم۔

میں نے دیکھا تھا نگین علی کی لمبی سفید انگشت شہادت ایک تصویر پر آئی۔ اسکی آنکھوں سے روشنی کی جو جوت نکل کر مجھ تک پہنچی تھی وہ محبت اور احترام کی پھوار میں بھیگی ہوئی تھی۔ اس نے جب یہ کہا تھا ''ہمارا شہزادہ'' تو لہجے میں گھلی پیار کی مٹھاس نے بے اختیار مجھے اُس تصویر کو

دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا جسے وہ اُنگلی کی پور سے دبائے کھڑا تھا۔ یہ ۱۹۴۰ میں پونا میں فوجی وردی میں ملبوس وجیہہ نوجوان مطاع الملک تھے۔ راجگی نظام سے نوجوان نسل کی بیزاری کا شمالی علاقوں میں گھومتے پھرتے مجھے عام مشاہدہ ہوا ہے۔ مگر ''ہمارا شہزادہ'' جیسے الفاظ شہزادے کی عوام دوستی کا کچھ لمبی چوڑی تفصیل بتائے بغیر کھلا اظہار تھا۔

دیواریں نایاب خاندانی تصاویر سے سجی ہوئی تھیں۔ نیچی چھت والی اس بالکونی میں قیمتی قالین اور صوفے سب ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار تھے۔ ان کھڑکیوں سے پوری وادی شغور نظر آتی تھی۔ ساتھ ہی وہ جھروکہ تھا جہاں راجہ یا مہتر (بادشاہ) کھڑے ہو کر رعایا کو دیدار کرواتا تھا۔

ملحقہ بیڈروم تھے۔ نادر قسم کے بیڈ جنکے سرہانے اور پائینتیاں منوں وزنی پیتل سے بنی تھیں۔ ہاتھی دانت کی انٹیک میزیں۔ ریڈنگ روم جن کی الماریاں ریڈرز ڈائجسٹ، اُردو ڈائجسٹ لائف مسلم Horticulture سے بھری پڑی تھیں۔ میں نے اندرونی بالکونیوں کے گرد آلود چوبی فرش پر چلتے چلتے رک کر اس سارے منظر پر ایک حسرت زدہ نظر ڈالتے ہوئے خود سے کہا۔

اس میں کوئی شک نہیں وقت مٹھی میں پکڑی ریت کی طرح ان کے ہاتھوں سے سرک گیا ہے۔ اقتدار نے نئے پیرہن پہن لئے ہیں۔ انکا شاندار کل اور اُس کل میں بسر شدہ زندگی اسکے ہنگامے اور جھمیلے سب قصہ پارینہ ہو چکے ہیں۔

پر کیا یہ لوگ یاسیت کا شکار ہیں۔ وقت کے اس تغیر کا خوش دلی سے سامنا کرنے سے گریزاں ہیں۔ پڑھے لکھے ہونے کے باوجود نہیں جانتے ہیں کہ انکا ماضی اُنکا یہ ماحول اور اس سے متعلقہ سب چیزیں تاریخی ورثہ بن گئی ہیں۔ انکی حفاظت اور دیکھ بھال جتنی اہم اور ضروری کل تھی اتنی ہی آج بھی ہے۔

اندھیری اور شکستہ سیڑھیوں سے آہستہ آہستہ اُتری۔ سنگین اور تکبیر نے لان میں

کھڑے ہو کر مجھے زنان خانے کا دروازہ دکھاتے ہوئے اجازت چاہی کہ اس سے آگے جانے کا انہیں اختیار نہیں تھا۔

بڑے دروازے سے اندر داخل ہوئی۔ یہاں ایک اور ٹوٹی پھوٹی ویران دنیا منتظر تھی۔ پتھروں کی کوٹھڑیاں جن میں جھانکی تو گودام لگے۔ لکڑی کے تراز و پتھروں کے باٹ۔۔۔۔

میرے سامنے تقریباً دس فٹ اونچی پتھروں کی دیوار میں ایک دروازہ تھا۔ اندر جھانکی اور پھر داخل ہوئی۔ تنگ و تاریک ستونوں والا کمرہ جسکے دروازے نیلے تھے اور کونے میں دو اٹیچی کیس پڑے تھے۔ اگلا کمرہ اس سے بھی تاریک تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ دہل کر باہر بھاگی۔ باہر کیا تھا؟ نہ کوئی آدم نہ آدم زاد۔ خدایا یہاں انسان رہتے ہیں۔ پہاڑ جیسا جگرا کیا اور پھر اس غار میں داخل ہوئی۔ دونوں کمروں کا پُل صراط جیسے تیسے پار کیا۔ ''میرے خدایا'' آگے پھر ایک لمبا اور تاریک کمرہ تھا۔ یقیناً مجھے اسوقت لوئیس کیرول کی ایلس یاد آئی تھی۔ بلاشبہ میں ایلس نہیں تھی پر بخدا میری کیفیت ایلس سے کم نہیں تھی۔ جو آنکھیں بند کئے تجس اور شوق کے ہاتھوں سیاحت کے خرگوش کے تعاقب میں اندھیروں کی ان سرنگوں میں گر پڑی تھی۔ ساری ہمت حوصلہ اور دلیری اُڑنچھو ہونے لگی۔ پھر جیسے اندھیرے کے اس غار میں مجھے آخری سرے سے روشنی کی ایک کرن سی دکھائی دی میں دیوانہ وار اسکی طرف بھاگی۔

میرے سامنے ایک دل کشا منظر تھا۔ رنگا رنگ خوشنما پھولوں کی رعنائی مخملین گھاس سے سجے لان کی دلربائی اور قدیم و جدید عمارتوں کی زیبائی۔ داہنے ہاتھ چترالی کمرے اور برآمدے تھے۔ برآمدے چترالی تخت قالین اور گاؤ تکیوں سے آراستہ تھے۔ سامنے شیشے کی کھڑکیوں اور جالیدار دروازوں والی جدید عمارت تھی جس کے برآمدے مارخور کے سینگوں اور پھولوں سے سجے تھے۔ جس کمرے کی دہلیز پر میں جا کر کھڑی ہوئی وہ چترالیوں کی زبان میں بائیٹس (نشست گاہ) کہلاتا ہے۔ باہر کی فضا پر جو سناٹا اور ویرانی میں نے دیکھی تھی۔ راہداریوں کے کمروں میں جو اندھیرا خوف اور دہشت میں نے محسوس کی تھی اسکے برعکس یہ کشادہ کمرہ زندگی کی

حرارت سے لبالب بھرا ہوا تھا۔ نوجوان خوبصورت اور نوخیز لڑکیاں ایک دائرے کی صورت میں ایک بوڑھے مرد کے ساتھ بیٹھی تھیں۔

کرنل مطاع الملک کی جوانی کی تصویروں سے میری اتنی شناسائی تھی کہ بڑھاپے میں اُنہیں لت پت دیکھ کر بھی میرے دل نے جیسے سرگوشی کی کہ یہی ہے وطلتستان کی جنگ آزادی کے لیے جوانمردی سے لڑنے والا مجاہد۔

دوپہر کے کھانے کے لئے دسترخوان بچھا ہوا تھا۔ خادمائیں کھانے کی سروس میں مصروف تھیں تعارف کا مرحلہ بہت مختصر تھا۔ مجھے خوشی ہوئی وہ مجھے اردو ڈائجسٹ کے حوالے سے جانتے تھے۔

''آیئے پہلے کھانا'' معزز میزبان سراپہ شفقت تھے۔ میں نے بھی بسم اللہ کہتے ہوئے ہاتھ دھوئے اور پلیٹ میں اُبلے چاولوں ڈال لیے چاولوں کو پُرانے دیسی گھی کا مس لگا ہوا تھا۔ ہم ڈالڈا اور برائلر مرغیوں کے پروردہ دیسی گھی اور کھال والی دیسی مرغی کی لذتوں سے نا آشنا۔ کہیں بچپن میں جب زمانہ خالص تھا ان سے تھوڑی بہت شناسائی ہوئی ہوگی پر بچپنے کی شناسائیاں کم ہی یاد رہتی ہیں۔ اور بڑے لوگوں کی حکیمانہ باتوں کہ کھال میں غذائیت ہوتی ہے کی کون پرواہ کرتا ہے کہ بچے بالے بوڑھے جوان سب چسکوں اور صواد کے پیچھے پاگل ہو رہے ہیں۔

کٹور خاندان کے اس شاہزادے نے جونہی اپنی خاندانی اور ذاتی کتاب کو کھولا میں شوق سے اُسے پڑھنے میں مصروف ہوگئی۔

چترال کی تاریخ میں انکے والد ہزہائی نس سر شجاع الملک اور ان کے بھائی سر ناصر الملک رفاہ عامہ کے کاموں سے اپنی لگن۔ ریاست کے بے کس نادار اور فقیر حال لوگوں کے لئے خذرراہ۔ تعلیم یافتہ مدبر سیاستدان۔ بہترین منتظم اور ایک کامیاب ڈپلومیٹ کے طور پر زندہ ہیں۔ ناصر الملک تو بڑی ہی انقلابی شخصیت کے مالک تھے۔ اعلیٰ تعلیم یافتہ۔ اچھے شاعر اور شاہ

غریباں کے نام سے اپنے لوگوں میں مشہور تھے۔ ان کے عہد کا سب سے بڑا کارنامہ تعلیم اور تعلیمی اداروں کا پھیلاؤ تھا۔ چترال میں ہائی اسکول کا سنگ بنیاد رکھتے ہوئے انکے الفاظ تاریخ میں محفوظ ہیں۔

''یہ ادارہ ایک بم کی صورت ہے جو ایک دن پھٹ کر میرے محل کی دیواروں کو گرا کر اُن برائیوں کا خاتمہ کردے گا جو زمانوں سے ہمارے راجگی نظام کا حصہ ہیں۔''

دور افتادہ دشوار گزار راستوں والی یہ ریاست قیام پاکستان سے قبل اپنے حمیدہ اوصاف مہتروں کی وجہ سے انگلینڈ سے لے کر چین تک متعارف تھی۔

کرنل مطاع الملک نے ابتدائی تعلیم چترال پھر رائل انڈین ملٹری کالج ڈیرہ دون سے حاصل کی۔ ۱۹۳۷ء میں انڈین آرمی میں کمیشن حاصل کیا اور ۱۹۴۱ء میں سنگاپور میں بطور کیپٹن کام کیا دوسری جنگ عظیم میں ملائشیا کے مختلف محاذوں پر داد شجاعت دی۔ جاپان میں قیدی بھی رہے یہ اور بات تھی کہ رائل فیملی سے تعلق کا علم ہونے پر جاپانیوں نے اچھا سلوک کیا۔ مشرق بعید کے تقریباً سبھی ملکوں میں انہوں نے اپنے وقت کا تھوڑا تھوڑا حصہ گزارا۔ ۱۹۴۸ء میں بلتستان میں پندرہ ماہ تک بغیر کسی تنخواہ اور معاوضے کے اسکی جنگ آزادی لڑی۔

چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑ کر میں نے کمرے پر طائرانہ سی نگاہ ڈالی اس میں موجود قیمتی فانوس، قالین، دیواروں پر ٹنگی تصاویر، آتش دان اُن پر سجے نوادرات، سبز چوبی ڈیزائن دار ستون سب گو راجگی کروفر کو نمایاں کرتے تھے پر وہیں ان پر چھائی بوسیدگی اس نظام اور متعلقہ افراد کو روبہ زوال بھی ظاہر کر رہی تھی۔

خادمہ نے انکا خاندانی البم میرے ہاتھوں میں تھمایا۔ ان کے بچپن اور جوانی کے عکس کہیں ہائیکنگ کہیں رائیڈنگ کہیں پولو کھیلتے ہوئے۔ کہیں برجس پہنے شیروں کا شکار کرتے ہوئے کہیں ملائی بیوی کہیں چترالی بیوی کہیں چینی بیوی کے ساتھ۔ ماشاللہ اس میدان میں بھی جھنڈے گاڑے بیٹھے تھے۔ انکی بارعب شخصیت کے بے شمار پہلو اس طرحدار حسینہ کی طرح میرے

سامنے آرہے تھے جو رنگ رنگیلے جوڑوں، بالوں کے نت نئے سٹائل اور وجود کو مختلف انداز سے پیش کرتے ہر بار ایک نئی صورت کو جنم دیتی ہے۔

پھر جب اُنکی پیشکش پر محل کا بقیہ حصہ دیکھنے کے لئے انکی بہوؤں اوران کے ساتھ باہر آئی میں نے سہ پہر کو شکستہ دیوار پر عجیب یاسیت بھرے رنگ میں ڈھلتے ہوئے محسوس کیا تھا۔

اور جب پرانے محل کے مہمان خانے، خادموں کے کمرے، کٹنس (غلہ رکھنے کی جگہ) اور سٹور دیکھتے ہوئے راتھینی میں داخل ہوئی وہاں موجود بوڑھی خادماؤں میں ایک نوجوان لڑکی بھی تھی اُس کے بارے میں جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا وہ یقیناً میرے لئے حیرت واستعجاب کے ساتھ ساتھ دکھ کا عنصر لئے ہوئے بھی تھا۔ نوجوان لڑکی انکی بیوی تھی۔ کمال ضبط سے میں نے اپنے اوپر وارد ہونے والی اس حیرت اور دکھ کو قابو کیا۔ پر جانے میرے اندر ابال سا کیوں اُٹھنے لگا تھا پھر یہ ایک خوفناک سوال کی صورت سرگوشی کے انداز میں صاحب خانہ کی بڑی بہو کے کان میں الٹ گیا۔ ''عُمروں کے اس تفاوت میں ازدواجی حقوق کی ادائیگی کیسے ممکن ہے؟'' سعادت مند بہو نے مجھے قائل کرنے کی بہتیری کوشش کی مارے مروت کے میری زبان گو بند تھی۔ پر چہرہ مکمل حالت نفی میں تھا شاید اسی لیے مسز حیدر نے کہنا ضروری سمجھا ''یہاں کے صاحب ثروت لوگ کم عمر لڑکی سے شادی رواجاً بھی کرتے ہیں۔''

میں ہنسی ''چلیئے یہاں کا تو شاید کلچر ہو۔ پر ماشااللہ باقی جگہوں کے اُونچے اور دولت مند لوگوں کا بھی یہی وطیرہ ہے۔ دنیا کے ہر خطے کے مرد کی عورت کی نوخیزی کے معاملے میں ہمیشہ رال ٹپکتی ہے۔''

سامنے پتھروں سے بنا کشادہ سازینہ تھا جسکے نودس پوڈے چڑھ کر باغ دیکھنے جانا تھا۔ جب اوپر پہنچی تو بلا مبالغہ یہی کہہ سکتی ہوں کہ وہ باغ کیا تھا بہشت بریں کا ایک منا سا گوشہ تھا۔ سچی بات ہے میں دم سادھے ہوئے تھی۔ سامنے دور تک سبز مخملیں گھاس کا میدان جسکے عقب میں پہاڑ خاموش سنتریوں کی طرح گویا اس کی حفاظت پر مامور کھڑے تھے۔ دودھ کی نہریں رسیلے پھل اور

حوریں جنت کی یہ نشانیاں بچپن سے لے کر بڑھاپے تک کے سفر میں از بر ہو چکی تھیں۔ سیبوں کے بار سے ٹہنیاں جھکی پڑ رہی تھیں۔ زردے رنگی خوبانیاں سبز پتوں میں یوں چمک رہی تھیں جیسے درختوں کی شاخوں میں سجے پیلے برقی قمقمے۔ آلو بخارا منہ میں جانے کے لئے بے تاب۔ کہیں دور پہاڑوں کے سینے سے آتا آوریت نالہ جس کا جھاگ اڑاتا پانی دودھ کی نہر کی من و عن تصویر پیش کرتا تھا۔ تازہ دم گلاب کے پھولوں کی قطاریں جیسے میری آنکھوں میں ٹھنڈک بن کر اُترتی جا رہی تھیں۔

''گل قندان پھولوں سے بنتی ہے انکی منجھلی بہو نے میری توجہ پھولوں کی ایک اور لدی پھندی کیاری کی طرف منعطف کی۔ یہ Weeping willows ہیں اور یہ ______ Snow ball.''

پھلوں پھولوں اور درختوں کے یہ رنگ۔ اس پر اس گھر کی خوش لباس اور حسین عورتیں جو یقیناً حوروں سے کم نہیں تھیں۔ یہ منظر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھنے والا نہیں تھا پر میں کتنی دیر رُک کر اسے خود میں جذب کر سکتی تھی۔ وقت نے اپنے شکنجے میں کسی ظالم اور جابر شوہر کی طرح جکڑا ہوا تھا اور فرصت زندگی سے سکون کی طرح عنقا تھی۔ میرا رُکنا کس قدر دشوار تھا۔

چائے تو یونہی کمرے میں پی۔

جانے سلونی شام کے اس دلفریب ماحول میں چائے کا کپ ہاتھ میں تھام کر نگاہوں میں نظاروں کو سمو کر اسے گھونٹ گھونٹ پینا مجھے اتنی بڑی عیاشی نظر آئی کہ جسے پورا کرنے کی ہڑک نے مضطرب سا کر دیا۔ بھلا ہو وقار الملک کی دلہن کا کہ جس نے بات گویا ہونٹوں سے ہی اُچک لی۔

پُلدر کے درختوں تلے بیٹھی خوش گاؤ نے تیزی سے اُترتی شام کے قدموں کی آہٹوں کو سُنتے ہوئے آوازیں نکال کر اپنے مالک کو بلانا شروع کر دیا تھا۔ پرندوں کی ڈاریں آسمان کے سینے پر واپسی کے لئے محو پرواز ہو گئی تھیں۔ اور جب میں بوجھل دل کے ساتھ نیچے اُتر رہی تھی تو

ولیئیم ڈیوس کی Leisure حافظے کے کسی کونے کھدرے سے اپنے اوپر پڑا ملبہ ہٹاتی میرے ہونٹوں پر آ کر تھر کنے لگی تھی۔

No time to stand beneath the boughs
And stare as long as sheep or cows
No time to see when woods we pass
Streans full of stars, like skies at night
We have no time to stand and stare.

چیو پل پر اُتر کر میں نے دینین روڈ پر واقع تنور سے گرم روٹی خریدی کمرے میں آ کر نہائی۔ چائے اور مکھن کے ساتھ روٹی کھائی۔ جالی والے دروازوں کی کنڈیاں چڑھائیں۔ دینین کے اس چار کمروں والے ریسٹ ہاؤس میں اسوقت خدا میں اور چوکیدار تھے۔

نماز کے بعد بیڈ پر لیٹ کر میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ سچا مولا سائیں جسکی کرسی آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہتوں پر پھیلی ہوئی ہے۔ چوکیدار شریف النفس انسان ہے اور چترالی عزتوں کے رکھوالے صاحب ایمان لوگ ہیں۔

پھر بھلا مجھے گہری نیند کیوں نہ آتی۔

باب نمبر۔۸

گرم چشمہ۔ موٹروے لواری ٹنل
اور بدخشانی گھرانہ

اب ایسا تو ہونا ہی تھا۔ جب بندے کے مقدر میں صبح دیر تک سونے کی عیاشی نہ ہو۔ اسکی آنکھ اذان کی آواز کے ساتھ کسی میکانکی عمل کیطرح کھلنے کی عادی ہو۔ صبح کا غسل بھی خرافات میں شمار ہو۔ کپڑے لتے کا چناؤ انکی استری میچنگ جوتے اور کسی جیولری کے انتخاب کی دردسری کا کوئی چکر سرے سے ہی نہ ہو۔ ناشتہ بھی جو مل گیا غنیمت کے زمرے میں شمار ہو تو پھر وقت کی افراط تو ہوتی ہی ہے۔ اب گرم چشمے پر جانے کے لئے سویرے ہی نکل نہ کھڑی ہوتی تو اور کیا کرتی۔ گاڑی بھی ایسی ملی جس نے اگلے پچھلے سارے دھونے دھوڈالے۔ بگٹٹ بھاگتی گئی۔

گرم چشمہ چترال شہر کے شمال مغرب میں تقریباً ۲۷ میل کے فاصلے پر ہے۔ میں یہاں سلفر کے ان گرم چشموں کو دیکھنے آئی تھی جو جلدی بیماروں کی شفا کے لئے عالمگیر شہرت کے حامل ہیں۔ تحصیل لٹکوہ کی یہ مرکزی وادی ہے یہیں سے ایک راستہ افغانستان کے اہم شہر بدخشاں کو درہ دوراہ کے ذریعے جاتا ہے۔ سطح سمندر سے اسکی بلندی کوئی چھ ہزار فٹ ہے۔

اسوقت ابھی آٹھ بجے تھے جب اڈہ پیروں تلے آ گیا۔ اُس پیے بندے سے تو وقت ملاقات گیارہ بجے طے تھی۔ لہٰذا سوچا کہ اکیلے مٹرگشت کی جائے۔

گرم چشمہ بازار خاصا بڑا اور سج دھج والا تھا۔ پختہ سڑک پر دورویہ بڑے بڑے دروازوں والی دوکانوں پر دوکاندار مستعد بیٹھے تھے۔ صد شکر کہ چترالی سویرے جاگنے اور کام کرنے

کے عادی ہیں وگرنہ اگر لاہور شہر والا معاملہ ہوتا تو میں اسوقت اُلو بنی بند دوکانوں کو گھور رہی ہوتی۔ بازار میں کئی جگہ قیمتی پتھروں سے سجی دوکانیں نظر آئیں۔ افغانستان کے راستے زمینی رابطے کی وجہ سے یہ وادی قیمتی پتھروں کی مارکیٹ ہے۔ میرے قدم خود بخود ایک دوکان کی طرف اٹھنے لگے۔ پتھروں کی اس دنیا سے مجھے دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے سوچا تھا آخر حرج کیا ہے۔ وقت بھی ہے مواقع بھی ہیں تو کیوں نہ ان سے راہ ورسم بڑھائی جائے چار احباب کی محفل میں بیٹھ کر ان پر ہونے والی گفتگو میں چہرے پر ناواقفیت کی چھاپ کی نمائش کا اظہار کیا ضروری ہے۔ بندہ کچھ بول کر ثابت تو کرے کہ وہ خیر سے لوئر مڈل کلاسیا نہیں۔ ہیروں جواہرات سے اسکی خاندانی شناسائی ہے۔ اپنی طرف سے بہتیری تیزی دکھانی چاہی۔ پتھروں سے جان کاری کا تاثر دینا چاہا۔ اسکے اصلی مال کو نقلی ثابت کرنا چاہا۔ پر دوکاندار بھی بڑا کائیاں تھا۔ بھڑک اٹھا۔

''خوچہ بی بی تم کچھ نہیں خریدو گی تم کو کچھ نہیں مالوم۔''

اسکی دونوں باتیں سو فیصد درست تھیں۔ لہٰذا مزید طبع آزمائی فضول سمجھی۔ بازار میں ہوٹلوں کے اندر چار پائے والے بڑے بڑے تختوں پر لوگ بیٹھے ناشتہ کرتے تھے۔ ان میں افغانیوں کی اکثریت تھی۔ قہوے کی پھیلی خوشبو ایک پیالی کی ترغیب تو دیتی تھی پر اسے پیا کیسے جاتا روایتی کوہستانی مردوں کا ہجوم اس خواہش کی تکمیل میں مانع تھا۔

حبیب بینک۔ حبیب بینک کا انڈسٹریل سکول۔

بازار کی سیر مکمل ہوئی۔

دریائے گرم چشمہ درمیان میں بہتا ہے۔ ایک طرف بازار اور دوسری طرف وادی کے رہائشی گھر۔ نگاہوں کا افقی حدوں پر نیلے شفاف آسمان نیچے پہاڑوں پر اُگے سر سبز درختوں اور ڈھلانوں پر بنے ٹین کی چھتوں والے گھروں سے ٹکراؤ کے بعد انکا رخ دریائے گرم چشمہ کے جھاگ اڑاتے پانیوں سے ہوتا ہے۔ اس منظر میں بہت دلکشی ہے۔

گرم چشمہ کے لئے چلنا شروع کیا تو چلتی چلی گئی۔ اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے

راستوں کے بعد کھلے میدانوں کو پار کیا پھر کہیں جا کر اس کا دیدار ہوا۔ ایک بڑے سے کمرے میں چند باتھ روم بنائے ہوئے تھے۔ ان باتھ روموں میں چشموں سے پائپوں کے ذریعے پانی آتا تھا۔ غسل کرنے والے حضرات کو غسل کے بعد کمبل اوڑھایا جاتا۔

سیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچی۔ زوخ کی جھاڑیوں اور جنگلی گھاس سے اٹا پڑا اونچا نیچا بے ربط میدان جس میں تین چار گز لمبی سیمنٹ کی مستطیل کم گہری ہوزریاں بنی ہوئی تھیں اونچائی والی ہوزریوں سے پانی آنے کی مقدار خاصی تیز تھی جبکہ بقیہ میں پانی رس رس کر آ رہا تھا۔ پہلا دھچکہ تو اُس تصور کو لگا کہ جس نے ذہن میں اسکی صورت گری ایک آبشار کی شکل میں بنا رکھی تھی۔ اس پانی کا منبع تو ظاہر ہے پہاڑ ہی تھے۔ پر زمین میں یہ کہاں کہاں سے پھوٹ رہا تھا اسکا علم مجھے بسیار کوشش کے بھی نہ معلوم ہو سکا۔ ارد گرد کوئی نظر بھی نہ آیا کہ اسی سے کچھ پوچھتی۔

الحمد اللہ کہ مجھے کوئی جلدی بیماری نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ اکثر گٹے گوڈوں کلائیوں کے جوڑوں میں درد تو ہوتا رہتا ہے۔ لہٰذا ان ہوزریوں کے ساتھ ساتھ بنی سیمنٹ کی لمبی لمبی سلیبوں میں سے ایک پر بیٹھ کر ہاتھوں اور پاؤں کو ہوزری کے پانی میں ڈبو دینے اور انہیں گیلا کر کر کے چشمہ پر آ کر غسل صحت لینے والوں میں مجھے اپنے نام کا اندراج کروانا بے حد ضروری محسوس ہوا۔ اس بے حد اہم کام سے فارغ ہو کر میں نے پتھروں اور شہتیروں سے بنی دیوار کے قریب جا کر دوسری طرف جھانکا میرے سامنے ایک جذباتی اور رقت آمیز منظر تھا جو بڑھاپے کے باوجود زندگی سے حد درجہ پیار کا غماز تھا۔ پانی سے لبالب بھری ہوزری کے پاس قبلہ رو کھڑا ایک بوڑھا مرد کمر کے نچلے حصے پر چھوٹا سا کپڑا لپیٹے گڑوی سے اپنے جسم پر پانی ڈالتے ہوئے اپنے خدا سے ہم کلام تھا۔

''میرے مولا بہت دور سے آیا ہوں۔ بہت مصیبت اٹھا کر آیا ہوں۔ بہت تکلیف میں ہوں۔ تیرا نام لے کر پانی جسم پر ڈال رہا ہوں۔ مجھے شفا ہو شفا ہو شفا ہو۔''

گڑوی بھر کر تن پر انڈیلتا اور شفا شفا کا نعرہ لگاتا۔

گرم چشمہ اپنی اونی پٹی کے لئے بھی بہت مشہور ہے۔ بازار میں ایک دوکان میں لٹکے چوغوں نے جب مجھے متوجہ کیا اور میں نے اندر جا کر انہیں ہاتھوں سے چھو کر دیکھا۔ اُن پر کیا گیا اُون اور چرمہ کاری کا کام بہت چھب دے رہا تھا۔ کتنے کا ہے؟ یہ پوچھنے اور پھر قیمت کی زیادتی اور خاصا مہنگا جیسے میرے تبصرے پر دوکاندار نے کہا۔ یہ گھریلو کھڈیوں پر بنتا ہے۔ دقت طلب دھلائی کے بعد اس پر کڑھائی کی جاتی ہے۔ محنت اور وقت دونوں اس پر بہت خرچ ہوتے ہیں۔ قیمت تو ہونی ہی ہے۔

اب جب اس گندھک ملے صحت بخش پانی سے میں نے خود کو اور دوسروں کو غسل لیتے اور دیتے دیکھ لیا تو آگے بڑھی۔ یہاں پٹی کا پورا دھوبی گھاٹ نظر آیا۔ پانی کو سٹور کرنے کے لئے لمبی چوڑی ہوزریاں سیمنٹ کی سلیبیں اور دھلائی کے لئے بڑے بڑے پختہ فرش تھے۔

کہیں پٹی کو صابن لگ رہا تھا۔ کہیں اُسے پاؤں سے مسلا جا رہا تھا۔ کہیں سکھانے کا عمل جاری تھا۔

دھوپ کی تیزی نے محویت کو توڑ کر کچھ احساس دلایا۔ وقت جاننا چاہا۔ اپنی تو ساری زندگی گھڑی کے بغیر ہی گزری۔ صد شکر کہ وہاں موجود بہت سی کلائیاں اس زیور سے آراستہ تھیں۔ اب بھاگم دوڑ شروع ہوئی۔ مطلوبہ جگہ پہنچی حسب وعدہ سلطان محمود منتظر تھا۔

گرم چشمہ خاصی کشادہ اور ترقی یافتہ وادی ہے۔ ہیلتھ سنٹر، ہائی سکول، ٹیکنیکل سکولز، بینک، نجی سطح پر کوآپریٹو بینک۔

خدا جانے یہ سلفر ملے پانی سے پاؤں کو دھونے کی مسیحائی کا اعجاز تھا یا وادی کی زمین کے نیچے گندھک والی چٹانوں کی کوئی کرشمہ سازی تھی کہ پاؤں ٹوٹی پھوٹی اونچی نیچی چڑھائیوں اُترائیوں میں ڈاک کے تازہ دم گھوڑے کیطرح مستعد رہے۔ دریائے دُیرہ اور دریائے بگوشٹ کو ایک دوسرے سے ملتے دیکھا۔ چلتے چلتے ایک چھوٹے سے گھر کے کھلے دروازے سے بجلی کے کوندے کیطرح لپکتا ہوا ایک ایسا منظر سامنے آیا جس نے بڑھتے قدموں کو یوں روکا جیسے آگے

کوئی گہری خوفناک کھائی ہو۔

اندر جانے کی خواہش اتنی منہ زور اور شدید تھی کہ اُسنے قدموں کو ہچکچانے کا موقع ہی نہ دیا۔ کسی شتر بے مہار جانور کی طرح جو منہ اٹھائے بغیر سوچے سمجھے بھرے پُرے کسی کھیت کھلیان میں داخل ہو جاتا ہے میں نے بغیر کسی کی اجازت کے اپنے آپ اپنے اوپر آنگن کے پٹ کھول لیے تھے۔ لپا پتا صحن جس کے ایک کونے میں اُگے توت کے درخت تلے دس بارہ سال کا خوش شکل لڑکا بیٹھا تھا۔

راتھینی میں چولہا لپا پتا تھا۔ زمین سے دو فٹ اونچی دیوار میں بنی لکڑی کی پڑچھتیوں پر قطار در قطار سجے ایلومینیم اور سستے سلور کے برتن بتا رہے تھے کہ انہیں کس لگن اور پریت سے مانجھا گیا ہے۔ دیواریں کمرے میں کھانا پکنے کے باوجود بھی میلی نہ تھیں۔ چوبی کوٹھیاں چمک رہی تھیں۔ کمرے میں کوئی نہ تھا پر پھر بھی یہ بھرا بھرا پُر رونق لگ رہا تھا۔ چولہے سے ایک فٹ پرے لکڑی کے ڈنڈوں پر مثلث کی صورت میں ایک کھڈی بنی ہوئی تھی جس پر سیاہی مائل پٹی کا کپڑا بن رہا تھا۔ یہ کیسا کمرہ تھا جس پر چھائے ہوئے سلیقے صفائی نفاست چھوٹی چھوٹی چیزوں کے رکھ رکھاؤ نے غریبی کے احساس کو کہیں دور چھپا ڈالا تھا۔ کمرے میں ایک تنکے کی بھی بے ترتیبی نہیں تھی۔ میں کہ سدا کی پھوہڑ اُن ہاتھوں کی آشیرباد چاہتی تھی جنھوں نے اس چھوٹے سے کمرے کو جاذب نظر اور قابل دید بنایا ہوا تھا پر خاتون خانہ تو کسی بیمار کی عیادت کے لئے گئی ہوئی تھیں اور گھر میں موجود بارہ تیرہ سال کا خوشکل لڑکا ہی سوال جواب کے لئے میسر تھا۔ لہٰذا اسی نے بتایا تھا کہ گھر کا ہر فرد جب اور جس وقت وہ فارغ ہو کپڑا بنا تا ہے۔ چوبی شٹل کی ساخت عجیب سی تھی پر جب لڑکے نے اسے مہارت سے تانے بانے میں سے گزارا تو ماننا پڑا کہ انسانی ذہن اپنے ماحول کے مطابق اختراع اور ایجاد کرتا ہے تیار شدہ کپڑا لٹک کر نیچے ایک ڈھیر کی صورت پڑا تھا۔ یقیناً کمرے کی واحد یہ چیز ایسی تھی جسے کسی حد تک بے ترتیبی کے زمرے میں شمار کیا جا سکتا تھا۔

پھر سر راہ چلتے چلتے ایک اور منظر دیکھنے کو ملا۔ آفرین ہے تجھ پر اے عورت تو نے

کائنات کوحُسن اور رنگ وروپ ہی نہیں دیا دھرتی کے دکھوں کا بوجھ بھی اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا کر اسے ہلکا کرنے کی تگ ودو بھی کی۔

کیسا چاند چہرہ تھا۔ کبھی رخساروں پر گلاب کھلتے ہونگے یقیناً آنکھوں میں ستارے چمکتے تھے کہ انکی سحر زدہ سی چمک ابھی بھی موجود تھی۔ میں نے لاپروائی سے اوڑھی چادر کے نیچے سے اُن سنہری مینڈھیوں کو دیکھا تھا۔ کبھی ان پر سونے کا گمان ہوتا ہوگا۔ زمانے کے دکھوں اور غموں نے چہرے اور وجود پر اپنے نمایاں اثرات چھوڑے ہوئے تھے پر پھر بھی اس چہرے میں کیسی گھائل کر دینے والی دلفریبی تھی کہ بندہ چہرے پر سے آنکھیں ہٹانا نہیں چاہتا تھا۔ چھوٹے چھوٹے دو بچے پاس بیٹھے کھیل رہے تھے۔

کمرے میں گاڑے لمبے مستطیل اڈے پر سفید پٹی بن رہی تھی۔

بیٹا نیچے میدانوں میں محنت مزدوری کرتا تھا۔ بیوہ نند اور بہو دونوں کے ڈھیر سارے بچوں کے بوجھ کو اٹھائے وہ صبر وشکر کا پیالہ تھامے زندگی کی گاڑی کو دھکیل رہی تھی۔

اسوقت میرا سانس لوہار کی دھونکنی کیطرح چلتا تھا کہ خود کو مضبوط عورت ثابت کرنے کی کوشش میں بغیر رکے بغیر ستائے چڑھائیاں چڑھتی گئی اسوقت سلطان محمود کی عزیزہ کے گھر کے برآمدے میں قدم رکھنے کے ساتھ ہی مجھے محسوس ہوا تھا جیسے میرا دل پھٹ جائے گا۔ بوڑھے سینے کی ہڈیوں میں محفوظ دل آخر اتنا پریشر کیونکر برداشت کرے گا۔ اب اس عمر میں جوانوں جیسی مہم جوئی دل کے لئے سم قاتل ہی ہوسکتی ہے۔ پر میرا دل بھی بڑا مضبوط اور ڈھیٹ نکلا۔ پھڑ پھڑا کر بالآخر اعتدال پر آ گیا۔ کھال والی مرغی کے شوربے میں روٹی کا ٹکڑا بھگو کر اُسے منہ تک لے جاتے ہوئے میری آنکھوں نے کھڑکی سے دور نیچے کا منظر دیکھا جہاں دھوپ کی جوانی اور وادی پر پھیلے گھرے سبزے کی رعنائی چھیاں ڈال رہی تھیں۔

شام کی چائے میں نے جس گھر میں پی اُس کے آباؤ اجداد نے زمانوں پہلے بدخشاں سے ہجرت کی اور چترال میں آکر ڈیرے ڈالے۔ بڑا دریا دل اور شائستہ اطوار کا حامل گھرانہ تھا۔

کاروباری لوگ تھے۔ اردو سمجھنے کے ساتھ ساتھ کسی حد تک بول بھی لیتے تھے۔

حسن کے اعتبار سے رکھ رکھاؤ کے لحاظ سے ان میں انفرادیت تھی۔ ان کی نسل کے لوگوں کی اکثریت ششی کوہ میں آباد ہیں۔ کچھ چترال خاص میں اور کچھ دوسری وادیوں میں بکھرے ہوئے ہیں۔ ان بدخشی لوگوں کے درمیان بیٹھے ہوئے جانے مجھے بدخشاں کی ہڑک کیوں اٹھنے لگی تھی۔ اس تاریخی رومانیت والے شہر کے بارے میں کچھ جاننے کے لئے میں نے لب کھولے ہی تھے کہ مجھے محسوس ہوا جیسے میں نے انکی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔ معمر مرد نے کہا۔

''دراصل اسلام آباد کے حکمران ٹولے کو چترال کے مسائل سے کوئی دلچسپی نہیں لواری ٹنل ہمارے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔''

میں ہنس پڑی۔ ''بھئی چترال خصوصیت سے کیوں؟ حکمرانوں کو ملک سے ہی کوئی دلچسپی نہیں۔ ملک جائے بھاڑ میں اور لوگ جائیں جہنم میں بس انکے معاملات ٹھیک رہیں۔''

۱۹۹۰ء میں پاکستان کو سنٹرل ایشیا سے ملانے کے لئے براستہ گرم چشمہ تاجکستان تک سروے ہوا۔ اس مختصر ترین روٹ کے لئے چیوپل سے تاجکستان تک تین سو کلومیٹر لمبی سڑک کے لئے سروے پر ڈھائی کروڑ خرچ ہوا قدیم ترین راستہ بھی یہی تھا۔ چترالی اتنے سادہ اور معصوم لوگ کہ انہوں نے اپنے دروازوں پر معاشی انقلاب کی دستکیں سُننی شروع کر دیں۔ بڑے بڑے خواب بننے شروع کر دیئے لیکن ادھر گورنمنٹ ختم ادھر منصوبہ ختم۔

بے نظیر جب ۷ جولائی ۱۹۹۴ء میں شندھور آئیں تب انہوں نے اس روڈ کو بنانے کا اعلان کیا۔ مگر وائے حسرت کہ یہ اعلان اعلان ہی رہا۔ اسلام آباد پہنچ کر انہیں یاد بھی نہیں رہا ہوگا کہ وہ اہل چترال کو کیسے دل خوش کن خواب دکھا کر تالیاں بجوا کر آئی ہیں۔

سلطان محمود نے چائے کا مگ واپس پلیٹ میں رکھتے ہوئے کہا۔

''قدرت نے چترال کو قدرتی وسائل سے مالا مال کر رکھا ہے۔ کاش کوئی حکومت اس نہج پر کام کرے۔ بجلی کی فراہمی میں یہ علاقہ پورے ملک کو خود کفیل کر سکتا ہے۔ ایسے مقام جہاں

پانی کا بہاؤ بہت تیز اور فال ٹھیک ہے وہاں چھوٹے بجلی گھر بنا کر انہیں بڑے گرڈ اسٹیشنوں سے منسلک کیا جاسکتا ہے۔ حکومت بڑے سکیل پر یہ کام کرے تو اس سے ملک میں انقلاب لایا جاسکتا ہے۔ ایک چھوٹی سی مثال A.K.R.S.P والوں کی ہے جنہوں نے مختلف جگہوں پر چھوٹے چھوٹے پن بجلی گھر بنائے ہیں جنہیں مقامی آبادیاں خود opertae کرتی ہیں۔"

باہر رات تاریک تھی گھمبیر سناٹے کو چیرتی پہاڑی نالے کی آوازیں تھیں یا پھر وادی کے اس متوسط خاندان کی اُس لڑکی کی آواز تھی جو فیصل آباد زرعی یونیورسٹی میں ایم۔ ایس۔ سی کی سٹوڈنٹ تھی۔

کہیں اگر ایسا ہو ہمارے وزیراعظم اپنے لاؤلشکر کے ساتھ چترال آئے ہوئے ہوں اچانک موسم کی خرابی لواری ٹاپ کو بند کردے۔ فضائی سروس معطل ہوجائے اور وادی سے باہر نکلنے کے سارے راستے مسدود ہوجائیں۔ ایسے میں انہیں اپنے کسی بہت پیارے کی کوئی بُری خبر ملے۔ انکی آنکھیں آسمان کی سمت موسم کے جائزے کے لئے بار بار اُٹھیں تب یقیناً ہمارے اس لیڈر کو اُس آگ کی تپش کا اندازہ ہوگا جس میں ہم اسوقت جلتے ہیں۔ جب ہنگامی حالات میں ہمارے عزیز ہمارے پاس یا ہم اُنکے پاس پہنچ نہیں پاتے جب جنازے انتظار کرتے ہیں کہ کب پیارے آکر انہیں کندھا دیں اور لحد میں اُتاریں۔ جب جگر گوشے ہمارے سگے بیمار ہوں اور ہمیں بازار سے دوائیں نہ ملیں جب ڈاکٹر ہمیں اُنہیں پشاور لے جانے کا کہیں اور ہم لے جا نہ پائیں۔

یہ فیملی گزشتہ جنوری ایک بڑے المیے سے دوچار ہوئی تھی۔ خاص چترالی کمرے میں کھانا کھاتے ہوئے ساری فیملی کا دکھ آنکھوں کے راستے باہر آرہا تھا۔

پھر شاید ایسا ہو چترال سے اڑتے وقت وہ ہمیں یہ مژدہ سنا جائیں کہ اے اہل چترال تمہارے آلام ومصائب کے دن تمام ہوئے۔ تمہیں نوید ہو کہ میں تمہارے لئے لواری ٹنل بنا رہا ہوں۔

اس اتنی مغموم سی فضا میں اس معصومانہ انتقامی خواہش نے مجھے مسکرانے پر مجبور کر دیا

تھا۔

گھر کے بڑے بیٹے نے میری طرف دیکھا اور ہنس کر بولا۔

"کتنی احمق ہے یہ۔ ارے بھولی بادشاہ وہ تو چمکتے دمکتے رنگ برنگے حسن ونور سے بھرے پُرے دنوں میں بھی ہمارے پاس نہیں آتے۔ خراب موسموں میں بھلا کیوں آئیں گے۔ اور اگر کبھی بھولے بھٹکوں سے آ بھی جائیں تو طلسمی کھٹولا ڈول ڈالکر انہیں اور انکے موالیوں کو اڑا لے جائیگا۔ اور یہ دیکھتی رہ جائے گی۔"

میں اس دکھ اور کرب کا بخوبی اندازہ لگا سکتی تھی جو اسکے اندر سے گرم لاوے کی طرح نکل کر مجھے جلائے جا رہا تھا۔ لواری ٹنل وہ جلتا ہوا مسئلہ ہے جس سے آپ چترال میں داخل ہوتے ہی سامنا کرتے ہیں۔ آپکا ٹکراؤ کسی دوکاندار سے ہو۔ آپکی ملاقات کسی سرکاری ملازم سے ہو۔ ہوٹل کے کسی بیرے سکول یا کالج کے کسی طالب علم کسی دینی مدرسے کا کوئی استاد کوئی باریش بوڑھا بھیڑ بکریاں چرانے والا کوئی چرواہا کسی سے بھی انکے مسائل پر بات ہو۔ ہر تان لواری ٹنل پر آ کر ٹوٹتی ہے۔

چترال سنٹرل ایشیا کا گیٹ وے دفاعی اور سیاسی لحاظ سے پاکستان کا اہم ضلع جس کی سرحدیں افغانستان چین اور تاجکستان سے ملتی ہیں۔ چترالی محب وطن مخلص اور قناعت پسند قوم انکے لئے زندگی اور موت جیسے اہم مسئلے سے چشم پوشی کسی طور مستحسن نہیں۔

پنجاب کے مانچسٹر میں پڑھنے والی لڑکی اپنی تلخ نوائی کو شیرینی میں ملفوف کرتے ہوئے کہہ رہی تھی ہم لوگ موٹر وے کی تعمیر سے ناخوش نہیں خدا کرے ایسی بیسیوں موٹر ویز میرے ملک کے طول وعرض میں بنیں۔ دُکھ صرف اتنا ہے کہ حکمران ترجیحات کا تعین نہیں کرتے۔ موٹر وے کی کل لاگت کا صرف نصف لواری ٹنل کے لئے درکار تھا۔ مگر بات صرف یہ ہے کہ اگر عوام اور انکے گھمبیر مسائل اولیت پا جائیں تو خاص الخاص کیسے نوازے جائیں۔

اور پاکستان تو یہی بات ہے بنا ہی اشرافیہ کے لئے غریب تو جائیں جہنم میں۔

۱۹۷۳ میں فرنٹیر ورکس آرگنائزیشن نے دس ہزار فٹ بلند اس درے سے سرنگ نکالنے کا تخمینہ اور تفصیلی رپورٹ بھٹو حکومت کو دی۔ بلکہ کام کا آغاز بھی ہوا۔ پھر بند ہونے کی خبر تھی۔ دو تین باتیں گردش میں آئیں۔ سرنگ میں پانی نکل آیا۔ افادیت کے مقابلے میں اخراجات بہت زیادہ تھے۔ چند بیرونی مصلحتیں پیش نظر تھیں۔ جب چترالی دانشوروں نے اُن فنی ماہرین سے جو مسئلے کے تکنیکی پہلوؤں سے مکمل واقفیت رکھتے تھے بات کی تو انہوں نے کھرے لہجے میں کہا۔ ''انسان اپنے عزم اور آہنی ارادوں سے کائنات کو تسخیر کر رہا ہے اور یہاں باتیں ہوتی ہیں پانی نکلنے کی وسائل کی کمی کی۔ دراصل ہم چترالی غیر اہم ہیں۔ آخر چھ روپیہ موٹر وے جس کی اس مقروض ملک کو ابھی ضرورت نہیں تھی کے لئے وسائل فراہم ہو سکتے ہیں تو لواری ٹنل کے لئے کیوں نہیں جو ہماری زندگی اور موت کا مسئلہ ہے۔ ہمارے مرد افغانستان کے غیر قانونی دشوار گزار اور کسی حد تک غیر محفوظ راستے پر خواتین کے ساتھ سفر کرنا پسند نہیں کرتے۔ افغان ہمارے بھائی ہیں۔ ہمیں اُن سے اور اُنہیں ہم سے محبت ہے مگر اپنی زمین اور اُسکے راستے اپنے ہوتے ہیں۔ دوسرا ملک اور اُسکا راستہ انکا ہوتا ہے۔ انسان اس پر اس اعتماد سے قدم نہیں دھرتا۔ ایک خوف اور دھڑکا پاؤں میں لرزش پیدا کرتا رہتا ہے۔

ہماری تو اس تجویز پر بھی حکومتی اہلکاروں نے غور کرنے کی ضرورت محسوس نہیں کی کہ لواری ٹاپ کے راستے پر چند پوسٹیں بنائی جائیں جن میں اُن جدید مشینوں کو رکھا جائے جو برف باری کی صورت میں فی الفور راستے کو صاف کر کے اُسے آمد و رفت کے قابل بنا دے اگر انڈیا مقبوضہ کشمیر میں لواری ٹاپ سے کہیں زیادہ اونچی چوٹیوں پر ان مشینوں سے کام لے سکتا ہے تو ہم کیوں نہیں لے سکتے مگر یہاں پھر وہی بات آتی ہے کہ ہم غیر اہم ہیں۔''

کاش کوئی طلسمی چراغ میرے پاس ہوتا۔ کوئی ایسا سامان جس سے میں انکی اشک شوئی کر سکتی انکے دل کا درد دور کر سکتی۔ انہیں بتا سکتی کہ وہ غیر اہم نہیں بہت اہم ہیں۔ پر مجھ ننگی بچھی کے پاس کیا تھا صرف لفظ۔

باب نمبر۔ ۹

دروش۔ لاوی

اور غزالہ نگار اور ک زئی کا ننہال

''دو دن سے فلائٹ نہیں آئی۔ آج بھی آنے کا چانس ۱۰ فیصد ہے۔ لوگوں کی خجل خواری دیکھی نہیں جاتی۔ آپ آج آئی ہیں اور ایڈجسٹ ہونا چاہتی ہیں۔'' اس اتنے روکھے پھیکے اور قطعیت سے پُر جواب پر ردعمل کی صورت میں دو باتوں کا امکان تھا۔ غصے کا اظہار یا منت طرلہ۔ صورت حال پہلی بات کی قطعاً اجازت نہیں دیتی تھی لہذا دوسری پر عمل کیا اور نتیجہ کچھ حوصلہ افزا ہی رہا۔

''کہاں جانا ہے؟'' جگہیں تو کئی باتی تھیں۔ ''بھر موغلشٹ، دروش، شندھور جھیل'' پر مجھے گھر یاد آنے لگا تھا بچے یاد آنے لگے تھے۔ لیکن اب جان گئی تھی کہ واپس جانے کا اختیار میرے پاس نہیں تھا تو پھر جلنے کڑھنے سے فائدہ۔ وقت کو گھوم پھر کر ہنسی خوشی سے کیوں نہ گزاروں۔

برآمدہ پار کیا۔ خوشبو سے بھری ہوئی ہوا ایک تیز ہلار کی صورت میں میرے سینے سے یوں ٹکرائی جیسے کسی عاشق کا پھینکا ہوا گلاب اسکی معشوقہ کے سینے پر لگے۔ آسمان پر بادلوں کی بارات نے چترال کی اس صُبح کو دلکش اور رومان پرور بنایا ہوا تھا۔

پی آئی اے کی بلڈنگ سے باہر نکلی۔ سامنے پولو گراؤنڈ تھا۔ کچے اور گراسی گراؤنڈوں کو کچھ دیر دیکھتی رہی۔ چناروں کے درختوں تلے گھومی۔ A.K.R.S.P کا دفتر یہیں کہیں ہے وہاں سے نقشے اور تصویریں لینی ہیں۔ دفتر یہیں کہیں ہرگز نہ تھا۔ زرگراندہ روڈ تک چل چل کر

بھرتہ بننے والی بات ہوگئی تھی۔ایریا منیجر سے ملاقات ہوئی۔حسن و جوانی کا مرقع تھا۔بعد میں پتہ چلا کہ شاہی فیملی سے ہے۔تبھی انگ انگ پور پور نسلی تفاخر کا اعلان کرتی تھی۔ نقشے تو ملے پر خواتین سے متعلق تصویریں دینے پر آمادہ نہیں تھا۔چلو جو ملا اُسے بیگ میں ڈالا۔

اب سوچا کہ چھاؤنی کا پُل ہی دیکھ لوں۔ جہاں سے چلی تھی اُن ہی سڑکوں کو پھر روندنے لگی۔ چترال سکاؤٹس کا دفتر چترال سکاؤٹس کا ہسپتال اور اسکے ساتھ ہی بڑا خوبصورت پُل۔ پرانا پُل بھی ذرا فاصلے پر تھا۔ چلو یار تھوڑی دیر کہیں بیٹھوں اور ذرا سستاؤں۔ میں نیچے اُترنے لگی۔ بڑے سے ایک پتھر پر بیٹھ کر موسم کی شوخیوں اور حُسن سے لطف اندوز ہوتے ہوئے دریائے چترال کی جولانیوں کو دیکھتے ہوئے میں نے سوچا کہ چیانتار گلیشئر کے پانیوں نے کتنے پینڈے مارے کتنے رنگ روپ بدلے۔کہیں یہ یارخون کہلایا کہیں اسے مستوج کا نام دیا گیا۔ کتنا ظرف ہے اسکا۔راہ میں تورکھو ملا اسے گلے لگایا۔ ''لٹکوہ'' نے شامل ہونا چاہا اسے بھی سینے میں جذب کیا۔ نہ حدوں سے خائف ہے نہ سرحدوں کا کوئی ڈر ہے۔اسکی اپنی مرضی اپنا موڈ ہے۔ ارندو میں پاکستان کو خدا حافظ کہہ کر افغانستان میں داخل ہو جاتا ہے۔

پانی فطرت کا کتنا طاقتور عنصر ہے۔

وقت دیکھا ساڑھے نو۔دفعتاً مجھے یاد آیا ارشاد کا گھر یہیں کہیں ہے۔کیوں نہ اُس سے ملا جائے۔ارشاد سے میری ملاقات نشرف بی بی کے ہاں ہوئی تھی۔

محبت بھرا استقبال تھا۔اسکی چھوٹی سی باغیچی سے گزر کر ہم بائی پٹس (نشست گاہ) میں بیٹھے۔کمرہ جھاڑو بہارو سے فارغ ہو کر صاف ستھرا ہو چکا تھا۔مٹی کے چولہے کو لپا پتا دیکھ کر میری آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی کہ مجھے اپنی ماں یاد آئی تھی اُسکا ایسے ہی لپا پتا چولہا چونکا یاد آیا تھا۔

اچانک ارشاد نے کہا۔ ''کاش آپ تھوڑی دیر پہلے آجاتیں۔''

''کوئی خاص بات'' میں نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

''امی ابو اپنی گاڑی میں دروش گئے ہیں۔مشہور افسانہ نگار غزالہ نگار اور کرزئی ہماری

عزیز ہیں انکی نانی اماں سے ملنا تھا۔ چلو اسی بہانے آپکی بھی سیر ہو جاتی۔''

اب تاسف کا ایک سلسلہ تھا اور میں تھی۔ صبح کے کیے ہوئے سب کاموں پر ایک لعنت تھی اور میں تھی۔ گولی مارتی ٹکٹ کو۔ دفع کرتی نقشوں کو۔ جھاڑو پھیرتی دریا کے نظاروں پر۔

جانے پھر اضطراری حالت میں یہ بات کیسے میری زبان سے نکل گئی۔ ''کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم عام گاڑی سے دروش چلے چلیں۔''

ویسے مجھے سو فیصد یقین تھا کہ ارشاد کہے گی ''آنٹی یہ کیسے ممکن ہے؟''

میری باچھیں کھلیں اور انہیں ضرور کھلنا چاہیے تھا کہ چترالی نوجوان غیر شادی شدہ لڑکی نے بڑی جی داری سے چادر ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا تھا۔ ''ضرور چلیں۔''

اور ہم دروش کے لیے چلے۔

چترال کی مضافاتی وادیاں ''ژغور۔ بکرآباد۔ چمورکن اور بروز'' پشاور روڈ پر دائیں بائیں واقع رنگ و رعنائی کی خوبصورت عکاس تھیں۔ بروز آیون کے بالمقابل خاصی بڑی وادی ہے۔ سڑک سے دریا کے پار اُتر ائی میں آیون کا نظارہ بہت دلکش تھا۔ سید آباد کے بعد گہریت کا گاؤں تھا۔ اس وادی سے بھی بریر کو ایک راستہ جاتا ہے۔ گنگ اور کیسو کے بعد دروش آ گیا تھا۔

دروش دروش کی گونج دار آواز نے جیسے میرے ذہن کی کھڑکی کو ایک جھٹکے سے کھول ڈالا۔ ''گوگول'' کے ناول ''TARAS BULBA'' کا وہ منظر میرے سامنے آیا جہاں یہودی یانکل تاراس بُلبہ کے سامنے اسکے بھائی دروش کا حوالہ دیتے ہوئے کہتا ہے۔ ''میں نے دروش کی مدد کی تھی جب وہ قید میں تھا۔ مجھے دروش کے نام پر معافی دی جائے۔''

اس دروش کا نام کس پر ہے؟

دروش کیسی پر رونق وادی تھی۔ گہما گہمی اور ہنگاموں سے پُر روشن بازار۔ اشیائے ضروریات اور تعیش سے سجی دوکانیں جن میں بھاؤ تاؤ کرتے پر باش اور ماٹھے سبھی قسم کے لوگ۔ پجاروں کے ہارن آرے چلنے کی آوازیں بھری پُری آباد گلیاں۔ اللہ میرے کلیجے میں کیسی ٹھنڈک

اُتری ہے۔ پھلے پھولے سدا یہ۔ سر سے پاؤں تک میں نہال ہوئی تھی۔

ارشاد بگٹٹ بھاگے جاتی تھی اور میں منظروں سے آنکھیں لڑاتے ٹھوکریں کھاتے اسکے پیچھے پیچھے تھی۔

بارے خدا کو رودروش میں سابق چیئر مین یونین کونسل خورشید علی کے گھر داخلہ ہوا۔ اندر جانے سے قبل باغ کے رنگین پھولوں اور پھلوں کی ٹہنیوں کو ساون رُت کے حُسن میں جھوم جھوم کر لہراتے دیکھا۔ ڈیوڑھی سے گزر کر ایل شکل کے کمروں والی عمارت کے سامنے وسیع وعریض دالان تھا جس میں کہنہ سالہ چوبی تخت پوش بچھا تھا۔ غزالہ کی نہال کا گھر۔ کمرے میں بچھے قالین پر ارشاد کی والدہ سے باتیں کرتے ایک معمر وجود نے گلے لگایا اور دروش آنے پر خوش آمدید کہا۔

میں نے ملحقہ واش روم میں جا کر ٹھنڈے ٹھار پانی کے چھینٹوں سے آنکھوں اور چہرے کی دھلائی کی۔ وضو کیا۔ نماز کے لیے کھڑی ہوئی اور جب سلام پھیرا غزالہ کی نوجوان خالہ ریحانہ شفقت اور ممانی کو چائے کے لوازمات کے ساتھ منتظر پایا۔

اور جب میں چائے پیتی تھی درمیانی قامت کا ایک دُبلا پتلا لڑکا جس کا چہرہ موٹی موٹی آنکھوں اور چھوٹی چھوٹی داڑھی سے سجا تھا کمرے میں آیا پاس بیٹھا اور بولا۔ ''نام میرا رضیت باللہ ہے کہتے سب رضی ہیں۔ میں اس گھر کا ولی عہد ہوں۔ ہمارا گھر دروش میں ضرور ہے مگر یہ پورا دروش نہیں۔ دو تین گھنٹے یہاں گزار کر آپ بھلا کیا لکھیں گی۔''

لڑکے کی ذہانت سے پُر بات مجھے اچھی لگی۔ میں مسکرائی اور بولی۔

''رضی میں بڑے منتخب گھر میں اُتری ہوں جو یقیناً دروش سے میرا تفصیلی تعارف کروائیں گے۔ اور یہ واضح ہو کہ میں ''تیسرے دن کا مہمان زحمت نہیں'' بنوں گی البتہ رحمت کے دو دن ضرور کاٹوں گی۔''

''تو پھر ایک گھنٹہ بعد میں حاضر ہوں گا۔''

میں ریحانہ شفقت کے ساتھ باہر آ گئی۔ چوبی تخت پر بیٹھ کر انہوں نے دروش کی تعلیمی

حالات پر بات چیت کی۔

وادی کے چہرے مہرے پر اسکے بھرے پُرے ہونے کا جو احساس آغاز میں ملا تھا تعلیمی اور طبی میدانوں میں اسکی ترقی نے اُسکے سچ کو ثابت کیا تھا۔ تقریباً ۲۷ پرائمری سکول ہر سکول میں زیرِ تعلیم ۴۰۰ بچے۔ ہائر سکینڈری دستکاری سینٹرز اور ٹیکنیکل سکول ہیں۔ وادی کی لڑکیاں ضلع دیر تک سیکنڈری سکولوں میں پڑھانے جاتی ہیں۔ خود ریحانہ کئی سال لاوی دروش میں پڑھاتی رہیں۔ آجکل وہ L.O.C ہیں۔

لاوی کی یادوں کو تازہ کرتے ہوئے ریحانہ مسرور آواز میں بولیں۔

''لاوی کا گاؤں اونچے پہاڑوں کے سروں پر واقع کھلے میدانوں میں ہے۔ وہاں کے لوگوں اور طلبہ وطالبات کا تعلیمی رجحان دلچسپی اور ہمارے لیے انکا دیدہ ودل فراش کرنا ایسے خوش آئند امور تھے کہ پہاڑوں کی چڑھائی اُترائی کی اذیت کے باوجود ہم نے ہمیشہ وہاں جانے اور انہیں پڑھانے میں سرشاری محسوس کی۔''

''ریحانہ کیا لاوی کی سیر ہوسکتی ہے؟'' میں تجسس اور شوق کے ہاتھوں بول پڑی تھی۔

''ارے ضرور کل ہی چلیں گے۔ میرے لیے تو یہ عمر رفتہ کو آواز دینا والی بات ہوگی۔ انجوائے کروں گی۔''

اور جب غزالہ نگار اور کزئی اور اسکے بہن بھائیوں کا بچپن زیرِ گفتگو آیا۔ ''اسی چوبی تخت پر ایسی ہی ساون رتوں میں وہ میرے پیارے دلارے ساون گیتوں اور کہانیوں کی فرمائش کرتے۔'' ریحانہ کا لہجہ کیسا گلوگیر سا تھا۔

پھر وہ لڑکا آیا جو میرے بیٹے کی عمر کا تھا اور میں اسکے ساتھ چلی۔

پتہ نہیں میرے اس جذبے میں کوئی مقناطیسیت تھی جو میرے اندر سے اُڑ کر اس لڑکے کے دل سے جا ٹکرائی تھی۔ کیونکہ وہ مجھے سب سے پہلے اس سرزمین کی خوبصورت ترین جگہ پر لے گیا جس کی مجھے خواہش اور تمنا تھی۔

مسجد کیا تھی رنگوں کی پھوار میں بھیگی ہوئی جسے دیکھتے ہی دل میں جذب وشوق کی دنیا اُمڈ آئے۔ فوارے کے چھینٹے اُڑاتے پانی سے وضو اور کیاریوں میں مسکراتے رنگارنگ پھولوں سے آنکھوں کو روشن کیا۔ اور پھر پورے وجود کو مجسم عجز کرتے ہوئے زمینوں اور آسمانوں پر بچھی اُسکی کرسی کے قدموں میں پیشانی جھکائی۔ دعا کے لیے پھیلی ہتھیلی پر خواہشوں کے انبار تھے جنہیں ایک کے بعد ایک اسکے حضور پیش کرتی گئی۔

''آپ چترال سکاؤٹس کے کرنل مراد خان کے لیے دعائے خیر کردیں کہ جنہوں نے وادی کو یہ خوبصورت تحفہ دیا۔'' رضی کے لہجے میں نمی سی گھلی تھی وہ خود بھی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھا۔

رضی سیاستدان گھرانے کالڑکا تھا۔ سیاست پر باتیں کرتے ہوئے بہت پُر جوش تھا۔

گاڑی کا ایکسیلیٹر لہجے کے چڑھاؤ کے ساتھ ساتھ دبا جارہا تھا۔ اور میرا دم نکلا جاتا تھا۔

''یہاں تین سیاسی پارٹیاں ہیں۔ پیپلز پارٹی، مسلم لیگ اور جماعت اسلامی۔ بھٹو کا بہت مداح تھا۔ بھٹو نے عام آدمی کو زبان دی اُسنے انہیں اپنے حقوق کا احساس دلایا۔ غصب شدہ زمینیں واپس اُن غریب ہاریوں کو دلائیں جنکے وہ اصل مالک تھے۔''

دروش کی کشادہ گلیوں اور محلوں میں اُسکی گاڑی بھاگی پھرتی تھی۔ لنگا۔ پوٹیباں دہ۔ بتانے اور چلنے کا سلسلہ جاری تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے گاڑی نے چڑھائی چڑھی ''یہ ڈاپ نغور ہے۔ دروش کی مرکزی جگہ۔ سابق گورنر دروش کے بیٹے صمصام الملک کا گھر یہیں ہے۔ میں گاڑی یہاں روکتا ہوں آپ چاہیں تو اُن سے مل آئیں۔''

میں ایک بڑے گھر میں داخل ہوئی۔ مسز ضیاء سے ملاقات ہوئی۔ پرنس محی الدین کی صاحبزادی اور صمصام الملک کی بہو۔ بارلیش صمصام الملک۔ محبت اور پیار بھرے لہجے میں باتیں کرتی ان کی بیگم۔ چائے پینے اور ٹھہرنے پر اصرار۔ ''بس آپ سے ملنا تھا مل لیا۔'' کہتے ہوئے میں باہر آگئی۔

چترال سکاؤٹس کا سابقہ ہیڈ کوارٹر بہت سی باتوں میں اپنی مثال آپ تھا۔ اونچی نیچی پہاڑیوں کے سینے پر بل کھاتی سڑکیں اُن شاندار کمروں کے دروازوں تک جاتی تھیں جن میں چترالی تہذیب اور ثقافت زندہ تھی۔ دیواریں اگر مارخور آ ئیکس اور اوڈیال کے سینگوں سے سجی تھیں تو میڈلز چترالیوں کی شجاعت و دلیری کے داستان گو تھے۔

سرنئی دف چترالی ستار جیسے آلات موسیقی اگر انکی فنون لطیفہ سے محبت کے اظہار کے نمائندہ تھے تو پرانے زمانوں کے آلات حرب اور گھریلو استعمال کی اشیاء کھون (جوتے) پیالے کپڑے انکی اپنے ماضی سے تعلق اور دلچسپی ظاہر کرتی تھیں۔

لائبریری ہر موضوع پر کتابوں سے بھری پڑی تھی۔ بلئیرڈ روم وی وی آئی روم سب شاندار تھے سڑک سے نیچے کا نظارہ دلفریب تھا۔ کرنل مراد کی مسجد کرکٹ گراؤنڈ میں کھیلتے لڑکے گھما گھیموں اور رنگینیوں والا بازار پھر گاڑی چلی۔ پرانا بازار اس سے آگے سول اسپتال۔ دستکاری سینٹر۔ تھانہ۔ قرب و جوار کے علاقے پرنس محی الدین کا ذاتی حلقہ کا کٹنگ۔ دروش زندگی اور اناج سے بھری پری دو فصلی وادی۔

جب واپسی ہوئی ارشاد اور اسکے امی ابو جانے کے لیے تیار تھے۔ افراد خانہ کی طرح میں بھی انہیں خدا حافظ کہنے کے لیے کھڑی تھی۔ اگر کہیں جنت مکانی اماں ہوتیں تو ضرور کہتیں۔

دھیئے تیریاں سایاں کتھے وِدائیاں کتھے۔

رات کو رضی کی درد بھری داستان محبت سُنی۔ بے چارہ لڑکا یک طرفہ محبت کے روگ میں مبتلا تھا۔ What a nonsense میں نے اُسے پیار بھری ڈانٹ دی۔ ''اُسے بتاؤ۔ کم از کم اپنے جذبات کا اظہار تو کرو۔ منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہو۔''

''حوصلہ نہیں پڑتا آنٹی۔ رضی بے بسی سے بولا۔ میڈیکل کی سٹوڈنٹ ہے وہ اور میں محض ایک گریجوایٹ۔''

''پہلے اپنے جذبات کو زبان تو دو۔ کھل کر اظہار کرو۔ محبت میں سب چلتا ہے۔''

لاوی کا تجربہ بہت دلچسپ تھا۔ ابھی پو بھی نہیں پھٹی تھی جب گاڑی کے ہارن چیخنا شروع ہو گئے۔ ریحانہ اور میں باہر بھاگے۔ ریحانہ کی دوست الوینہ تاج جو وہاں ٹیچر تھی اُسے لیا۔ گول کی گزرگاہ پر جیپ نے اُتار دیا اب پہاڑ پر چڑھائی تھی۔ یہ تجربہ میرے لیے نیا تو نہ تھا میں سکردو میں برنس اور گلگت نگر میں ایسی چڑھائیوں سے آشنا تھی۔ مگر جب کچھ وقت گزر جائے تو ہر بات نئی لگتی ہے۔ ٹیڑھا میڑھا راستہ سانس پھول پھول پڑتا تھا۔ کوئی جوانی تو تھی نہیں کہ مشقتوں کے بار تلے رگیدنے کے باوجود تازہ دم رہتی۔

سبحان اللہ اوپر تو جیسے باغ بہشت کا نظارہ تھا۔ گل وگلزار کھلا پڑا تھا تا حد نظر پھیلی ہوئی ایک اور حسین وادی جہاں گھر کھیت کھلیان پہاڑ درخت چشمے پانی کے بہتے کھال کس نعمت کی کمی تھی یہاں۔ مولا تیرے کیسے کیسے رنگ اور ڈھنگ ہیں۔ واقعی بندہ خدا کی کس کس نعمت کو جھٹلائے۔

چھوٹا سا اسکول جہاں بچیاں گھومتی پھرتی تھیں۔ کمرے میں ناشتہ رکھا تھا۔ چترالی پراٹھا انڈہ اور چائے۔ لڑکیوں کے چہرے ریحانہ کو دیکھتے ہوئے گلنار سے تھے۔

میری پنڈلیوں میں اینٹھن تھی۔ ابھی اُترائی بھی سر پر سوار تھی۔ اسکے باوجود میں نے وادی کے نظارے لوٹے۔ خوبانیاں کھائیں توت کھائے جگہ جگہ چشموں کا پانی پیا۔ اور وقت کے ایک ایک لمحے سے لطف اُٹھایا۔

باب نمبر۔۱۰

ریمبور۔ موت کا کھیل
اقلاس اور جاپانی ایکو

اُس چھوٹے سے لان میں چھوٹی سی کرسی پر بیٹھے بیٹھے صدیوں پرانے چنار کے درخت کی شاخوں اور پتوں کو تیز ہواؤں میں جھولتے جھومتے اٹھکیلیاں کرتے ادائیں دکھاتے اور بوس وکنار سے لطف اندوز ہوتے دیکھتے دیکھتے عمارت کے آنگن میں بوڑھے اور جوانوں کے ایک بلاک سے دوسرے میں جانے والے قدموں کو گنتے گنتے اور پھر اُس چھوٹے سے سایہ فگن آسمان پر نظریں جمائے اپنے دل کی دھڑکنوں کو لا الہ اللہ کے ورد سے ہم آہنگ کرتے کرتے جب میں اوب سی گئی تو سوچا ''آخر میں ہمیشہ غلطیاں کیوں کرتی ہوں'' تبھی اے کے آر ایس پی کی بلڈنگ کے صحن میں کھڑی گاڑیوں میں سے ایک کے ڈرائیور نے مجھے آواز دی۔ ''آیئے چلیے۔''

پشاور روڈ سے آیون کسی ایسی دُلہن کی طرح نظر آتا ہے جس کا ایک ایک انگ حُسن دلربائی کی تصویر ہو۔ پر جونہی نیچے اُتر کر نقاب کشائی ہوتی ہے تو ایک بھدا بے رونق اُجڑا اُجڑا چہرہ دیکھنے کو ملتا ہے یوٹرنز کی خطرناک چڑھائیوں اُترائیوں کے بعد بلندی پر گاڑی کے سیدھا ہونے پر وہی دلربائی دامن دل کو پھر کھینچتی ہے۔

ژوبار چیک پوسٹ سے ریمبور جانے کے لیے ڈرائیور نے گاڑی دائیں ہاتھ موڑلی۔ راستہ بہت تنگ اور دشوار گزار تھا۔ سیاہ اور براؤن چٹانیں خوفناک تھیں۔ بہت نیچے نالہ ریمبور بہتا

تھا۔ چوبی پُل پر کراسنگ کے بعد گاڑی کے سامنے عمودی چڑھائی تھی۔ یہ چڑھائی دہلانے والی تھی یوں کہ دو قدم آگے بڑھتے تو چار قدم پیچھے لڑھکتے۔ چند بار کے اس عمل سے مجھے یوں لگا جیسے تڑپتی اور ہونکتی گاڑی اب نالے میں گر کر ہی دم لے گی۔

میرا اضطراب اور بے چینی ڈرائیور سے پوشیدہ نہ رہ سکی تھی شاید اسی لیے اسکی آواز میں اطمینان تھا اور لہجے میں دلاسا۔

''پریشانی والی بات نہیں یہاں گاڑی کو ریورس کیے بغیر آگے نہیں جایا جاسکتا۔''

درے نما راستے کے بعد آسمان کی کشادگی اور درختوں فصلوں کی ہریالی خوف و دہشت کی گرداب میں ڈولتے ڈوبتے دل کو زندگی کے حسن اور رعنائی کے توانا احساس سے قوت دیتیں۔

'' گمبانیک پُل۔ ڈرائیور نے بتایا۔ نالے کے ساتھ راستہ دیکھیے۔''

میں نے آنکھوں کو ممکنہ حد تک پھاڑتے ہوئے اشارہ کردہ سمت کی طرف دیکھنا شروع کیا یہ راستہ اُس جنگل کو جاتا ہے جہاں بہت بڑی چراگاہ اور کھیت کھلیان ہیں۔ موسم گرما میں کاشتکاری ہوتی ہے۔ یہاں سُرخ رنگ کے پانی کا ایک چشمہ ہے جو پیٹ کی بیماریوں کے لیے اکسیر سمجھا جاتا ہے۔

پراکالک۔کوٹ دیش۔ بالا دیش۔ اوچھوک گول کے گاؤں گزرتے گئے۔ اور ایک عجیب سا منظر آنکھوں کے سامنے اُبھرتا گیا۔ کالاش مرد و زن پیر و جواں بچے بالے راستے پر کہیں جتھوں میں کہیں اکا دکا نشیب میں بہتے نالے کیطرح ہوائی فائرنگ کی گھن گرج کے ساتھ چلے جاتے تھے۔

''مرکز میں کوئی مر گیا ہے۔ موت بھی کسی امیر آدمی کی ہے۔'' ڈرائیور نے مجھے مطلع کیا۔ موت کیسا خوفناک دہشت بھرا اور وجود کی رگ رگ میں کپکپی دوڑانے والا لفظ ہے۔ پر یہاں گاڑی میں اسے سُن کر میرے اندر جیسے مہتابیاں سی چھٹنے لگی تھیں اس لیے کہ نسلی تخلیق کے لیے ملاپ کے بندھن موت خوشی و غمی جیسے فطری عناصر کسی بھی قوم قبیلے کے وضع کردہ رسم و رواج اور طور

طریقے اسکے مزاج اور خصوصیات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔

''چلو اب یہ تو دیکھوں گی ہی۔''

مرکزی وادی گروم میں جب داخلہ ہوا تو سچی بات ہے یوں محسوس ہوا تھا جیسے طبل جنگ بجا ہو۔ ہوائی فائرنگ اور لوگوں کا جم غفیر اوپر پہاڑوں کی طرف رواں دواں تھا۔ کالاش ہوٹل کے سامنے ڈرائیور نے مجھے اُتار دیا۔ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیا کہ ''موت کا یہ کھیل اب دو تین دن چلے گا۔ اطمینان سے رہیے اور دیکھیے۔''

موت کے اس ہنگامے کو دیکھنے اور اسکے بارے میں جاننے کی شتابی کے ساتھ ساتھ میرے لیے عصر کی نماز کے لیے کسی مسجد کے فرش پر سجدہ کرنا بھی ضروری تھا۔ ہوٹل کے عقبی لان سے ماحول کی دلکشی سے لطف اندوزی کو میں نے کسی دوسرے وقت پر اٹھا دیا اور باہر نکل آئی۔ دریا کے کنارے اسکا گھر مجھے نظر آ گیا تھا۔ میں نے اس نئی زمین پر عاجزانہ عبودیت کے اتھاہ جذبے کے زیر اثر سر جھکا دیا تھا۔

دریا پر بنے چوبی پُل پر پار سے آتے ایک نوجوان لڑکے کو میں نے روک لیا۔ وادی کی اس ہنگامی حالت پر بات چیت سے معلوم ہوا کہ کالاش قبیلہ مُردے کو اس کی موت کے فوراً بعد چارپائی پر ڈال کر ڈانس ہال لے جاتا ہے۔ گروم گاؤں کے ایک معزز آدمی کا آج گیارہ بجے انتقال ہو گیا ہے۔

میری اوپر جانے کی خواہش پر اُس نے فی الفور چلیے کہہ کر ہاتھ بڑھا دیا۔ شوق کے ہاتھوں پیٹ کا مسئلہ پس پشت چلا گیا۔ حالانکہ اُس وقت بھوک کی شدت سے میری کنپٹیوں میں ٹیسیں سی اٹھ رہی تھیں۔ بیگ سے بسکٹوں کا پیکٹ نکال کر میں نے بسکٹ کھاتے ہوئے پہاڑ کی چوٹی پر جانے کے لیے قدم اُٹھائے۔

کیا عجیب منظر تھا دائیں بائیں آگے پیچھے ڈھول بجاتے ڈانس کرتے ہاہو کی آوازیں نکالتے زینہ در زینہ چڑھائیوں پر سیاہی سے اٹے پڑے دو منزلہ سہ منزلہ گھروں کے ساتھ ساتھ

تنگ راہوں پر چلتے لوگوں کا ایک ہجوم ندی کے سبک خرام پانیوں کی طرح بہتا چلا جاتا تھا۔ یقیناً یہ دو سو فٹ کی بلندی تھی۔ فطرت کی گود میں رنگوں کی روشنی میں ہنستا مسکراتا اٹھکھیلیاں کرتا یہ ایک بھرپا میلہ تھا۔ پر ذرا آگے ایک حیرت انگیز منظر بھی تھا۔ چارپائی پر ایک میت ستونوں پر مشتمل بے درو دیوار چھت والی ایک کشادہ اور ہموار جگہ کے بیچوں بیچ پڑی تھی جسے دیکھنے میں یہاں آئی تھی۔ تین چار عورتیں سرہانے بیٹھیں سر کے کھلے بالوں سے چہرہ ڈھانپے اپنی زبان میں اونچے اونچے کچھ گا رہی تھیں۔ مرنے والے کی بیوی بہوئیں اسکی قصیدہ خوانی میں مصروف ہیں۔ مجھے معلوم ہوا تھا۔

اب سورج کی نارنجی کرنوں نے ایک اور منظر کا راستہ کھولا۔ دو کالاشی بزرگ ہاتھوں میں چھوٹی چھوٹی کلہاڑیوں کے ساتھ مجمع میں سے نکلے آگے بڑھے میت کے قریب آئے اور بلند آواز میں کچھ پڑھنا شروع کیا۔ ہزاروں کا ہجوم دم سادھے کھڑا تھا۔ اُس سے مجھے اپنا آپ ماضی کی کسی ایسی ٹنل میں محسوس ہوا تھا جہاں وہ رزمیہ شاعری کرنے والا ہومر ایسے ہی ماحول میں کھڑا ٹروجن وار کے بعد یولیسس کے کارناموں اور اسکی دس سالہ طویل مسافتوں کی داستان گا رہا ہو۔

اس سین کا کلائمکس اسوقت ہوا جب انہوں نے اپنی کلہاڑیاں میت کے وسط میں لا کر ٹکرائیں۔ اس زوردار ٹکراؤ کی ٹک گویا وہ صور اسرافیل تھی کہ جس نے فطرت کے نظاروں میں گھرے اس کشادہ قطعہ پر کھڑے لوگوں کو یوں مہمیز کیا کہ ان کی خاموش زبانیں اور اجسام اسطرح متحرک ہوئے کہ سیٹیوں کے ساتھ ایک ایسا زوردار ڈانس شروع ہوا کہ لگا جیسے کائنات اب کسی تند و تیز بگولے میں تحلیل ہو کر فضا میں پھیتی پھیتی ہو کر بکھر جائے گی۔ اس جگہ کے ساتھ ایک خستہ حال عمارت تھی۔ سردیوں کا ڈانسنگ ہال جس کے ستونوں پر بکرے کے نقش و نگار تھے۔

جب ڈھول کی ڈھم ڈھم کانوں کے پردے پھاڑتی تھی۔ جب گولیوں کی تڑتڑاہٹ اور سنسناہٹ رگوں میں خون کو منجمد کرتی تھی اور جب حسیناؤں کے پُرے رقص بسمل میں مگن تھے میرا گائیڈ مجھے مہاندیو کی زیارت کی دعوت دیتا تھا۔ سامنے والی پہاڑی پر بڑے سے پتھر کے

سائے تلے چار دیواری میں مہاندیو رہتا ہے۔ میں نے دیکھا راستہ تنگ بھی تھا اور دشوار گزار بھی وقت کی کمی بھی پیش نظر تھی۔ یہاں گھوڑوں کے چوبی سروں والے مجسمے ہوں گے جا بجا دیودار کی ٹہنیاں خون کے چھینٹے جلتی آگ یا شاید راکھ ہو۔ قربان گاہ میں یہی سب کچھ ہوتا ہے نا۔ میں نے استفہامیہ انداز میں اُسے دیکھا تھا۔

میری انتڑیاں اُسوقت بھوک کی شدت سے بلبلا رہی تھیں۔ اُترائی کی دشواری بھی سامنے تھی۔

اُترتے سمے میری حالت اُس دلہن جیسی تھی جس نے بالشت بھر اونچی ایڑی کا جوتا اور زمین پر لُٹنیاں لیتا شرارہ پہنا ہو اور جو پھونک پھونک کر قدم اٹھاتی ہو اس ڈر سے کہ کہیں لڑھک لڑھکا کر تمسخر کا باعث نہ بن جائے مجھے تمسخر کا نہیں ہڈی جوڑ کے اناڑیوں کے پاس پہنچنے کا ڈر تھا۔ گورڈن کالج راولپنڈی کے چند طلبہ کی ہرنی کی طرح چوکڑیاں بھرنے کی ادائیں دیکھ کر ذرا عمر رفتہ کو آواز دینا یاد آیا تھا۔

ہوٹل میں لوبیا کا بدمزہ سا سالن تھا۔ اکڑی ہوئی روٹی تھی۔ شکوہ کرنے پر سُننے کو ملا تھا۔ آرڈر دے کر جانا تھا۔ اور اگر مُفتے کی مقامی ذائقہ دار چیزیں کھانی تھیں تو اوپر ٹھہرنا تھا۔ جش (چربی میں بنایا ہوا نمکین حلوہ) اور اُبلا ہوا گوشت ملتا۔ جش نیچے کے حلووں ولووں اور اُبلا گوشت روسٹ کے سواد کو بھلا دیتا۔

پیاز اور ٹماٹر کے سلاد کے ساتھ جو ملا اُسے غنیمت جان کر آہستہ آہستہ چبا کر حلق سے اُتارتے ہوئے میں نے لڑکے کو سُنا۔ تین دن یہ میلہ چلے گا۔ پنیر گوشت چاول منوں کے حساب سے اُڑے گا۔ کالاش موج میلے والا مذہب ہے۔ کھاؤ پیو موج اُڑاؤ اس کا سلوگن ہے۔ لڑکا ہنستا تھا۔ اور میری معلومات میں اضافہ بھی کرتا جاتا تھا۔

''یہ امیر آدمی ہے اب اسکی اولاد اسکا چوبی مجسمہ بنا کر کسی جگہ گاڑ دے گی۔''

متاثرین میں بیوہ کی نسبت بیچارے رنڈوے کی حالت زار زیادہ قابل رحم جاننے کو

ملی۔ چلو بیوہ پانچ ماہ تک اپنے برتن بھانڈے ہی الگ کرتی ہے پر مرد کو تو شوم (لکڑیاں رکھنے کی جگہ) میں رہنا پڑتا ہے۔ روٹیاں کیچ کروانے کے انداز میں پھینکی جاتی ہیں۔ غریب پانچ ماہ تک چھوتوں جیسی زندگی گزارتا ہے۔ یہ انداز سوگوار خاندان سے محبت کا اظہار ہے۔

اوپر ڈھول بجتا تھا۔ لالٹینیں جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتی تھیں۔ اور رقص جاری تھا۔ میں نے نیند کی چادر اوڑھی اور پربتوں کی ان رنگ رنگیلی شہزادیوں کے ساتھ انجانے دیسوں کی طرف روانہ ہوگئی۔

صبح کی آنکھ میں بانکپن تھا۔ ایک جادوئی کیفیت تھی جو کشاں کشاں کھینچ کر مجھے سحر زدہ انسان کی طرح دریائے ریمبور کے پار لے گئی جہاں درختوں کے جھنڈوں میں دو منزلہ سہ منزلہ چوبی گھر تھے۔ بوڑھی عورتیں بچے کھیت کھلیان اور وادی کا اکلوتا بجلی گھر تھا۔ سورج کی چڑھائی کے ساتھ ساتھ میری چلنے کی رفتار بھی جاری تھی۔ تھوڑا سا آگے بڑھتی تو خود کو ایک نئے منظر کے حسین حصار میں پاتی۔ ایسے میں مجھے وہ لازوال شاعر یاد آیا تھا۔ ''ورڈز ورتھ'' جسکی حُسن فطرت پر بے مثال نظمیں اسکی میلوں لمبی پیدل سیروں کے تجربات و مشاہدات کا نتیجہ تھیں۔ دریائے ریمبور کی روانیاں شاید Derwent کی روانیوں سے لگا نہ کھاتی ہوں اور Grasmere کے پہاڑوں کی شان بان ریمبور کے پہاڑوں جیسی نہ ہو۔ پر یہ سرسبز چراگاہیں یہ پھیلے جنگل بھیڑ بکریاں چراتے چرواہے۔ آسمان کی وسعتوں میں مقید یہ دلربا منظر کاش میں شاعر ہوتی۔

اور جب میں واپس آ رہی تھی میں نے اُسے دیکھا تھا اور دیکھ کر ٹھٹھکی تھی۔ ورڈز ورتھ نے یہ شعر ایسی ہی کسی نازنین کے لیے کہا ہوگا۔

She was a phantom of delight
When she gleamed upon my sight

مقامی تھی پر سرتاپا منفرد۔ اسکے انداز دید میں خودنمائی اور اپنے ہونے کا بھرپور اظہار تھا۔

یہ اقلاس تھی۔ کافرستان کی پہلی میٹرک پاس لڑکی جو بعد میں پائلٹ کے طور پر بھی مشہور ہوئی۔ اسکے لباس پر نہ بوسیدگی تھی اور نہ پرانا پن۔ سر کے بالوں کی مینڈھیاں خوبصورت اور تازہ گندھی ہوئی تھیں۔ ٹوپی میں مُرغ زریں کے نئے نکور پر چمکتے تھے۔

پھر اُس نے مجھے ہاتھ سے پکڑا اور اپنے گھر لے گئی۔ اُسکا دو منزلہ گھر بولتا تھا کہ اس کا سربراہ بالائی چراگاہوں کی زمینوں جنگلوں کے قیمتی درختوں اور بے شمار بھیڑ بکریوں کا مالک ہے پر بشتارہ خان یہ سب نہیں بولتا تھا۔ یوں ڈھائی پسلی کے بشتارہ خان کو جسکی اندر کو دھنسی آنکھیں گال اور سانولی رنگت دیکھ کر یہ اندازہ ہی نہیں ہوتا تھا کہ مہکتے تروتازہ گلاب جیسے چہرے والی طرحدار لڑکی ایسے بے سرے آدمی کی بیٹی ہے۔ وہ اوپر سے تھوڑی دیر قبل آیا تھا۔ شہری ناشتہ بسکٹ اور چائے پیش ہوئی پھر وہ مجھے ایکو سے ملانے لے گئی۔

ایکو جلانے کے لیے لکڑیاں جنگل سے کاٹ کر لاتی ہے۔ فصلوں کی بوائی اور کٹائی میں حصہ لیتی ہے۔ بھیڑ بکریاں چراتی اور کھانا پکاتی ہے۔ ایکو کو ہمارے رسم و رواج اور کلچر سے عشق ہے۔ اور وہ انکی ادائیگی جذب سے کرتی ہے۔ وادی گروم کی سڑک پر چلتے اور اس مہ لقا کی باتیں سنتے ہوئے مجھے موپساں کی کہانیاں یاد آئی تھیں جنکے کردار متنوع بڑے منفرد اور انسانی نفسیات کے گنجلک رویوں کے بہترین عکاس ہوتے ہیں۔

کیا ایکو بھی ایک ایسا ہی کردار ہے؟ میرا اپنے آپ سے استفسار تھا۔

نچلی منزل کے مویشی خانے اور گودام سے گزر کر دوسری منزل کی چند چوبی سیڑھیاں چڑھ کر میں صحن میں آ کھڑی ہوئی۔ کھلی انگنائی سے بڑے کمرے میں داخلہ ہوا۔ وہی مانوس سے منظر دھوئیں سے سیاہ دیواریں اور چھت چارپائیوں پر بکھرے جلھے گودیلے۔ گندے مندے برتن بھانڈے جلتی آگ اور راکھ کا ڈھیر۔ دُنیا کے انتہائی ترقی یافتہ ملک جاپان کی ایکو کالاشی لباس کے سب لوازمات سے سجی سنوری کہیں نقطہ آغاز کی پراسرار غاروں والے زمانے کے دہانے پر کھڑی اپنے طباق سے چہرے پر بکھری مسکراہٹ لیے بندے کو سوچوں اور حیرتوں کی گھمن گھیریوں میں

ڈالتی تھی ۔ دو دنیاؤں کا تضاد ذہن پر ضربیں لگاتا تھا۔ اسکا شوہر عام سا کالاشی جوان اور عمر میں اس سے چھوٹا تھا۔

ایکو میری ذہنی دیواروں پر چمٹ گئی تھی۔ ''پکھ نہ ویکھے سالنا تے عشق نہ پُچھے ذات تے نیند نے ستھر ملیا جتھے پہ گئی رات'' والی مثالیں سب ٹھیک ۔ پر بھوک نیند اور عشق لوازمات کے بغیر کتنے دن چلتی ہے؟

باب نمبر۔١١

شندھور۔ پولو میلہ

اور شوکن میلے دی

سچ تو یہ تھا کہ میرے شب و روز ان میں رواں دواں لمحے ان لمحوں میں متحرک ساعتیں اس لوک گیت کی عملی تفسیر بن کر میرے گرد و پیش ایک بڑے سے سوالیہ نشان کی صورت سینہ تان کر یوں کھڑی ہو گئی تھیں کہ شوکن میلے دی کو یہ سمجھنے میں مشکل کا سامنا تھا کہ وہ گواچی گاں کی طرح منہ اٹھا کر چترال کیوں چل پڑی تھی اُسنے اہم فیسٹولز پر ہوم ورک کیوں نہ کیا تھا۔

اب 12500 فٹ کی اونچائی پر بلند پہاڑوں سے گھری شندھور جھیل اس کی خوبصورتی و رعنائی اور اس پر ہونے والے پولو میلے کا دھوم دھڑکا، حقیقتاً میں تو کورے کاغذ کی طرح بلینک تھی۔ جب وادی شغور کے راجہ جناب کرنل متاع الملک کے سب سے چھوٹے صاحبزادے نے دریائے گرم چشمہ کے کنارے پڑے بڑے سے پتھر پر بیٹھ کر بتایا کہ یوں تو پورا چترال حُسن و جمال میں یکتا ہے پر شندھور جھیل کا تو ٹا تو یوں لگتا ہے جیسے جنت کا کوئی ٹکڑا اپنے مرکز سے بچھڑ کر بھولے سے راہ بھٹک کر یہاں گر پڑا ہو۔ غروب آفتاب کا نظارہ آپ چاہیں گی کہ کاش کوئی وقت کے تیز رفتار پاؤں میں پنچیاں پہنا کر انہیں اپنے کلاوے میں جکڑ کر ساکت کر دے کہ سورج کی آخری بسنتی کرنیں عمودی ہو کر جھیل کے بہتے پانیوں پر ایسا خوبصورت راستہ بناتی ہیں کہ جس پر آنکھیں بند کر کے چلنے کو جی چاہے بلا سے بندہ گہرائیوں میں غرقاب ہی ہو جائے اور طلوع آفتاب جیسے تبسم میں نہایا پیلا گلاب دھیرے دھیرے اپنا منہ کھولے اور جب میلہ لگتا ہے تو بس یوں لگتا ہے جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کا بند منہ کھل گیا ہے اور اس میں سے رنگین لاوے کی بجائے

خوش رنگ تتلیاں نکل کر سارے میں پھیل کر اُڑتی پھریں۔ میں نے اپنے کلیجے پر ہاتھ رکھ لیا تھا کہ مجھے اپنے سینے میں انگارے دہکتے محسوس ہوئے تھے۔ اتنا پینڈا مارا چترال پہنچی اور اصل چیز پھر بھی نہ دیکھ پائی۔

''اگلے سال'' میرے اندر نے کہا

پر کہیں دل میں ہوک سی اٹھی تھی۔ کون جانے پل کا بھروسہ نہیں اور میں بڑے بوجھل دل کے ساتھ نیچے اتر آئی تھی۔

کبھی کبھی جب میں مغرب کی نماز کھلے آسمان تلے پڑھتی تو جیسے پیشانی کہیں جھیل کے سبزہ زاروں پر سجدہ ریز ہو جاتی۔

اور اگلے سال 1997 میں جب جانے کے دن آئے میری خلیری، ممیری اور چچیری بہنیں کہ سب استاد تھیں گرمائی تعطیلات سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے اللہ کے گھر جانے کا پروگرام بنا بیٹھیں۔

اللہ اور اس کے پیارے کے گھر جانے کو یقیناً دل چاہ رہا تھا پر سال بھر سے جس خواب کی فینٹسی نے آنکھوں میں ان دیکھے مناظر منجمد کر رکھے تھے وہ تعبیر پانے کے لیے مضطرب تھے۔ میں نے بڑی مسکینی سے اپنی ممیری بہن سے کہا...... ''ابھی تو وقت ہے میں ایک چکر نہ لگا آؤں۔'' پر اللہ کی محبت میں لتھڑی ہوئی میری اس بہن نے میرے لتے لیے۔

''چپکی بیٹھو۔ کمبخت جو وہاں چوٹیوں سے لڑھک وڑھک گئیں کوئی اُنیس اکیس ہو گئی تو سیاپا پڑ جائے گا۔ ہم جو ہزاروں منتوں مرادوں سے وہاں جانے لگے ہیں وہ تو کھٹائی میں پڑ جائے گا۔''

یوں میں اللہ کا چمکتا دمکتا رنگ رنگیلا آنکھوں کو خیرہ کرتا حُسن اور شان دیکھنے کی بجائے اس کے جاہ و جلال اور اس کے محبوب کے الوہی سکون ٹپکاتے جمال سے دل کو ٹھنڈک پہنچاتے گھروں کو دیکھ آئی۔

پر بڑی چنڈال تھی میں بھی اس کے گھر میں بیٹھ کر بھی دھیان کبھی کبھی اس کی شان دیکھنے کی خواہش میں ہچکولے کھانے لگتا۔

اب تیسرا سال آن لگا تھا۔ جیسے کوئی کنواری دوشیزہ اپنے بیاہ کی نامزد تاریخ کا انتظار نہایت بے چینی ذوق وشوق اور لگن سے کرتی ہے۔ بعینہٖ شوکن میلے دی کو بھی جولائی کا انتظار تھا۔

ڈاکٹر بھانجی نے سُنا تو کہنا ضروری سمجھا۔

''آنٹی آپ بلڈ پریشر کی مریض ہیں اتنی بلندی پر آکسیجن کی کمی کا مسئلہ ہو سکتا ہے سوچ سمجھ کر جایئے گا''...... پر میرا جنون کسی بندش تلے نہیں آ رہا تھا چھوڑو دیکھا جائے گا۔

مہرالنسا سیر وسیاحت کی دلدادہ خاتون ڈاکٹر آغا سہیل کی فیملی فرینڈ میرے ساتھ اس وقت شامل ہوئی جب میں ٹکٹ کے لئے پشاور فون کرنے ہی والی تھی۔

چلو یہ اچھا ہوا۔

میں تنہا سفروں کی عادی ہو گئی ہوں۔ پر کوئی ساتھی مل جائے تو کیا بات۔ میاں کی تو تسلی ہو جاتی ہے۔

یہ شام تھی صبح لاہور کی پشاور کے لئے فلائیٹ بک تھی۔ جب اچانک میز پر پڑے باسی اخبار کے شوبز والے صفحے پر داہنے کونے میں سارے پروگرام پر بجلی گرانے والی تین لائنوں کی خبر تھی۔ سرحدی جھڑپوں کی وجہ سے شندھور میلہ ملتوی کر دیا گیا تھا۔ کرسی پر بیٹھے ہوئے افسردگی سے میں نے اپنے آپ سے کہا تھا یہ تو ''ناتی توتی رہ گئی تے اُتے مکھی بہہ گئی'' والی بات ہو گئی ہے۔ اب کیا کروں۔ ملتوی کر دوں۔ بری بات۔ جن شریف لوگوں نے پشاور سے چترال کے ٹکٹ کا بندوبست کیا ہے وہ کیا کہیں گے۔ اب چلو جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

ائیر پورٹ پر نو بجے کی فلائیٹ نے جب ایک بجے ٹیک آف کیا تو میں نے جی بھر کر بچوں کو گالیاں نکالیں۔ جنھوں نے یہ جاننے پر کہ میں کوچ سے پشاور جانا چاہتی ہوں استہزائیہ انداز میں مجھے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔

''آپ پر اب اللہ کا کرم ہے تھوڑا سا اس جندڑی کا بھی خیال کریں کہ جس بیچاری کا آپ نے مشقتوں کی چکی میں پلیتھن کر رکھا ہے۔'' پر یہاں تو وہ بات ہوئی تھی کہ غریبی میں روزے رکھے اور دن بڑے آئے کہ اگر شومئی قسمت سے ہم نے اپنے اوپر ترس کھا ہی لیا تھا تو پی۔آئی۔اے سزا دینے پر تل گئی تھی۔ پورے چار گھنٹے انہوں نے گرگٹ کی طرح جتنے رنگ اور سیاستدانوں کی طرح جتنے بیان بدلے اس کی تفصیل اتنی شاندار نہیں۔ کیا فائدہ زخموں پر نمک چھڑکنے کا۔

بچے جس اہتمام سے میرا ڈولا ائیر پورٹ پر چھوڑ کر گئے تھے سچی بات ہے اس نے بھی میرے پاؤں مقید کر دیئے تھے۔

بہر حال پشاور ائیر پورٹ روڈ پر واقع ریٹائرڈ سکوڈرن لیڈر میر محمد یونس کے گھر کی خاتون خانہ، بیٹیوں اور بہوؤں نے جس محبت، چاہت اور خلوص سے استقبال کیا اس نے شادماں کیا۔ کچھ اس خبر نے بھی از سر نو توانائی بخشی کہ جب خاتون خانہ کے بیٹے نے بتایا کہ اس نے آج کے فرنٹیئر پوسٹ میں میلے کے منعقد ہونے کی خبر پڑھی ہے۔

چترال ائیر پورٹ پر متضاد خبریں تھیں۔ ہوگا۔ نہیں ہوگا۔ نہیں ہوگا کی رٹ زیادہ تھی۔ جس نے ایڈونچر کے مچلتے جذبات صابن کے جھاگ کی طرح بٹھا دیئے تھے۔ ان جذبات کے خاتمے میں جو تھوڑی بہت کسر باقی رہ گئی تھی وہ خیر سے ڈی سی چترال کی سرد مہری نے ختم کر دی کہ تپتی دوپہر میں جب مار دھاڑ کرتی ہم دونوں خواتین اس سے ملنے ڈیڑھ کوس کا فاصلہ پیدل طے کر کے اس کے گھر پہنچیں اپنے دست مبارک سے دو عدد سفر ناموں پر اس کا نام لکھ کر میں نے جانے کیوں یہ سمجھ لیا تھا کہ کتابیں ہاتھ میں تھامتے ہی وہ ہمیں وی آئی پی ٹریٹ منٹ دے گا۔ ڈرائینگ روم کا دروازہ کھلے گا مودب خدمت گار کورنش بجالاتے ہوئے ہمیں ہاتھ لہرا کر صوفوں پر بیٹھنے کے لئے کہے گا مشروب اور چائے سے تواضع ہوگی صاحب ہم سے گفتگو فرمائیں گے اور ہمیں اپنے ہر ممکن تعاون کا پکا پکا یقین دلائیں گے۔ پر ڈیڑھ گھنٹہ اخروٹ کے پیڑ کی گھنی چھاؤں میں بیٹھے بیٹھے

سوکھنے والی بات ہو گئی تھی۔ جب کسی نے منہ نہ لگایا تو نتیجتاً کپڑے جھاڑ کر اٹھے اور لوٹ کر بدھو ریسٹ ہاؤس آئے۔

پہاڑوں میں چھپتی پھرتی شام مجھے بہت افسردہ نظر آئی جبکہ مہر النساء اس سلونی شام پر قربان ہو رہی تھی۔ رات کو پی سی او گئے کہ گھر والوں کو اپنی اطلاع دے دیں۔ آپریٹر بڑا ایبا بچہ تھا میں نے ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کے بارے میں پوچھا۔

ڈاکٹر صاحب چترال کی بڑی علمی، ادبی اور تعلیمی شخصیت ہیں۔ اس بار ان سے ملنا میرے پروگرام میں سرفہرست تھا۔ آپریٹر نے بتایا کہ وہ ابھی پانچ منٹ پہلے اپنی بیگم کے ساتھ یہاں تھے افسوس ہوا۔ ملاقات ہو جاتی تو ملنے کے لئے وقت طے ہو جاتا۔

آخر میں ہمیشہ لیٹ کیوں ہو جاتی ہوں۔ تاسف بھرے لہجے میں یہ سوال میرا اپنے آپ سے تھا۔

بہر حال ان کی رہائش کا پتہ چل گیا۔ وہیں دینین میں ہمارے ریسٹ ہاؤس کے آس پاس ہی رہتے تھے۔ اگلی صبح کوئی نو بجے ہم نے ان کے دروازے کی گھنٹی بجادی بچہ ہمیں عقبی آنگن میں لے گیا جہاں دھان پان سی ایک حسین عورت جس کے صبیح چہرے پر محبت کی چاندنی چٹکی ہوئی تھی نے اٹھ کر ہمیں گلے لگایا اور بٹھایا۔

''ڈاکٹر صاحب میری ہمشیرہ کو لیکر اسپتال گئے ہیں ابھی آتے ہیں۔'' ہم بیٹھ گئے وہ لوبیا بنا رہی تھیں۔ اردو کچھ ٹوٹی پھوٹی بول اور سمجھ سکتی تھیں پر ڈاکٹر صاحب کی چھوٹی چھوٹی بچیاں ماشاءاللہ بڑی ذہین اور فطین نظر آتی تھیں۔

شوخ رنگوں کی کشیدہ کاری سے مزین بستروں پر بچھی سفید چادروں پر ہم کروٹیں بدل بدل کر تھک گئے تھے۔ ان کے طاقوں اور میزوں پر سجی کتابیں پڑھ پڑھ کر بھی اوب سے گئے۔ لوبیا گوشت اور لمبوترے نقش نگار والے نان بھی کھا بیٹھے چائے بھی پی لی جب کہیں جا کر ڈاکٹر عنایت اللہ فیضی کا دیدار ہوا۔

''واللہ آپ لیٹ ہو گئیں کہیں کل آ جاتیں تو ہم آپ کو ایسی جگہ لے جاتے اور ایک ایسی ہستی سے ملاتے جس سے ملنا آپ کے لئے بہت مفید ہوتا۔''

گہرے دکھ اور تاسف کی ایک لہر میری قسمت کو پھٹکارتی زمانوں سے اس کی ہیرا پھیریوں اور کج اداؤں کو لعن طعن کرتی بیک وقت ہونٹوں اور آنکھوں کے راستے باہر نکلی جس میں بولتا اضطراب اور چھلکتا تجسس ڈاکٹر فیضی سے بہت کچھ کہہ گیا۔

''گرم چشمہ کی پری خوان سے ملنے گئے تھے۔''

''پری خوان'' میرے استفہامیہ انداز پر ڈاکٹر صاحب بولے۔

''ہمارے علاقے میں بعض خواتین کو کشف ہوتا ہے ان پر پریاں اور جن آتے ہیں جو انہیں مستقبل کی باتیں بتاتے ہیں۔''

میں نے تعجب سے یہ سب سنا۔ میں عقیدے کے اعتبار سے بڑی کٹر قسم کی توحید پرست ہوں وہمی نہیں جادو وادو پر قطعی یقین نہیں رکھتی۔ یہ اور بات ہے کسی ایسے اللہ والے کی سدا متلاشی رہی ہوں جو دنیاداری کے شیرے میں لتھڑے میرے اس وجود کو دھو دھا کر کھرا کر دے اور شاہ حسین کے ان شعروں کی عملی تفسیر بنا دے۔ کہ جہاں پہنچ کر بندہ کہے:

تانا تونہی بانا تونہی اندر تونہی باہر تونہی

لُو لُو دے وچ تو

پر یا تو میری طلبِ صادق نہیں تھی اور یا پھر صاحب لولاک لوگوں کا قحط ہے کہ جس کسی کے بارے میں پڑھا اور سنا پھر جب اس کی کھوج میں نکلی تو اقبال کے یہ اشعار پڑھتی واپس آئی۔

الٰہی یہ تیرے سادہ لوح بندے کدھر جائیں

کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

عقیدتوں کے چھلکتے جذبات سے پُر الفاظ حروف میں بدل کر نقطوں کی صورت معدوم ہو جاتے کہ ایسی ایسی خوفناک باتیں سننے کو ملتیں کہ بس نیلی چھت پر نگاہیں جما کر اتنا کہتی:

''کسی کی بھی ضرورت نہیں تیرے اور میرے درمیان پردہ کیسا۔کوئی ناطہ اور واسطہ کیوں''۔

یقیناً یہی وجہ تھی کہ میری آنکھوں میں بے اعتباری تھی۔اور یقیناً ڈاکٹر فیضی نے اسے پڑھا تھا تبھی وہ بولے۔

''پڑھی لکھی تو نہیں مگر انگریزی اردو بول سکتی ہے۔زبانیں اس پر وارد ہوتی ہیں''۔

یہ کلمات یہ باتیں کہنے والا کوئی عام آدمی نہیں۔ڈاکٹر فیضی جیسا صاحب علم انسان تھا۔ لہذا بے اعتباری کی تو گنجائش ہی نہ تھی۔ایسی نابغہ اور پہنچی ہوئی شخصیت کا دیدار اور اس کی چند گھنٹوں کی صحبت سے فیض یاب ہونے کیلئے تو چترال کے آخری کونے تک جایا جا سکتا تھا۔گرم چشمہ تو خیر نزدیک ہی تھا۔ایک بار پہلے جا چکی تھی دوسری بار پھر سہی۔

میری اندر کی بے کلی غالباً پھوٹ کر باہر نکلنے کو بے تاب تھی۔اس لئے شندھور زیر بحث آ گیا۔

دراصل کارگل میں casualities کافی ہو رہی ہیں۔ایسے میں میلہ سجانا تو مناسب نہیں لگتا پھر جیسے دفعتاً انہیں کچھ یاد آیا...... ''ارے''.... وہ زور سے کھوار زبان میں منجھلی بیٹی سے مخاطب ہوئے۔ہمارے پاس بیٹھی چھوٹی سی لقی کبوتری تیزی سے اٹھی دوسرے کمرے میں گئی اور پل جھپکتے میں ہاتھ میں کارڈ تھامے واپس آئی ڈاکٹر صاحب کارڈ پر نظریں دوڑاتے ہوئے بولے۔

''لاسپور کی مرکزی وادی ہرچین میں بابائے لاسپور گل ولی خان کے بیٹے کی شادی ہو رہی ہے 10500 فٹ پر ہرچین جایئے شادی میں مقامی کلچر کے بیسیوں رنگوں سے لطف اٹھایئے ۔وہاں سے شندھور جھیل کی ڈرائیو صرف دو،اڑھائی گھنٹے کی ہے''۔

کاغذ فرش پر پھیل گیا اور پنسل ہاتھوں نے تھام لی۔چترال سے ہرچین تک کی اہم وادیاں راستوں کے نشیب و فراز پڑاؤ اور خطرناک مقام کی تفصیلات بمعہ نقشوں کے اس پر کھینچ

گئیں۔

اور جب میں ڈاکٹر فیضی کے گھر سے اٹھی تھی طمانیت اور سرشاری کی لہریں میرے سر یر میں سر سے پاؤں تک رقصاں تھیں۔ کسی اجنبی جگہ کسی اجنبی گھر میں بن بلائے وارد ہو جانا تو میرے لئے کوئی بات ہی نہ تھی۔

ریسٹ ہاؤس میں جونہی داخل ہوئے ایک نئی افتاد منتظر تھی۔ چوکیدار نے بتایا کہ جی ہمارے اپنے محکمے کے لوگ آ رہے ہیں۔ کمرے کل تک خالی ہو جانے چاہئیں۔

اب ہم دونوں بیگ کندھوں سے لٹکائے کسی سستے اور اچھے ہوٹل کی تلاش میں نکلیں۔

چلو یہ بھی غنیمت ہوا کہ زیادہ جُجل خواری نہ ہوئی۔ شاہی مسجد روڈ پر سٹی ٹاور ہوٹل کے رسیپشن پر بیٹھے لڑکے بہت پیبے اور مہذب نظر آئے تھے۔ کمرہ اچھا، کرایہ مناسب اور ماحول بہتر لگا۔ لڑکوں کو لیسی پیسی لگا کر کرایہ میں مزید کمی کروائی۔ شندھور جھیل سے واپسی تک مختصر سامان رکھنے کی شرط منوا کر ہم گویا ہلکے پھلکے ہو کر وہاں سے نکلے۔

چور چوری سے جائے پر ہیرا پھیری سے نہ جائے والی بات میرے ساتھ تھی۔ مفتوں کی عادی مفتوں کی خواہش میں ادھر ادھر تا کا جھانکی سے باز نہیں آتی تھی۔ چھ بجے شام A.K.R.S.P. والوں سے رابطہ کیا کہ انکی کوئی گاڑی بونی یا مستوج جا رہی ہو...... "جی نہیں "...... روکھا سا جواب ملا۔

دوسرا ٹرائل علی الصبح ہوٹل کے سامنے کھڑی پجارو کو دیکھ کر مارا تھا...... "جگہ نہیں"...... سفید چادر میں لپٹی ایک خاتون نے نخوت بھری سرد مہری سے کہا۔

سیدھے سجاؤ پبلک ٹرانسپورٹ میں بیٹھو میاں۔ ہم نے خود سے کہا۔

ہم تو چاہتے تھے کہ سورج کی کرنیں ہم پر بونی جا کر پھوٹیں کہ سفر لمبا تھا اور اس بات کی بھی خاص تاکید کی گئی تھی کہ شوریدہ سر شاہی داس نالے کو سہ پہر سے پہلے پہلے عبور کر لینا ضروری ہے۔ پر ہمارے چاہنے سے کیا ہوتا ہے ہماری مرضی کی اوقات ہی کیا تھی۔

اب اگلی نشستوں کا کرایہ دے کر ہم گاڑی والوں پر یہ رعب ڈالنے کے ہرگز مجاز نہ تھے کہ جلدی چلو۔ وہ چلے تب جب انہیں محسوس ہوگیا کہ اب لوگوں کو سانس لینے میں دشواری ہونے لگی ہے اور عقب سے چند ایک نے کھوار میں یقیناً ڈانٹ بھی پلائی ہوگی۔

دینین سے وادی کاری تک کا راستہ خوبصورتی کے ساتھ ساتھ کچھ کم ظرف بھی تھا کہ بلاوجہ ہی سڑک اور دریا کا بوجھ اٹھا کر بیچارے پہاڑوں کو ایک دوسرے کے گلے لگنے سے روکے بیٹھا تھا وگرنہ وہ بیچارے تو عاشق و معشوق کی طرح لہک لہک کر ایک دوسرے سے چھپیاں ڈالنے کے لئے مضطرب تھے۔ تنگ سی خوبصورت سڑک اور نالے کی صورت لیے دریائے چترال ہی رقیب روسیاہ بنے بیٹھے تھے۔

کوجو پائین اور بالا دونوں خوبصورت تھے۔

راغ سے کوغذی تک چھوٹی چھوٹی وادیاں۔ چشموں سے نہال سبزے سے مالا مال پھولوں پھلوں سے لدی پھندی دکھائی دیں مجھے یاد آیا تھا اسی وادی کے بارے میں کسی نے کہا تھا کوغذی ضرور جائیے۔

میں کدھر کدھر جاواں۔ کوغذی کی مسجد اور مکتب دونوں نے جھک کر داد سمیٹی۔

ایک چھوٹے سے گھر کی چھت پر ایک نوخیز لڑکی کے خوبصورت چہرے نے یوں لشکارا مارا جیسے کوئی برفانی چوٹی سورج کی اولین کرن پڑنے پر لشکارے مارتی ہے۔

ویگن جس تیز رفتاری سے پختہ سڑک پر ڈاک کے گھوڑے کیطرح سرپٹ بھاگی جاتی تھی۔ اسپر اسے سراھے ابھی چند لمحے ہی ہوئے ہونگے کہ گاڑی کی اچھل کود شروع ہوگئی وادی استنگول کے پاس سے تقریباً فرلانگ بھر کا ٹوٹا سیلاب کی چاہتوں کی نذر ہوا پڑا تھا۔

وادی موری لشٹ کے لوگ معلوم ہوتا تھا اللہ میاں کی چاہت میں پور پور ڈوبے ہوئے ہیں کہ گھر کھیت کھلیان سبھی اسکے پڑوس میں بنا رکھے ہیں۔

دریا کے پار برایت بہت بڑا گاؤں ہے اسی گاؤں کے پہاڑوں سے گرم چشمے کو راستہ

نکلتا ہے۔ گرم چشمے کے ساتھ پری خوان کی تصوراتی شکل آنکھوں کے سامنے اُبھری۔

اللہ کی ذات مسبب اسباب ہے جب پیاس ہونٹوں پر تھرکنے لگی جب واش روم جانے کی ضرورت کا احساس ہوا گاڑی برنس میں چائے پانی کے لئے رک گئی۔ سڑک کے کنارے بستا گاؤں جہاں چشمے کا چاندی جیسا پانی کسی آبشار کی صورت اس ہتھ چھٹ طریقے سے گر رہا تھا کہ مچھلی کی طرح ہاتھوں کی اوک پر دو گھونٹ کی صورت میں اُسکا ٹکنا محال ہو رہا تھا۔ زبان گیلی ضرور ہوئی تھی پر اندر سیرابی سے محروم تھا۔ سامنے گھر تھا جسکے آگے خالی جگہ پر زیتونی رنگت والے گندم کے پولے اپنی مخصوص خوشبو نتھنوں میں پہنچا رہے تھے۔

برآمدے میں بچھے چوبی تخت پر ایک حسین مورت چینی کا پیالہ ہاتھ میں تھامے گھونٹ گھونٹ چائے پی رہی تھی۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی اُٹھی میرے ہاتھوں کو اُسنے اپنے ہاتھوں میں تھاما کالے ہاتھوں نے اگر گورے ہاتھوں کے کھردرے پن اور ٹھنڈک کے لمس کو جذب کیا تھا تو وہیں خوبصورت گلابی ہونٹوں سے پھوٹتے کھوار زبان کے میٹھے الفاظ سبز غلافی آنکھوں سے پھوٹتی محبت کی روشنی اور رسیلے چہرے پر بکھرے اپنائیت بھرے احساسات میرے اندر کو گرمانے کے لیے کافی تھے۔ چوبی تخت پر مجھے بٹھانے کے بعد وہ چولہے کی طرف لپکی کہ چائے بنائے۔ میں نے لپک کر اُسکا آنچل تھاما جو شوخ ہرے رنگ پر اودے پھولوں سے اٹا پڑا تھا جسنے شوخی و سادگی کو یکجا کر دیا تھا۔ اُسکا شوہر عبدالقدوس چترال سکاؤٹ کا مجاہد ہنسا اور اردو میں بولا۔

''مہمان ہین چائے بہت ضروری ہے''۔

''چائے کے جھمیلے میں پڑے تو باہر گاڑی والے چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ مہرالنساء بھی میرے پیچھے چلی آئی تھی۔ ہاں البتہ پانی ضرور پلا دیجئے''۔

زبان ضرور اجنبی تھی پر گلابی ہونٹوں سے محبت کا اظہار پھوٹ پھوٹ کر ہو رہا تھا۔ اس اظہار میں میں نے اپنے آپ کو غوطے دیئے۔ ٹھنڈے میٹھے پانی کے دو گلاس پی کر بھی میری تشفی نہ ہوئی پر میں نے تیسرے کی طرف ہاتھ نہیں بڑھایا تھا کہ میرے ساتھ بہت سارے ڈر چمٹے ہوئے

تھے۔ واش روم سے فارغ ہو کر میں باہر آئی تو ویگن کے چیختے چنگھاڑتے ہارن نے چوکنا کر دیا۔ محبت بھری چھپیاں ہاتھوں پر بوسوں کی یلغار اور آنکھوں سے چھلکتے چائے نہ پی سکنے کے تاسف بھرے جذبات نے مہمانداری کی روایت کی عظمت اور افادیت کی مجھ پر لطیف انداز میں عکاسی کی تھی۔ صد ہزار شکر اور احسان اس کلچر اور تہذیب کا کہ جسنے ہمیں ان روایات کا امین ٹھہرایا۔

اجنبی جگہیں اور اجنبی لوگ یادوں کے خزانوں میں یوں جمع ہو جاتے ہیں کہ جب انہیں نکالو وہ لوینڈر کی خوشبو میں مہکتے باہر آتے ہیں۔ ویگن میں بیٹھ کر میں دیر تک اسی سرشاری میں ڈوبی رہی۔

شہر سے چترال کی حدود ختم ہو رہی تھیں اور مستوج کا آغاز ہو رہا تھا۔

لپے پتے گھروں والی وادی ریشن گزری۔ چولہے کی آگ سے سینکی روٹی کو مکھن کے ساتھ لتھیڑ کر دینے والی خاتون یاد آئی۔ سینگ سے بنے ٹاپس اور فاطمہ نے یاد کے جھروکے سے جھانکا۔ ریشن بہت خوبصورت وادی ہے۔ پھر شوگرام بصارت کی زد میں اُبھری۔ ویگن کی رفتار اور ہوائیں بہت تیز تھیں پُرانے منظروں اور یادوں کو بادلوں کیطرح اُڑا لے گئیں۔

کوراغ آنکھوں کے سامنے آ گئی۔ اتنی کھلی اور کشادہ پہاڑ تو لگتا تھا جیسے وادی سے روٹھے ہوئے ہوں۔ نظروں سے انکا تصادم کہیں بہت دور جا کر ہوتا تھا جا بجا اُگی جنگلی جھاڑیاں جن پر لہراتے چھوٹے چھوٹے کاسنی پھول۔

دفعتاً کسی نے کہا تھا۔ ''بونی آ گئی ہے۔'' میں نے اردگرد دیکھا اور مہرالنساء سے کہا۔

''کہاں''

شاہ بلوط کے سرسبز جھنڈوں کے سوا کچھ نظر نہ پڑا۔

کسی پھٹی پُرانی خستہ حال چادر یا بُرقعے کا ایکا ایکی نقاب اُلٹ جائے اور اندر سے ایک حسین مورت موٹی موٹی آنکھیں پٹپٹاتی آپکو اشارے بازی کرتی نظر آ جائے تو آپ سحر زدہ سے اُنگلیاں دانتوں تلے داب لیں گے کچھ ایسا ہی حال میرا تھا کہ معلق پُل کو پار کرنے کے ساتھ

ہی اچھی خاصی عمودی چڑھائی کے بعد گاڑی ایک ایسی کشادہ دورویہ مکانوں سے گھری گلی میں داخل ہوگئی تھی جسکی کچی لپی پتی دیواروں پر پھیلی انگوروں کی بیلیں اپنے چُنے مُنے پھلوں کے ساتھ آنکھوں میں تحیرانہ اور حریصانہ ترغیب دیتے ہوئے زبان کو یہ کہنے پر مجبور کررہی تھیں کہ ہائے یہ انگور ہیں پر کچے ہیں۔ گھروں میں اُگے پھلدار درختوں کی پھیلی شاخیں گلی کے فرش پر دھوپ چھاؤں کے ساتھ آرٹ کے خوبصورت نقش بنا رہی تھیں۔گلی سنسان تھی۔ بہت سارا راستہ چلنے کے بعد کشادگی ہوئی اور گاڑی بازار میں داخل ہوکر باغ بوستان ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ نیچے اُتر کر دیکھا چھوٹا سا بازار چوڑے چوڑے پٹوں کے دروازوں والی چند دوکانیں جن میں بیٹھے دوکانداروں نے پل بھر کے لئے گردنیں اُٹھا کر تو ہمیں ضرور دیکھا پر پھر جیسے اپنے کام میں لگ گئے۔ایسی بُوڑھی عورتوں کو کون اتنی دیر دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو بات تھی۔

ہاں البتہ ایک نوجوان ایڈووکیٹ سراج علی اور چند چھوٹے بچوں نے بہت پذیرائی کی۔ معلومات فراہم کیں جن میں سرفہرست یہ اطلاع تھی کہ ہرچین کیلئے آپکو گاڑی بُک کرنی پڑے گی۔ ''A.K.R.S.P والوں کی کوئی گاڑی اُدھر جارہی ہو؟'' میں باز نہیں آتی تھی۔

''مشکل ہے۔ بہر حال پتہ کرلیں۔''

باغ بوستان ہوٹل کے بڑے سے تخت پر قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے ہمارے درمیان یہ مکالمہ ہوا تھا۔

سخت چلچلاتی دھوپ میں ہم نے وادی بونی کو دیکھا جس حسین انداز میں اس وادی نے لشکارے مارے اُسنے ہمیں خاصا گھائل کیا۔A.K.R.S.P والوں کی مینجمینٹ یونٹ میں گئے تو پتہ چلا کہ کل گاڑی گئی تھی آج کا کوئی چانس نہیں اور جب واپسی ہورہی تھی میرے قدم ٹھٹھک گئے۔

جیسے کسی جنگل میں سنہری گلاب کھلا ہوا ہو........۔اتنی شاندار عمارت کہ جسنے روکا اور جیسے کہا کہ مجھے دیکھے اور سراہے بغیر کہاں جاتی ہو۔ تعارف ہوا کہ یہ اسماعیلی گرلز کا ہاسٹل ہے۔ دیکھنے کی خواہش پر اجازت ملی۔ سبحان اللہ پھولوں سے لدی پھندی کیاریوں اور عمارت کی

ساخت نے بتایا کہ ویرانے میں مشرقی گلاب نہیں بلکہ مغربی گلاب کھلا ہے۔ فرانسیسی ماہرین کا انداز مہارت عمارت کے کونے کونے سے ٹپک رہا تھا۔ کیا کمپیوٹر لیب، کیا انکے سونے کے کمرے، کیا ڈائیننگ ہال، ٹی وی روم اور لائبریری۔ بے طرح رشک آیا اسماعیلی لڑکیوں پر باتھ روم تک فائیو سٹار ہوٹلوں کو شرما رہے تھے۔

وادی بونی کی عشوہ طرازیاں تو باعث تقلید ہیں کہ سترفی صد خواندگی کی شرح ہے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ دونوں کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ کہیں کہیں جماعت اسلامی کے دانے بھی سرگرم عمل ہیں۔ گورنمنٹ سوشل ویلفیئر پروگرام کے تحت لڑکیوں کو سلائی کڑھائی الیکٹرک اور الیکٹرونک کے کاموں میں ماہر کیا جاتا ہے۔

باغ بوستان ہوٹل میں بوستان وگلستان والی کوئی بات نہیں تھی۔ پنجاب کے ٹال ہوٹلوں والا منظر تھا۔ بڑے سے چوبی تخت پر بیٹھ کر بینگن آلو کا سالن کٹا ہوا پیاز اور گرم تندوری روٹی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایڈووکیٹ سراج علی جس گاڑی والے کو لے کر آئے اُسنے اگر پھٹی پُرانی لیراں لگی جینز شرٹ پہنی ہوتی تو سو فیصد ہم اُسے برٹش۔ اٹالین یا اسٹریلین خیال کرتے۔ پر اسکے تن پر شلوار قمیض تھی وہ اُردو میں بات کر رہا تھا۔ اور نام تھا اُس کا ارشاد بابا۔

دھوپ کے جاہ وجلال اور رعب و دوب کا تو یہ عالم تھا کہ اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا محال ہو رہا تھا۔ ارشاد بابا نے ایک ہزار مانگا تھا۔ آٹھ سو پر بات طے ہوئی۔ جیپ ضرورت ایجاد کی ماں ہے کی عملی تفسیر پیش کر رہی تھی۔ ماشاء اللہ سارا تانا بانا لوہے کے راڈوں پر کھڑا اور بیٹھا ہوا تھا comfort نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ قہر درویش بر جان درویش والی صورت حال تھی۔ صبر شکر کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا سو بیٹھ گئے۔ بونی تک بہت اچھی کارپیٹڈ روڈ تھی۔ اب کچی سڑک پر سفر شروع ہوا تھا۔ آوی کے بعد چھوٹے موٹے کئی گاؤں گزرے۔

ہی اچھی خاصی عمودی چڑھائی کے بعد گاڑی ایک ایسی کشادہ دورویہ مکانوں سے گھری گلی میں داخل ہوگئی تھی جسکی کچی لپی پتی دیواروں پر پھیلی انگوروں کی بیلیں اپنے چُنے مُنے پھلوں کے ساتھ آنکھوں میں تحیرانہ اور حریصانہ ترغیب دیتے ہوئے زبان کو یہ کہنے پر مجبور کر رہی تھیں کہ ہائے یہ انگور ہیں پر کچے ہیں۔ گھروں میں اُگے پھلدار درختوں کی پھیلی شاخیں گلی کے فرش پر دھوپ چھاؤں کے ساتھ آرٹ کے خوبصورت نقش بنا رہی تھیں۔گلی سنسان تھی۔ بہت سارا راستہ چلنے کے بعد کشادگی ہوئی اور گاڑی بازار میں داخل ہوکر باغ بوستان ہوٹل کے سامنے رُک گئی۔ نیچے اُتر کر دیکھا چھوٹا سا بازار چوڑے چوڑے پٹوں کے دروازوں والی چند دوکانیں جن میں بیٹھے دوکانداروں نے پل بھر کے لئے گردنیں اُٹھا کر تو ہمیں ضرور دیکھا پر پھر جیسے اپنے کام میں لگ گئے۔ایسی بُوڑھی عورتوں کو کون اتنی دیر دیکھتا ہے۔ یہ بھی تو بات تھی۔

ہاں البتہ ایک نوجوان ایڈووکیٹ سراج علی اور چند چھوٹے بچوں نے بہت پذیرائی کی۔ معلومات فراہم کیں جن میں سرفہرست یہ اطلاع تھی کہ ہرچین کیلئے آپکو گاڑی بُک کرنی پڑے گی۔ ''A.K.R.S.P والوں کی کوئی گاڑی اُدھر جا رہی ہو؟'' میں باز نہیں آتی تھی۔

''مشکل ہے۔ بہر حال پتہ کرلیں۔''

باغ بوستان ہوٹل کے بڑے سے تخت پر قہوے کے چھوٹے چھوٹے گھونٹ بھرتے ہوئے ہمارے درمیان یہ مکالمہ ہوا تھا۔

سخت چلچلاتی دھوپ میں ہم نے وادی بونی کو دیکھا جس حسین انداز میں اس وادی نے لشکارے مارے اُسنے ہمیں خاصا گھائل کیا۔A.K.R.S.P والوں کی مینجمنٹ یونٹ میں گئے تو پتہ چلا کہ کل گاڑی گئی تھی آج کا کوئی چانس نہیں اور جب واپسی ہو رہی تھی میرے قدم ٹھٹھک گئے۔

جیسے کسی جنگل میں سنہری گلاب کھلا ہوا ہو.........۔اتنی شاندار عمارت کہ جسنے روکا اور جیسے کہا کہ مجھے دیکھے اور سراہے بغیر کہاں جاتی ہو۔ تعارف ہوا کہ یہ اسماعیلی گرلز کا ہاسٹل ہے۔ دیکھنے کی خواہش پر اجازت ملی۔ سبحان اللہ پھولوں سے لدی پھندی کیاریوں اور عمارت کی

ساخت نے بتایا کہ ویرانے میں مشرقی گلاب نہیں بلکہ مغربی گلاب کھلا ہے۔ فرانسیسی ماہرین کا انداز مہارت عمارت کے کونے کونے سے ٹپک رہا تھا۔ کیا کمپیوٹر لیب، کیا انکے سونے کے کمرے، کیا ڈائینگ ہال، ٹی وی روم اور لائبریری۔ بے طرح رشک آیا اسماعیلی لڑکیوں پر باتھ روم تک فائیو سٹار ہوٹلوں کو شرما رہے تھے۔

وادی بونی کی عشوہ طرازیاں تو باعث تقلید ہیں کہ سو فی صد خواندگی کی شرح ہے۔ پیپلز پارٹی اور مسلم لیگ دونوں کے جھنڈے لہراتے ہیں۔ کہیں کہیں جماعت اسلامی کے دانے بھی سرگرم عمل ہیں۔ گورنمنٹ سوشل ویلفیئر پروگرام کے تحت لڑکیوں کو سلائی کڑھائی الیکٹرک اور الیکٹرونک کے کاموں میں ماہر کیا جاتا ہے۔

باغ بوستان ہوٹل میں بوستان وگلستان والی کوئی بات نہیں تھی۔ پنجاب کے ٹال ہوٹلوں والا منظر تھا۔ بڑے سے چوبی تخت پر بیٹھ کر بینگن آلو کا سالن کٹا ہوا پیاز اور گرم تندوری روٹی کھا کر اللہ کا شکر ادا کیا۔

ایڈووکیٹ سراج علی جس گاڑی والے کو لے کر آئے اُسنے اگر چھٹی پرانی لیراں لگی جینز شرٹ پہنی ہوتی تو سو فیصد ہم اُسے برٹش۔ اٹالین یا اسٹریلین خیال کرتے۔ پر اسکے تن پر شلوار قمیض تھی وہ اُردو میں بات کر رہا تھا۔ اور نام تھا اُس کا ارشاد بابا۔

دھوپ کے جاہ وجلال اور رعب و دوب کا تو یہ عالم تھا کہ اُسکی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنا محال ہو رہا تھا۔ ارشاد بابا نے ایک ہزار مانگا تھا۔ آٹھ سو پر بات طے ہوئی۔ جیپ ضرورت ایجاد کی ماں ہے کی عملی تفسیر پیش کر رہی تھی۔ ماشاء اللہ سارا تانا بانا لوہے کے راڈوں پر کھڑا اور بیٹھا ہوا تھا comfort نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ قہر درویش بر جان درویش والی صورت حال تھی۔ صبر شکر کے سوا کوئی چارہ کار نہ تھا سو بیٹھ گئے۔ بونی تک بہت اچھی کارپیٹڈ روڈ تھی۔ اب کچی سڑک پر سفر شروع ہوا تھا۔ آدی کے بعد چھوٹے موٹے کئی گاؤں گزرے۔

گاڑی اسوقت ڈھلانی چڑھائی پر تھی آگے بلائنڈ موڑ تھا اور یہ منڈاغ کی وادی تھی۔

دفعتاً میں نے نیچے دیکھا۔ ''خدایا'' میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ منظر کسی حسین و جمیل تابناک چہرے کے رُخسار پر سیاہ تل کی صورت میں چمک رہا تھا ''گاڑی روکو ارشاد بابا رُک جاؤ کہ اس نظارے کو آنکھوں میں جذب کئے بغیر آگے نہیں جایا جاسکتا۔'' سڑک کے کناروں پر پڑے بڑے بڑے پتھروں پر بیٹھ کر میں نے مہر النساء سے کہا ''ذرا دیکھو تو ہر چیز کتنی مناسبت کے ساتھ ایک تناسب میں ڈھلی ہوئی ہے۔ کشیدہ قامت صنوبر کے درختوں کی اُونچائی۔ پھلدار درختوں کی متوازی قطاریں۔ چاندی بہاتا دریائے مستوج گھروں کی عمودی چھتیں۔ گندم کے زعفرانی کھیتوں کے سلسلے پس منظر میں سیاہ پہاڑوں پر جمی برف نیلا آسمان اسپر چمکتا سورج اور لطیف ہواؤں میں جھولتی جھومتی ہر شے۔'' میرا جی وہاں ساکت ہو جانے کو چاہتا تھا۔ لمحے بیت گئے۔ میری آنکھوں میں چھلکتی دید کی ہوس کسی طرح سیر نہیں ہو رہی تھی بس نہ چلتا تھا کہ کیسے اس سین کو اُٹھا کر آنکھوں کی پتلیوں میں منجمد کرلوں۔ چونکی، ارشاد بابا نے کہا۔

''اب چلیئے آپنے چائے کے لیے بھی رکنا ہے اور داس نالے کو دن کی روشنی میں پار بھی کرنا ہے۔''

میرا اگرام نمبرا سے گزرتے ہوئے میں سوچ بھی نہ سکتی تھی کہ کل اس وادی میں آنے یا نہ آنے کے بارے میں میں گومگو کا شکار رہوں گی۔

پرواک نوروز ہوٹل میں چائے کے لئے رُک گئے۔ چائے ذائقہ دار تھی۔ ہوٹل کے چھوٹے سے کمرے کے سامنے چارپائیاں بچھی تھیں تیز ہوائیں اب تمازت سے نکل کر لطافت کی حدوں میں داخل ہو رہی تھیں اور جسم و روح کو سرشار کر رہی تھیں۔ ایسے میں چائے کے گرم گھونٹ کتنی بڑی نعمت خداوندی تھے۔

''دیکھئے اپنی دائیں جانب'' ارشاد بابا کی آواز میری سماعت سے ٹکرائی اور میری آنکھوں نے دیکھا سورج کی سنہری کرنوں میں چاندی کی طرح چمکتا طویل و عریض دریائے یار

خون دریائے لاسپور سے گلے مل رہا تھا وصال کا یہ منظر بہت دلفریب تھا۔

مجھے یاد آیا تھا۔ چترال میں کسی نے کہا تھا مستوج ضرور جانا بہت خوبصورت وادی ہے۔ پی۔ٹی۔ڈی۔سی یہاں شاندار موٹل بنا رہی ہے۔ مہتروں کا قلعہ گو بڑھاپے کی شکستہ حالی سے دوچار ہے۔ پر پھر بھی جوانی کی رعنائی کا اندازہ لگانا کچھ مشکل نہیں۔ درہ بروغل کو راستہ مستوج سے ہی جاتا ہے۔ مستوج کو میں کہنی مار کر آگے بڑھ رہی تھی۔

ارشاد بابا بتا رہا تھا۔ ''وادی یارخون کے پاس واقع درہ بروغل پاکستان کو تاجکستان اور چین سے ملاتا ہے۔''

بروغل درے کے ذکر نے گویا مجھے مضطرب کر دیا تھا۔ کاش میں اس درے سے سفر کرتی ہوئی واخان جانکلتی ان سب لوگوں سے ملتی جو ۱۹۱۷ کے روسی انقلاب کی بھینٹ چڑھتے چڑھتے کسی طرح بچ بچا کر بروغل کی گھاٹیوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے۔ بہت قانع، فطرت کے قریب یہ معصوم سے لوگ جنہیں موسم کی سختیاں رزق کی تنگیاں کچھ بھی پریشان نہ کرتیں۔ موسیقی جنکا اوڑھنا بچھونا ہے۔ جو شدید طوفانی موسموں میں اپنے اونی خیموں میں جلتی آگ کے گرد بیٹھ کر رباب بجاتے ہوئے قدیم فارسی کی غزلیں اس ترنم سے گاتے ہیں کہ بندے کا سانس رُکنے لگتا ہے۔

میں واپسی پر مستوج رکوں گی۔

میری سیاحت کی تشنہ آرزوئیں میرے اندر سے نکل کر باہر سڑک پر برہنہ پا مجھے اُکسانے لگیں۔

جانے کن جتنوں سے تسلیوں کے پیرہن پہنا کر میں نے انہیں قابو کیا۔

دریائے لاسپور کے کنارے چھوٹی سی وادی شہید اس میں گاڑی شاید خراب ہی اسی لیئے ہوئی تھی کہ اُس گھر میں اُگے پھلدار درخت جانے کب سے ہمارے نام کی خوبانیاں اور شہتوت اپنے ہاتھوں میں سنبھالے کھڑے تھے۔ گاڑی سے اُتر کر میں ہنستے مسکراتے کہ ''چلو ایک

اور گھر کو دیکھیں گے'' والے احساسات لئے اسماری خان کے گھر داخل ہوئی تھی۔ اس گھر کے عُمر رسیدہ مرد عظیم خان نے جس محبت سے خوش آمدید کہا اُس گھر کی خاتون اور بچوں نے جس انداز میں ہمارے لیئے دیدہ و دل فراش کیئے خدا گواہ ہے اُسکی یاد آج بھی میری آنکھوں میں کسی خوشگوار پھوار کی صورت میں اُتر کر انہیں گیلا کر دیتی ہے۔ ارد گرد پس و پیش کی ساری زمین اس خاندان کی تھی جسکا سربراہ سعودیہ میں تھا۔ مہمان خانہ جدیدیت کے رنگ میں رنگا ہوا تھا مگر اصلی چترالی گھر اپنی روایتی آن بان کے ساتھ ہو بہو ویسا ہی تھا۔ اُلٹی کون کی صورت درمیان سے نکلی چھت ایک فٹ چوبی تختوں سے چار حصوں میں منقسم کمرہ جہاں بچھی پرالی پر رکھے گدوں پر حسب مراتب گھر کے افراد کے بیٹھنے اور لیٹنے کے انتظامات۔ وسط میں جلتا چولہا۔

ہم باہر آ گئے تھے۔ مجھے نماز پڑھنی تھی۔

مہمان خانے کے عین سامنے باغ میں خوش رنگ پھول کھلے تھے۔ دبیز گھاس کا قالین کہ جس پر نماز کے لئے کپڑا بچھانا مجھے یوں محسوس ہوا جیسے کسی معصوم صورت بچے کی معصومیت پر شک کیا جائے۔ نماز میں نے اسی قدرتی قالین پر پڑھی اور جب دُعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے تو سامنے پر ہیبت پہاڑ کچھ یوں نظر آئے جیسے میرے ماتھے سے اپنا ماتھا لڑا دینا چاہتے ہوں۔

جب کھڑے ہو کر رخ پھیرا تو باغ میں کرسیاں بچھ چکی تھیں۔ کشیدہ کاری سے مزین میز پوش پر رکھی خوبانیاں اور توتوں کی صورت انکار سیلا پن ذائقہ اور خوشبو سبھی نظر و دہن کو للچا رہے تھے۔ شام کی ٹھنڈی ہوائیں فضا کو جنت بنانے کی پوری تگ و دو میں تھیں۔ پہاڑوں کے بے ہنگم سلسلے نے اگلے منظر کو آشکارا ہونے سے روک دیا تھا۔ پشت پر سیاہ بلند و بالا پر ہیبت سلسلے اندھیرے کی چادر اوڑھ کر خود کو اور زیادہ خوفناک بنا رہے تھے پر سامنے کی چوٹیوں پر جیسے سُورج سونے کے تھال پر تھال لٹا رہا تھا۔

ہرے بھرے تر د تازہ سہ طرف پھیلے سبزے سامنے کیاریوں میں اُگے پھول اور زعفران کے پودوں کی دید نے جیسے میری آنکھوں کی ساری تھکن کو بلاٹنگ پیپر کیطرح جذب

کرتے ہوئے اُسے تازگی اور فرحت کا احساس بخشتا تھا۔

سڑک سے بہت نیچے روانیوں سے بہتا دریائے لاسپور کا شور اس خاموشی سے پُر سناٹے میں بہت اچھا لگ رہا تھا۔

رس بھری خوبانیاں جونہی زبان پر رکھیں بے اختیار میری نگاہوں نے نیلے وسعتوں بھرے آسمان کیطرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کو تو نے کیسے مالا مال کر رکھا ہے۔

سمارٹ رہنے اور نظر آنے کا شوق خود ہی ہاتھوں کے ساتھ ساتھ زبان کو بھی لگام دے ڈالتا ہے۔ مہرالنساء اگر یہ اظہار نہ بھی کرتی کہ خوبانیوں کی زیادتی پیٹ کو اپ سیٹ کرتی ہے میں نے چند دانوں کے بعد ہی ہاتھ کھینچ لینا تھا۔

پھر جیسے اُس خاموش سے گھر میں اچانک ہی چادروں میں لپٹی چند عورتیں اور تتلیوں کیطرح ہنستے مسکراتے رنگین کپڑوں کی صورت میں رنگوں کی پچکاریاں اُڑاتے خوبصورت گل گوتھنے سے بچے چھوٹی سی راہداری پر جسکے دونوں اطراف چھوٹی سی باڑتھی پر مینڈکوں کیطرح پھدکتے نمودار ہوئے۔ یہ اسماری خان کی بھاوج اور انکی چھوٹی بہنوں کے پریوار تھے۔ تحریم رحمان زچگی کے بعد بچہ گود لے کر پہلی بار انکے ہاں آئی تھیں۔ دنیا میں وارد ہونے والے اس نئے مہمان کو ہم دونوں نے اشتیاق سے دیکھا۔ پیارے سے بچے کی ساری پیشانی اور رخسار بکری کے جلے سینگوں کی راکھ سے بنائے تلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ یہ مقامی کلچر کا ایک حصہ ہے جسے ہر پیدائشی بچے کی روئیں صاف کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا ہے۔ جیسے کبھی پنجاب میں آٹے کی مروڑی بنا کر نوزائیدہ کے چہرے پر روؤں کی صفائی کے لئے رگڑا جاتا تھا۔

آنے والی یہ فیملی پڑھی لکھی تھی۔ تحریم رحمان ہرچین سے آگے بروک سکول میں پڑھاتی تھیں۔ سوغات کے طور پر آنے والے مہمان سناباچی کی ڈش بنا کر لائے تھے۔ نمکین پنیر اور زعفران کے آمیزے سے بنا ہوا یہ کھانا ہمیں بھی چکھایا گیا۔ اب دہن اس ذائقہ سے ناآشنا بھلا

کیالذت لیتا۔

مگر یہ پلیٹ جب ارشاد بابا کو پیش کی گئی میں نے دیکھا تھا رغبت، شوق اور والہانہ پن اُسکے چہرے اور ہاتھوں کے ایک ایک عضو سے ٹپکا تھا۔ وہ مزے سے اُسے کھا رہا تھا اور اب اُسے نہ داس نالے کا فکر تھا اور نہ شام گہری ہونے کا۔

سچی بات ہے داس نالے کو دیکھ کر تو میں یہ کہنے پر مجبور ہو گئی تھی۔

بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا

جو چیرا تو اک قطرہ خون نکلا

''اللہ ارشاد تم نے تو اسے ہوا بنا دیا تھا۔''

اور جواباً ارشاد بابا نے بھی طنزیہ ہنکارہ بھرا۔ ''جی ہاں آپ کی خوش قسمتی ہے کہ آج کل اسکے بہاؤ میں اتنی شدت نہیں وگرنہ یہ اگر بپھر جائے تو یادگار سبق سکھا جاتا ہے۔'' لاسپور اور رمن کی وادیوں کے درمیان دائنی طرف کے پہاڑ کسقدر سیاہ، پُر ہیبت اور خوفناک تھے۔ انکی چوٹیوں پر چمکتے جلوے دکھاتے برف کے تودے جس انداز میں نیچے آ رہے تھے اسنے تجریدی آرٹ کی کئی صورتیں بنا ڈالی تھیں۔ یوں لگتا تھا جیسے کلاشنکوفوں سے لیس کمانڈوز سیاہ ڈانگریاں پہنے قدرت کے ان عجوبوں کی حفاظت کیلئے پہرے پر مستعد ہوں۔ خدا گواہ ہے اس منظر میں اتنی وحشت تھی اور میں اُسی طرح لرزی تھی جیسے ہیگرڈ کی شی کا ہور اس ہولی پر اسرار دنیا کی خوفناکیوں پر لرزا تھا۔

اور جب سے ہمک ہمک کر جھٹپٹے کی گود میں جانے کے لئے مچل مچل پڑ رہا تھا اور لاسپور کی مرکزی وادی ہر چین ہماری نظروں میں تھی گاڑی پنکچر ہو گئی تھی۔ چلو پنکچر ہونے والی کسر باقی رہ گئی تھی سو وہ بھی پوری ہوئی۔

میں تو باہر پتھروں پر بیٹھ کر فطرت سے باتیں کرنے لگی۔ ہاں البتہ مہر النساء نے فی الفور اپنی خدمات پیش کیں دراصل خود ڈرائیو کرنے کی وجہ سے مہر النساء ان تجربات سے گزرتی

رہتی ہے۔

دو ڈھائی کلو جیک نے پل بھر میں منوں وزنی گاڑی کو اپنے اوپر یوں اٹھا لیا جیسے ہمارے ہاں کی عورت سسرال کی سیڑھی چڑھتے ہی پوری گھر ہستی کا بوجھ اپنے ناتواں کندھوں پر اٹھا لیتی ہے۔

گل ولی خان کے گھر کی چڑھائیاں چڑھنے سے قبل دو رویہ درختوں کی چھتنار سے گزرتے ہوئے فضا نے اندھیرے اور رات پڑ جانے کا تاثر دیا پر جب ڈھیلی ڈھالی انجر پنجر ہلی جیپ قلقاریاں بھرتی پھرتیوں سے چڑھائیاں چڑھ کر وسیع و عریض سبزے سے لدے پھندے قطعے میں جا کھڑی ہوئی تو میٹھے میٹھے اُجالے میں گھاس کے وسیع و عریض قطعے سیبوں کے باغ درختوں سے بندھے لکڑی کے ڈنڈوں سے چمٹے بجلی کے قمقمے، گیسٹ ہاؤس کی عمارت اسکے سبز دروازے اور لان میں بچھی بے شمار سرخ و نیلی کرسیاں جو اپنی موجودگی سے یقیناً کسی ہنگامے کسی تقریب کے انعقاد یا خاتمے کا پتہ دیا کرتی ہیں جیسے مناظر نے بصارت کو اتنی رعنائی اور دلربائی دی کہ ساری تھکن اُڑنچھو ہو گئی۔

نوشے میاں برخوردار قسم کا رعنا جوان تھا۔ اُسنے جس انداز میں ہماری پذیرائی کی اور جو الفاظ کہے انہوں نے مجھے پنجاب کے کسی گاؤں کی پوپلے منہ والی مشفق سی بوڑھی عورت کی یاد دلائی جو اپنی دہلیز پر کھڑے کسی اجنبی کو جم جم آیا، جی صدقے ست بسم اللہ کہتے ہوئے اُسے ہاتھ سے تھام کر اپنے کشادہ آنگن میں بچھی سوتری چارپائی پر بٹھاتی ہے پھر بیٹی یا بہو کو لسی لانے کے لئے آوازیں دیتی ہے مہمان اگر خفت کا اظہار کرے تو کہتی ہے "پھوٹ پتر بستے رستے گھروں میں مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں۔"

گیسٹ ہاؤس کا کمرہ راحت اور آرام کے سبھی سامان سے لیس تھا۔ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر جب رُخ پھیرا تو ٹرے میں بجی چائے اور بسکٹ دولہے میاں کی محبت بھری باتوں کے ساتھ منتظر تھے۔ دولہا پشاور یونیورسٹی کا پوسٹ گریجوایٹ تھا میرا گرام نمبرا کی جس دلہن کو بیاہ

کر لا رہا تھا وہ بھی ماشاء اللہ ایم ۔اے اسلامیات تھی اور کسی سکول میں پڑھاتی بھی تھی۔ خوب خوب باتیں ہوئیں۔

رات کے پہلے پہر جہاں نشست جمی وہ چترالی گھر کا ایک چھوٹا سا کمرہ تھا۔ جسکی کچی دیواریں نفاست سے لپی پتی تھیں ۔گل ولی خان جنہیں بابائے لاسپور کہا جاتا ہے بلا مبالغہ ساڑھے چھ فٹی قامت پر آریائی نقش ونگار لئے خاصی مہربان اور حلیم سی شخصیت نظر آئے تھے۔ انہیں بُخار تھا اور وہ حیرت زدہ سے تھے کہ اُنکا پنڈا تو زندگی بھر بیماری یا تپ نام کی ایسی چیزوں سے نامانوس رہا ہے کل بیٹے کی بارات ہے بھلا ایسے سمے تن پر اس اجنبی مہمان کا کیا کام۔

ہم ہنس پڑے تھے صاحب خانہ جتنے قوی الجثہ تھے خاتون خانہ دولت بیگم اُتنی ہی ضعیف الجثہ تھیں چہرے پر زمانے بھر کی ملائمت اور نرمی گھلی ہوئی۔گل ولی خان سے میرے اس سوال پر کہ کچھ یہاں کی تاریخ کا تذکرہ ہو جائے انکے نمبر دو بیٹے نے نخوت سے کہا۔

''چھوڑیئے جی تاریخ میں کیا پڑا ہے۔'' اور کھٹ سے ٹی وی آن ہو گیا۔انڈیا کی پارلیمنٹ کا افتتاحی اجلاس ہو رہا تھا۔فاصلے سمٹ گئے ہیں اور دُنیا واقعی گلوبل ولیج کی شکل اختیار کر گئی ہے کہ 10500 فٹ کی بلندی پر بیٹھی میں پوری دُنیا میں کیا ہو رہا ہے دیکھ سکتی تھی۔

باہر گاؤں کی عورتیں دورویہ قطار میں بیٹھی کھانا کھا رہی تھیں میرے باہر نکل کر انکے ساتھ بیٹھنے اور کھانے کی خواہش کو اُنکے نمبر دو بیٹے نے پذیرائی نہیں دی۔ کمرے میں باتوں کا سلسلہ خاصا کھُلا ڈلا تھا۔ بیٹوں کو باپ کی دوسری شادی پر بڑا اعتراض تھا۔ بابائے لاسپور بھی اپنی اس غلطی پر متاسف سے نظر آتے تھے۔

دستر خوان پر کھانا رکھنے آفتابوں سے ہاتھ دھلانے اور کھانے کے دوران سب سے بڑا بھائی امیر اللہ خان زیر بحث تھا جسے گھر بدر کیا ہوا تھا وجہ بس یہی اسکی دوسری شادی تھی شاید گل ولی خان اپنے تلخ تجربے سے اولاد کو گزارنا نہیں چاہتے تھے مگر اب اسکا کیا علاج اے چارہ گر۔

پھر کہیں جیسے دور سے ہواؤں کے دوش پر لہراتی بل کھاتی سرنئی اور ڈھول کی آوازیں

اُس چھوٹے سے کمرے میں داخل ہو کر ہماری سماعت سے ٹکرائیں میں نے دیکھا تھا گل ولی خان کے ہونٹ انکا چہرہ انکی آنکھیں بڑی مسرت اگیں پھوار میں جیسے نہا گئے ہوں۔مقدر کے بغیر اولاد کی خوشیوں کی تکمیل نہیں دیکھی جاتی یقیناً وہ بختاور تھے۔

میرے تو بے حد چہیتے کزن اور دیور کو یہ سب دیکھنا نصیب نہ ہوا۔عین جوانی میں بھریا میلہ چھوڑ کر یوں چلے گئے جیسے وہ بس دنیا میں ہاتھ لگانے ہی تو آئے تھے۔

پھر یہ محفل برخاست ہوئی کہ انھوں نے کہا آپ اب جائیے اور رقص و موسیقی سے لطف اندوز ہوں آپ کے ساتھ اب کل نشست ہوگی۔

باہر ہولناک تاریکی تھی مہر النساء بس مجھے ایک ہیولے کی صورت نظر آ رہی تھی خدا کا شکر تھا کہ جو عورت بطور گائیڈ ساتھ تھی اسکے ہاتھ میں ٹارچ بھی تھی اور وہ خاصی تیز طرار بھی تھی۔وگرنہ اس رات کھائیوں کھالوں میں گٹے گوڈے ٹوٹنے کوئی بڑی بات نہ تھی۔کھالے کو چھلانگ لگا کر پار کرتے ہوئے ایک بار تو دھڑام سے گری بھی بس شکر کہ بچ بچاؤ ہو گیا کیونکہ خاتون نے پھرتی کے ساتھ مجھے سنبھال لیا تھا مہر النساء پھونک پھونک کر قدم رکھنے کی قائل ہے اسلئے اُس کے ساتھ ہمیشہ خیریت رہتی ہے۔

بجلی کے قمقمے ان قطعوں پر پھیلی رات کے چہرے پر پڑی دبیز نقاب کو سرکانے میں بس اتنے ہی کامیاب ہوئے تھے کہ کچھ کچھ چہرہ شناسی ہو رہی تھی۔

لوگوں کے ہجوم سے کچھ یوں دکھتا تھا کہ جیسے راگ ورنگ کی اس محفل سے محظوظ ہونے کے لئے ساری وادی اکٹھی ہو گئی تھی معززین کرسیوں پر اور لڑکے بالے گول دائروں میں بیٹھے یا کھڑے تھے۔گیسٹ ہاؤس کی ڈھلانی شیڈوں پر لڑکیاں اور چھتوں پر رنگین اور سفید چادروں میں لپٹی عورتیں مٹے مٹے جلوے دکھا رہی تھیں۔سازندے ڈھول، سرنئی اور ڈماما بجا رہے تھے۔اور زرگار احمد خان گول دائرے میں چکر کاٹتے ہوئے ہاتھوں سے اشارے دیتا انہیں ہدایات دے رہا تھا۔

اس رات میں نے موسیقی کی خوبصورت دھنیں سنیں ان دھنوں پر رقص ہوتے دیکھا۔ مقامی معیار کے حساب سے خوش بگین دھن اگر نرم ندی کے سبک خرام پانیوں کیطرح دھیمے مزاج والی تھی تو ساوٗز اتنی تیز تھی کہ اسپر رقص کرنے والا گروپ ٹھنڈ کے باوجود پسینہ پسینہ ہوا ہوگا۔ بروازی کی دھن پر اکیلے رقص بھی دیکھا اور روایتی چوغوں کے ساتھ تین آدمیوں کا بھی۔ پھر بڑی پر سوزی دُھن بجنی شروع ہوئی۔ دنی کی مشہور شب دراز دھن۔ کسی نے بتایا تھا۔ شوقے اور ٹوبیوں میں بارہ لوگوں کا ایک گروپ دھیمے دھیمے ناچ کے انداز میں قدم اُٹھاتا دائرے میں داخل ہوکر دائرے میں مجسم ہوا۔ انکی ہم آہنگ زبان میں ایک گیت فضا میں بکھرا اور رقص شروع ہوا۔ کبھی تیز کبھی مدھم کبھی اوپر کبھی نیچے۔ کھلے آسمان تلے ملگجی روشنیوں میں رات کے اس پہر یہ سب کس قدر اچھا لگ رہا تھا۔

میں سر شام سونے کی عادی دو بج گئے تھے محفل اپنے جوبن سے اختتام پر اُتر رہی تھی۔ نیند نے مکڑی کیطرح میری پتلیوں پر جالا بُننا شروع کر دیا تھا بارہ سالہ نسیمہ نے ہاتھ پکڑ کر رہبری کی اور یوں میں خواب گاہ تک آئی۔ ماشاءاللہ مہر النساء جانے کب کی کمرے میں آ کر پُر لطف نیند کے مزے اُڑا رہی تھی۔

بستر آرام دہ تھا۔ رضائی نئی تھی شاید اسی لئے میں نے تکئے پر سر رکھا اور پل جھپکتے میں کسی چھوٹے سے بچے کی طرح نیند کی بانہوں میں چلی گئی۔ حسب معمول بہت سویرے آنکھ کھل گئی۔ مہر النساء نماز سے فارغ ہوکر دوبارہ لیٹ گئی تھی۔ باتھ روم میں پانی اتنا ٹھنڈا تھا کہ وضو تو بس گیلے پانی کا ایک طرح تیمم ہی تھا۔ اللہ مجھے معاف کرے میں نے اپنے آپ سے کہا۔

''نماز تو میں کُھلے نظاروں کی چھاؤں میں ہی پڑھوں گی۔''

دروازہ کھول کر باہر آئی۔ جس جگہ رک کر میں نے گردوپیش کو دیکھا تھا مجھے محسوس ہوا تھا کہ جیسے میرے قدموں کو کسی نے جکڑ لیا ہو۔ یہ ممکن ہے کہ کائنات کے رب نے جتنی پاکیزگی اور حُسن کائنات کو بخشا ہو اسکا عشر عشیر بھی یہاں نہ ہو پر ان نظاروں کو دیکھتے ہوئے مجھے اپنی نگاہوں

کی کثافت اور آلودگی کا احساس ہوا تھا کہ وہ فی الفور کانپ کر جھک گئی تھیں شاید ڈرتی تھیں کہ اُنکا میلا پن فضا میں تحلیل ہو کر اُسے آلودہ نہ کر دیں۔ میں نے گھاس پر اپنا ماتھا ٹیک دیا تھا شدت جذبات سے میرے آنسو نکل پڑے تھے۔ پھر میری نگاہیں ٹھہر ٹھہر کر اُٹھیں انہوں نے شفاف نیلے نکور آسمان کے اُجلے پن میں ایک شان استغنا دیکھی پہاڑوں کے سینوں سے اُمنڈتا دبدبہ اور رعب زمین کے سینے پر بچھی گھاس، پچھوا کا ہولے ہولے ہلکوروں کے ساتھ چلنا اور کشیدہ قامت درختوں کا بانکپن۔ فضا پر چھایا سناٹا جسے توڑتی چشمے کی مسلسل نغمہ بار آواز۔

مجھے ٹیگور کی وہ نظم یاد آئی تھی۔

آ اے خدا آ تو میرے گھر آ

اُس وقت میرے جسم کا لُو لُو اوپر والے کو اندر آنے اور اسے اس گھر میں رہنے کی دعوت دے رہا تھا۔

پر اس اوپر والے کو تو بھرے پرے گھروں سے اللہ واسطے کا بیر ہے۔ یہ تو ڈھنڈار گھروں میں رہنا چاہتا ہے۔

آنسو ضرور بہے پر روح کے زنگ کو اُتارنا بڑی کٹھنائی کا کام ہے مجھ جیسی کاہل اور آرام طلب ایسی مشقت کی بھلا کہاں عادی۔ 'میں میں' کہیں آسانی سے جان چھوڑتی ہے۔ اپنے آپ کو گرم چادر میں لپیٹتے ہوئے میں نیچے اُتر آئی تھی۔ تھوڑا آگے جا کر میں نے عقب سے بھیڑ بکریوں کا ایک لمبا چوڑا ریوڑ آتے دیکھا رُک کر میں نے انہیں راستہ دیا اُدھیڑ عمر کا مرد پیچھے تھا اور دو نوجوان بچے درمیان میں تھے ٹھہر کر سوال جواب کئے جنہوں نے یہ بتایا کہ ''یہ سب ڈھور ڈنگر شندھور جھیل کی چراگاہوں میں جا رہا ہے'' ''کتنی دیر میں پہنچیں گے وہاں؟'' شندھور جھیل کے نام پر میرا اشتیاق قابل دید تھا۔

''شام کو'' جواب ملا تھا۔ بچے نے اچھی ترجمانی کی تھی

ڈیڑھ میل کی واک کے دوران میں نے چار ایسے بھرپور ریوڑ شندھور جھیل کی

طرف رواں دواں دیکھے۔ یہ مقامی دستور ہے کہ گرمیوں میں جانوروں کو چراگاہوں میں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ کہیں رکھوالے یہ کام کرتے ہیں اور کہیں لوگ خود اپنی اپنی ذمہ داری پر۔ اکتوبر کے آغاز میں نیچے آ جاتے ہیں۔

میں جب برآمدے میں کرسی پر آکر بیٹھی دھوپ کے زنگار رنگ چوٹیوں اور درختوں کے بالائی حصوں کو سونے میں ڈبو چکے تھے۔ صنوبر کے پیڑوں کے پتے ہوا سے دھیرے دھیرے یوں ہل رہے تھے لگ رہا تھا جیسے شہر کے کسی نیون سائن کی بتیاں پل پل میں جلیں بجھیں۔ جیسے کوئی عاشق معشوق کو دلربانہ انداز میں بُلائے۔

بہت دیر گزر گئی میں پتوں کے اس دلچسپ تماشے میں کھوئی رہی اور چونکی تب جب ایک جیپ میں چند غیر مُلکی اُسی جگہ اُتر کر کھڑے ہوئے جہاں رات ہم اُترے تھے۔

سوشل لبرل اور ایک پُر اعتماد پاکستانی خاتون ہونے کا مظاہرہ کرنے کے لئے میں فی الفور انکے پاس جا پہنچی۔ یہ سب جاپانی تھے گوپس اور یاسین کے راستے شندھور پہنچے اب چترال جا رہے تھے۔ Kojima غالباً اُن کا لیڈر تھا۔ عجیب سُن وٹہ قسم کی چیز تھی بے جان تاثرات سے خالی سپاٹ چہرہ۔ بات چیت پر آمادہ ہی نہ تھا جاپانی ہمیں پسند سہی پر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں ہم یونہی جھولی چُک بنے رہیں۔ مایوس ہو کر قدموں کو زنان خانے کی طرف بڑھا دیا۔

جس آنگن کی وسعت اور کشادگی شب میں ظاہر نہ ہوئی وہ صبح کی روشنی میں پوری طرح نمایاں تھی۔ انگنائی میں عارضی بنائے گئے چولہوں پر دیگچے اور دیگیں چڑھی ہوئی تھیں اور آگ کے الاؤ دہک رہے تھے۔ داخلی دروازے کے ساتھ بنے کچے برآمدے کے کونے میں بچھے بستر پر گل ولی خان موٹی رضائی اوڑھے نیم دراز ملازموں کو ہدایات دے رہے تھے۔ سلام و دعا کے بعد ہاتھ ملائے گئے اور میں چارپائی کے ساتھ دھری کرسی پر بیٹھ گئی۔

گل ولی خان کے والد لیفٹیننٹ ولایت خان انڈین آرمی میں تھے۔ سکردو کی جنگ آزادی میں نمایاں رہے۔ دلیری اور شجاعت گل ولی خان کو وراثت میں ملی۔ علاقے کی تعمیر و ترقی

کے سلسلے میں انھوں نے بتایا ''چترال ایریا ڈویلپمنٹ پروجیکٹ اور آغا خان رورل سپورٹ پروگرام AKRSP کے اشتراک وتعاون سے خاصا کام کررہے ہیں۔ ذرائع آمدورفت بہت توجہ چاہتے ہیں۔ انگریزوں کے زمانے کے کچے راستوں کو ابھی تک پکا نہیں کیا گیا۔ لواری سرنگ ہنگامی بنیادوں پر حل طلب مسلہ ہے۔''

مذہبی رواداری کے وہ بہت قائل ہیں۔ مسلک کے اعتبار سے خود آغا خانی ہیں مگر بیٹی سُنیوں میں بیاہی ہے۔

جب میں گیسٹ روم میں آئی مہرالنساء برآمدے میں بیٹھی ملازموں کی فوج کو سامنے والے مہمان خانے میں مہمانوں کو ناشتہ کرواتے دیکھنے میں محو تھی۔ ''تمہیں چائے کی طلب ہو رہی ہے شاید؟'' میں نے اسکی طرف استفہامیہ انداز میں دیکھا۔

''ہاں مگر وہ ہمیں توجہ نہیں دے رہے ہیں'' اُس نے نوکروں کا گلہ کیا۔

''خیال رہے ہم بڑے روایتی گھر کے مہمان ہیں جہاں ہر صورت ناشتہ پہلے مردوں کو دینا ہے آؤ کمرے میں بیٹھتے ہیں۔''

ہماری باری بھی آ گئی۔ بُھنا ہوا گوشت خستہ شاپیک (خمیرہ پراٹھا ٹائپ چیز) چھپٹی اور چائے۔

اور پھر جیسے سورج نے پگھلے ہوئے سونے کا تھال اٹھا کر وادی پر پھینک دیا۔ کہ ہر چیز سنہرے پن میں نہا گئی۔ جولائی کی یہ صبح اپنے اندر مہربان اور شفیق ماں جیسی نرمی گرمی سموئے تھی اور یہاں وسیع و عریض لان میں رنگین کرسیوں پر بیٹھے سرخ و سفید بوڑھے نوجوان پس منظر میں بجتی پون وار کی دلنواز دھنوں پر محظوظ ہوتے ہوئے باتوں میں مگن تھے۔

پھر وہاں تیس پینتیس کے ہیر پھیر میں درمیانی قامت والا ایک چاق و چوبند مرد جسکے تن پر سیاہی مائل گرم سوٹ سر پر موتیے رنگ کی چترالی ٹوپی اور اس ٹوپی پر لہراتا، بل کھاتا، جگمگاتا مرغ زریں کا پر کچھ یوں چھب دکھا رہا تھا جیسے مس یونیورس کے سر پر تاج۔

یہ گل ولی خان کے بڑے صاحبزادے امیر اللہ خان تھے۔ چترال ڈسٹرکٹ کونسل کے ممبراور علاقے کے کونسلر۔ بڑی زندہ دل شخصیت میں نے پوچھا۔

''آپ ہمیں کل نظر نہیں آئے یہاں نہیں رہتے کیا؟''

''آپ نے دیس نکالے کا لفظ تو ضرور سنا ہوگا سمجھ لیجیے مجھے گھر نکالا ملا ہوا ہے۔'' میں انکی بات سمجھ تو گئی پر انجان بنتے ہوئے بولی تھی ''ارے وہ کیوں؟''

''یہ دل ایک لڑکی پر آ گیا تھا باپ اور میرا خاندان میرے دل کا خون کرنا چاہتا تھا۔''

میں نے اس ہنستے مسکراتے آدمی کو دیکھا جو اس سے مجھے بہت دلچسپ نظر آیا تھا۔

دھوپ جب درختوں کی چوٹیوں اور شاخوں سے لڑھکتی تنوں پر کدکڑے لگاتی آنگن میں پھیل گئی تب راتھینی (چترالی گھر) کے سامنے کچے برآمدے میں معززین اور باہر سے آنے والے عزیزوں کی دورویہ قطاروں کے درمیان دسترخوان پر سناگاچی اور اشپری سے تواضع کی جانے لگی۔ لڑکیاں چہروں پر پورو (پہاڑی جڑی بوٹیوں سے بنایا جانے والا اُبٹن) لگائے مجھے ان خانہ بدوشوں جیسی نظر آئیں جو ماتھے ٹھوڑی اور رخساروں کو مارنیلا بنائے رکھتی ہیں۔ اس پورو کے متعلق معلوم ہوا تھا کہ اسکا پیسٹ لگانے سے چہرہ شاداب اور تروتازہ ہو جاتا ہے۔ عورت کہیں کی بھی ہو اپنے سنگھار کے لئے سامان ڈھونڈ نکالتی ہے۔

اگر باہر معزز مہمان سناگاچی اور اشپری سے کام و دہن کی تواضع میں مصروف تھے تو وہیں اندر راتھینی کے بند اور تاریک کمرے میں گاؤں کی عورتوں میں عنابی مائل سرخ سیبوں پر چھینا جھپٹی کا ایک خوبصورت منظر تھا۔ سامنے دیوار میں گڑی چوبی الماری سے ایک خاتون سیب پھینکنے اور کیچ کروانے میں جُتی ہوئی تھی۔ میں نے فی الفور اس منظر کو کیمرے کی آنکھ میں محفوظ کرنا چاہا تب گل ولی خان کا منجھلا بیٹا وہاں داخل ہوا جسنے کھوار زبان میں انہیں ایک منٹ کا ایسا لیکچر دیا کہ انکے سروں پر سجی شوخ رنگوں کی ٹوپیاں جنکے دھنک رنگ عکس انکی آنکھوں میں بھی جھلک رہے تھے غائب ہو کر سراسیمگی پھیلا گئے۔ دھماچوکڑی کی اڑتی گرد پر تنبیہ کے چند لفظوں کے

پانی نے اُسے فی الفور یوں بٹھا دیا کہ مجھے دکھ ہوا۔ میں لفظ نہیں سمجھی پر مفہوم ضرور سمجھی۔ میرا جی چاہا کہ اسے بتاؤں کہ یہ چھینا جھپٹی تو ہماری فطرت اور تربیت کا ایک حصہ بنا ہوا ہے ہم نے تو سیرت کانفرنس جیسی مقدس تقریبات میں بھی اعلیٰ تعلیم یافتہ خواتین کو کھانے پر یوں جھپٹتے دیکھا ہے جیسے یہ انکے مقدر کا آخری کھانا ہو۔

سچی بات تو یہ تھی کہ سیب تو میں بھی کوئی کیچ کرنا چاہتی تھی کہ ان عنبری سیبوں کو دیکھ کر میرا منہ بھی پانی پانی ہو رہا تھا۔ پر کھیل تماشا ہی ختم ہو گیا تھا۔

اب ہم نے وادی کا ایک چکر لگانے کا سوچا۔ کسی گاڑی والے کا اتہ پتہ بھی پوچھنا مطلوب تھا کہ جو ہمیں شندھور جھیل لے جاتا۔ ہمارا ارشاد بابا تو خیر سے جاپانیوں کو لے کر چلا گیا تھا۔

جھرنوں کا شور دریا کے پانی کا پرشور انداز میں بہاؤ اور شادی والے گھر کی شہنائیوں کی آواز مل جُل کر فضا پر چھائے سناٹے کو زبان دے رہی تھیں یہ سالانہ یک فصلی علاقہ۔ باز و بھر لمبے گندم کے پودے ابھی کچے تھے۔

حد نظر تک پھیلے ہوئے اس ماحول کو دل آویزی اور رعنائی بخشنے والے عناصر اپنی تھوڑی بہت انفرادیت کے ساتھ وہی پرانے ہی تھے۔ بس اضافہ صرف Throwny کا تھا۔

پتھروں کے درمیان، کھالوں اور کھیتوں کی منڈیروں اور چٹیل جگہوں پر ایک تسلسل اور کثرت کے ساتھ اگی ہوئی ننھی مُنی جھاڑیاں جنکے سروں پر لہراتے لٹکتے مٹکتے سفید گلابی کاسنی سرخ نیلے پیلے چھوٹے چھوٹے سے پھول اپنے کانٹوں سمیت ایک ایسی منفرد چیز تھے جو قلب و نظر کو فوراً متاثر کرتے تھے۔ اُنکی اس خوبصورت سی دنیا کو میں نے بہت دیر اور شوق و جذبے سے دیکھا۔ اگر یہ جنگلی پھول تھے تو شہری پھول انکی خاک پا بھی نہ تھے۔ اندالو سبزی کا کھیت بھی نظروں کو بھاتا تھا۔

چترالی گھر غربت اور امارت کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ اپنی ساخت میں ایک

جیسے تھے۔ کھاتے پیتے گھروں میں سونے کی جگہ گدے نظر آئے تھے ہاں البتہ ماٹھے گھروں میں پرالی کی دبیز تہیں ہی استراحت کا سامان بنی ہوئی تھیں۔ ہر دو گھروں کے آنگن پھلدار درختوں سے لدے پھندے اور پچھواڑے موسمی سبزیوں سے مالامال تھے۔

خوشی اور غم کا امتزاج بھی نظر آیا تھا۔ شادی والا گھر جس کے لانوں میں بجتی شہنائی کی فضا میں بکھری تانیں اور بیمار عورت کی درد سے تڑپتے ہوئے ہونٹوں سے نکلی کراہیں۔ دونوں خاندانوں میں قریبی قرابت داری کے ساتھ ہمسائیگی بھی تھی۔ گھر کا سربراہ اگر اسوقت شادی کے ہنگاموں سے حظ اٹھا رہا تھا تو بڑا بیٹا غفران ماں کو بازوؤں میں سنبھالے اسکی اشک شوئی میں جُتا ہوا تھا۔ مستوج اسپتال میں ایکس رے مشین نہیں تھی بیماری کا پتہ نہیں چل رہا تھا۔ ہم لوگ کتنے بدقسمت ہیں کتنے ارزاں ہیں۔ ہمارے لئے کہیں کچھ نہیں ہے۔

ہماری ننھی مُنی گائیڈ انیسہ تھی۔ بے حد خوبصورت اور دلآویز قسم کی بچی جسکے لہجے میں زمانے بھر کا اعتماد بولتا تھا۔ بڑوں کی طرح چیزوں کی تشریح کرتی تھی۔

پھر جیسے میری ساری توجہ اس آواز کی طرف منتقل ہوئی جو بڑے دھیمے انداز میں مجھ سے مخاطب تھی۔ ''شندھور کے لئے گاڑی کا بندوبست ہو گیا ہے بڑے لان کی مغربی سمت ڈرائیور منتظر ہے۔'' میں نے ڈرائیور اور جیپ کا تنقیدی جائزہ اس قصائی کی طرح ہی کیا تھا جو آنکھوں ہی آنکھوں میں بکرے کی کلیات بمعہ جزئیات اسے ناپتا تولتا ہے۔ ''صورت اگرچہ اچھی نہیں پر سیرت بے مثال ہے۔'' بات بہت عمدگی سے کہی گئی تھی۔ دھیان سے دیکھا تو احساس ہوا کہ چہرے پر علم کی چھاپ ہے۔ تھوڑی سی جھرجھری لی تھوڑی سی خوشی ہوئی کہ چلو پڑھے لکھے آدمی کا ساتھ ہو رہا ہے اچھا رہے گا۔

اب صاحب خانہ کا کہنا کہ بھلا آپ کھانا کھائے بغیر کیسے جاسکتی ہیں؟ کھانا تو ابھی دم پخت ہونا تھا اور میں رکاب میں پاؤں رکھ کر ایڑ لگانے کے لئے مری جارہی تھی۔ معذرت کی پر اصرار غالب آیا جو کچھ سامنے آیا اسکی کیفیت کچھ ایسی تھی کہ گوشت ابھی کچا اور چاول کھڑے تھے پر

کمال کا ذائقہ دار تھا ہاتھ کھینچنا مشکل ہو گیا تھا۔

ہر چین سے آگے بورتھ بروک بلیم کی وادیاں آئیں یہ پستی سے بلندی کا سفر تھا۔ جیپ کہیں پہاڑ کے دامن کہیں سینے اور کہیں گردن سے گزرتے ہوئے حسن وخوبصورتی کا ایک جہاں آنکھوں کے سامنے لا رہی تھی۔ نظر پلٹتی تو پچھلے پہاڑ پستہ قامت نظر آتے انکے سینوں پر رینگتی سڑک یوں لگتی جیسے کسی دیو ہیکل جانور کو موٹے رسے کی نکیل ڈال کر اُسکے وجود کے آخری حصے تک کو مقید کر دیا گیا ہے۔ نیچے مختلف زاویوں اور ٹکڑیوں میں جھانکتی وادی کی کیفیت اُس چلبلی معشوقہ کی مانند تھی جو اپنے عاشق کی قید میں رہ کر بھی اپنے چاہنے والوں کو کبھی چلمن کی اوٹ سے کبھی کھلے عام اپنی اداؤں اور نخروں سے گھائل کرنے سے باز نہ آتی ہو۔ شپیر ماگھ میں اگر گاڑی کا ٹائر پنکچر نہ ہوتا اور رکنا نہ پڑتا تو یقیناً وادی کا وہ اینگل کبھی سامنے نہ آتا جس نے سچی بات ہے تڑپا کر رکھ دیا تھا کونے سے بند نیچے اترتی اور اوپر چڑھتی اس وادی نے کسطرح نظروں کو گھائل کیا یہ بتانا مشکل ہے۔

بلیم وادی کے کھلے کھلے مناظر سولاسپور کے خطرناک موڑ شندھور نالے کا پانی زرغون کی طرح شفاف کہ بے اختیار پینے کو جی چاہا۔ لاسپور کے شندھور ہوٹل سے گلاس مانگا۔ جانے کیسے ٹپری واسے لوگ تھے کہ ٹوٹا پھوٹا گلاس بھی پاس نہ تھا۔

خوبصورت جنگلی پھولوں کی کثرت نے رہت ملوک تے ذات ملوک والی مثال کی دھجیاں اُڑا دی تھیں۔ فطرت کے سخت ہاتھوں کی ساری بدسلوکیوں کے باوجود یہ ننھی مُنی دنیا اپنی دلآویزی میں یقیناً انہیں مات دے رہی تھی جنہیں انسانی ہاتھ جانے کتنی دقتوں، کتنی حفاظتوں اور کتنے اہتمام کے ساتھ پروان چڑھاتے ہیں۔

پھر وہ لوگ میری بصارت میں آئے جو ریوڑوں کی صورت نیچے گھاٹیوں میں رواں دواں تھے جنہیں میں نے علی الصبح دیکھا تھا جنکے کندھوں پر دھری پوٹلیوں میں ان کا کھانا تھا۔ تو یہ اب یہاں پہنچ رہے ہیں۔ میری چشم تصور نے دیکھا تھا کہیں راستے میں درختوں کی چھاؤں تلے

آبشاروں کے پاس وہ رُکے ہونگے انہوں نے اپنے انگوچھوں سے کھانا کھولا ہوگا چہلیں کرتے کھایا ہوگا۔ ٹھنڈا میٹھا پانی پی کر دم بھر کو ستانے کے بعد چل پڑے ہونگے۔ پتہ نہیں انہیں بھی ہماری طرح فکروغم دنیا جونکوں کی طرح چمٹی ان کا خون چوستی ہوگی یا نہیں۔

اب چند فٹ کی پتھروں سے اٹی پڑی روڈ ختم ہوگئی تھی اور گاڑی ایک ایسے سرسبز میدان میں داخل ہوئی تھی جسکے درمیان راستہ تھا۔ دائیں بائیں سبز میدانوں میں خوش گاہیں چر رہی تھیں۔

دفعتاً چلتے چلتے گاڑی تیز رفتاری سے ایک اور سرسبز میدان میں داخل ہوئی۔

میرے خدایا مجھے محسوس ہوا جیسے کسی نے جنت کا پٹ کھول کر مجھے اس میں داخل کر دیا ہو۔ میرے دائیں بائیں کے پہاڑ اور فرش سب ہلکے سبز غلاف سے ڈھپنے ایک دوسرے کے پہلو بہ پہلو لیٹے وصل کی لذتوں سے حظ اٹھا رہے تھے جیسے چاہنے والے اٹھاتے ہیں۔

نیلگوں سبزی مائل پانی سے لبالب بھری ہلکورے کھاتی جھیل کسی حسین مورت کی خوبصورت بلوری آنکھ میں ٹکے آنسو کے کسی موٹے قطرے کی مانند نظر آئی تھی۔

تقریباً سوا میل کے محیط میں پھیلی جھیل کے آخری سرے تک پہنچنے سے پہلے ہی میں نے جیپ رُکوالی اور نیچے اُتر آئی۔

میرے سانس میں ہیجان پیدا ہوا۔ نظروں میں حیرت کا سحر جاگا۔ اسوقت ہواؤں میں مستی تھی دھوپ میں سُستی تھی۔ نیلے آسمان پر بکھرے بادلوں کے ٹکڑوں میں آوارگی تھی۔ سبز پہاڑوں کے عقب میں بلند و بالا نوکیلی چوٹیوں پر برف کے گلیشیروں اور نالوں میں اُمنڈتی لُڑھکتی برف میں رعنائی تھی۔

مہرالنساء کیمرہ میرے ہاتھوں میں تھما کر اٹھلائی۔ ''اللہ جلدی سے جھیل کے پاس میری تصویر بنا دو۔''

میرے ہاتھوں نے کیمرہ تھامنے سے انکار کیا اور زبان نے کہا۔

''صبر کرو مہرالنساء مجھے اپنی آنکھوں کو حُسن فطرت سے سیراب تو ہونے دو''

پھر جیپ چلتی رہی۔ جھیل ساتھ ساتھ چلتی رہی بائیں طرف کے پہاڑ کہیں کہیں رنگ بدلتے رہے۔ سامنے والے پہاڑ حُسن و جمال کا پیکر بنے عاجزی سے ایک دوسرے کے ساتھ لپٹے آگے بڑھتے رہے۔

پھر جھیل پیچھے رہ گئی۔ گھاس کے کُھلے قطعے آنے لگے گہری سبز گھاس سے سجے پولو گراؤنڈ اور سامنے سبز اور آف وائٹ جھلکیاں مارتا وی۔ آئی۔ پی گیسٹ ہاؤس گزر گئے۔ بائیں ہاتھ خاصی دور جا کر فاصلے پر ٹینٹ نظر آئے تھے۔ جنریٹر لکڑی کے کُنڈے اور ٹال سے گزر کر ہم گاڑی سے اُتر کر مٹی سے بنے ہوئے اس چبوترے پر چڑھے جس پر مٹی اور لکڑی کی کوئی چھ کے قریب کوٹھڑیاں بنی ہوئی تھیں ان کوٹھڑیوں کے سامنے اسی چبوترے پر کرسیوں پر سات آٹھ چترال سکاؤٹس کے سپاہی بیٹھے تھے۔ جنہوں نے کھڑے ہو کر ''خوش آمدید'' کہا اس خوش آمدید میں محبت بھرا خلوص اور چاہت کا رچاؤ تھا۔

کرسی پر بیٹھتے ہی فضا پر ایک نظر ڈالتے ہوئے جیسے میری زبان پھسل پڑی ''سبحان اللہ جنت میں رہتے ہیں آپ لوگ۔''

بڑی استہزائیہ ہنسی ان سب کے لبوں پر نمودار ہوئی۔ پھر نائب صوبیدار شیر گل میری طرف متوجہ ہوئے۔ ''آپ چند دن یہاں رہیئے پھر اس جنت کی حقیقت آپ سے پوچھیں گے۔''

''اب پھولوں کے ساتھ کانٹوں کا ہونا تو ضروری ہے خوش ولی خان نے چائے کے برتن چھوٹی سی میز پر سجاتے ہوئے کہا۔''

''اگر جنت ایسی ہوگی تو میں پروردگار سے معذرت کرتے ہوئے ضرور کہوں گا۔ مولا تیری زمینی جنت کے زخم خوردہ ہیں اب اس آسمانی آفت سے بچا''

میں نے چائے کا کپ اُٹھایا اور فضا کے سحر کو دیکھا اور شیر نادر کی اس بات کو سنا جو وہ اس لمحے کی منظر کشی کر رہا تھا جب مرغابیوں اور چکوروں کی قطاریں اس جھیل کے کناروں پر اُترتی

ہیں۔ جب دھوپ چمکتی اور ہوائیں پانیوں سے اٹھکھیلیاں کرتی ہیں۔ پھر ہمیں صلاح الدین سے لوک کہانی سُننے کو ملی۔

بہار کے موسم میں جھیل کے پانیوں پر پرندوں کی چہکار پھولوں پر نکھار اور ہواؤں میں انکی باس کی مہکار رچی ہوئی تھی۔

وادی بروک کا ایک شخص شندھور کے راستے گلگت جارہا تھا۔ فضا کی اس گنگناہٹ کو اسکی آنکھوں نے سراہا اسکے دل نے نغمہ بجایا اور شندھور تیرا جواب نہیں پکارتا وہ اپنے راستے پر بڑھتا گیا۔ پہلے کے سُست زمانوں میں تو کسی کے ہاں مہمانداری مہینوں کی ہوتی تھی پانچ چھ ماہ بعد جب واپسی ہوئی اسوقت منظر بدل چکے تھے۔ جھیل کا ہلکورے لیتا پانی سفید چادر اوڑھے سو رہا تھا۔ پھول چرندے پرندے سب غائب تھے۔ گھمبیر سناٹا اور ویرانی کا راج تھا۔ تند و تیز جھکڑ تھے ان جھکڑوں میں یخ ہواؤں کی دو دھاری تلوار جیسی کاٹ تھی جو آگے پیچھے سے جسم کو کاٹ رہی تھی۔ راستے برف سے اٹے پڑے تھے۔ دو قدم آگے چلتا تو چار قدم پیچھے جاتا۔ ایسے میں دردناک آواز میں چلایا۔

''شندورے نہ شیلیک دی پولوار نہ ژوتیک دی پولوار''

(''شندھور تیری بہار اور خزاں دونوں آگ میں جلیں'')

ظہر کی نماز کے دو کسری فرض میں نے جھیل کے کنارے پڑھے۔ چاروں اور بکھرا سناٹا۔ ہلکورے لیتا جھیل کا پانی نیلا آسمان جذب و مستی میں اندر کی دنیا تہہ و بالا ہوئی اوپر والا قریب آکر بیٹھا۔ مانگنے کے لئے کیا تھا۔ بس بچے انکی سلامتی، انکی صحت، انکی درازی عمر۔ ممتا اپنے لئے تو کبھی کسی چیز کی طالب ہی نہیں ہوئی۔

آنکھوں کے بھیگے گوشوں کو پونچھ کر میں نے جھیل کو پھر دیکھا۔ اور صوبیدار عبدالسلام کی باتوں کو اپنے آپ سے دہراتے ہوئے پوچھا۔

کیسی عجیب بات ہے اس جھیل کے پانی کا کوئی اخراج نہیں۔ اسکا یہ پانی کسی ندی

نالے میں نہیں گرتا۔ میلوں میں پھیلی اس جھیل کا توازن کیسے برقرار رہتا ہے۔ پھر جیسے میں نے اپنے آپ سے کہا کہ کیسی بخیل ہے یہ فطرت کی گود سے مالا مال ہونے کے باوجود دھرتی کے کسی کھیت کھلیان کی کوئی بالی اسکے پانیوں کی شرمندہ احسان نہیں۔

وی۔ آئی۔ پی گیسٹ ہاؤس اس منظر میں انگوٹھی میں چمکتے سبز نگینے کی مانند پھب دیتا تھا۔

پھر پولو گراؤنڈ کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر میں نے چترال سکاؤٹس سے پولو کی دلچسپ تفصیلات جانیں۔

اس کہاوت کی صداقت کے بارے میں پوچھا کہ جسکے مطابق دائیں گول پوسٹ میں پیشاب کرنے سے مخالف ٹیم ہار جاتی ہے۔

چترال سکاؤٹس کے بیشتر سپاہی کھلکھلا کر ہنس پڑے دو نے کہا ایسے ہی فضول ڈھکوسلے گھڑے ہوئے ہیں۔ چند ایک نے کہا۔ ہوتا ہے ایسا۔

سٹیڈیم کی گھاس اتنی گھنی سبز اور اسقدر سلیقے سے کٹی ہوئی تھی کہ تا حد نظر لگتا تھا جیسے سبز قالین بچھا دیئے گئے ہوں۔

پولو کے کھیل میں ہماری جان ہے۔ یہ بڑا ولولہ انگیز خون کو گرمانے والا مہارت ذہانت قوت اور انصاف پسندی کا کھیل ہے۔ شندھور کا پولو گراؤنڈ خود ساختہ نہیں قدرتی ہے۔ شندھور دفاعی اور جغرافیائی اعتبار سے اہم درہ ہے۔ برف پوش پہاڑوں میں تقریباً آٹھ میل کے رقبے میں پھیلی یہ ایک ایسی سطح مرتفع ہے جس میں سوا میل لمبی یہ خوبصورت جھیل دلفریبی میں اپنی مثال آپ ہے۔

سٹیڈیم کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر ہم نے چترال سکاؤٹس کے ساتھ تصاویر بنائیں۔

پھر میں اُس راستے پر آ کر کھڑی ہوئی جو گلگت کی طرف جاتا تھا۔ قراقرم ہمالیہ اور ہندوکش کے پہاڑی سلسلے ان سلسلوں میں ایک سے دوسری جگہ جانے کے یہ دشوار گزار راستے۔

پروردگار تیرا انسان بھی کیا چیز ہے۔ قرنوں سے صدیوں سے تیری چیرہ دستیوں کا کس پامردی سے مقابلہ کر رہا ہے۔ کہیں تیشہ کہیں چپو کہیں اوزار ہاتھ میں تھامے زندگی کو دریافت اور ایجاد کے نئے نئے انداز دے رہا ہے۔ ان برفانی چوٹیوں ان دشوار گزار دروں میں زمانوں پہلے بھی زندگی تھی اور آج بھی ہے۔ ان پُر ہیبت پہاڑوں کے سینوں کے جگر چھلنی کر کے اسنے ٹیڑھے میڑھے راستے بنائے۔ کبھی عقل دنگ رہتی ہے کبھی ذہن ماؤف ہوتا ہے کیوں اور کیسے جان نہیں چھوڑتے۔

گاڑی میں بیٹھنے سے قبل میں نے اس سارے منظر پر نگاہ ڈالی۔ جھیل کو دیکھا اور کہا۔

''تیرا دیدار میں نے سناٹے اور تنہائی میں کیا۔ زندگی نے اگر مہلت اور صحت دی تو تجھے ہنگاموں کی گود میں مسکراتے ہوئے دیکھنا چاہوں گی۔ تیرے طلوع آفتاب اور غروب آفتاب کا نظارہ کروں گی۔ انشاءاللہ۔''

الوداع میری شندھور جھیل۔

باب نمبر۔۱۲

پیراڈائز لاج۔ قلعہ مستوج

لُوک اور بلوک۔ بونی کا ایک گھر

یہ اونچائی سے اترائی کا سفر تھا۔ راستے کی ناہموار کچی سڑک کی تنگی اور خطرناک اندھے موڑ اب زیادہ نمایاں ہوکر سامنے آرہے تھے۔ پر میں ان سبھوں سے بے نیاز صرف یہ سوچنے میں جتی ہوئی تھی کہ ہمیں رات کہاں گزارنی ہوگی۔ ڈرائیور مبارک شاہ نے میرے بہت سے سوالوں کے جواب میں مختصراً کہا تھا۔ کہ وہ ہمیں ہرچین میں دوسرے ڈرائیور کے حوالے کرے گا۔ مغرب تک وہ آپکو مستوج لے جاسکتا ہے اگر اسکی گاڑی راستے میں کہیں خراب نہ ہوئی تو۔

ہرچین میں جہاں رک کر اترنے کے لئے کہا گیا۔ اسکے دائیں طرف چند گھر اور دو تین دوکانیں، بائیں طرف ایک شکستہ بلڈنگ اور درمیان میں پانی کی کھال بہتی تھی۔ کھال کے کنارے چند مرد بیٹھے لومڑی کی کھالیں اور انکے سروں کی صفائی ستھرائی میں منہمک تھے۔

''چلیے سامنے میرا گھر ہے۔ آپ چائے پئیں تھوڑا سا ستائیں۔ اس دوران میں مستوج کے لئے گاڑی کا بندوبست کرلوں۔''

یہ ایک چھوٹا سا غریبانہ گھر تھا۔ آنگن میں آلوؤں کے پودوں کے پاس ایک خوبصورت سی بچی سر کو ہاتھوں میں لئے بیٹھی تھی۔ ''بیمار ہے یہ'' مبارک نے کہتے ہوئے بیٹھک کا دروازہ کھول دیا۔ نئی نئی تعمیر شدہ بیٹھک چھت پر سجے نئے نکور بالے اور تختے کھڑکی اور دروازوں

کی دیار کی لکڑی کی مخصوص ہمک فرش پر بچھے نمدے کی باس اور بند کمرے میں پھیلی سیلن کی بو سبھوں نے مل جل کر نتھنوں پر اس منہ زور عورت کی طرح چڑھائی کی جو خاوند کے دہلیز پر پاؤں دھرنے کے ساتھ ہی تیوروں سے اس کی تواضع کرتی ہے۔ مبارک شاہ نے فی الفور کھڑکی کھول دی باہر کی تازہ ہوا کی اندر کی بیمار فضا سے گتھم گتھا شروع ہوئی۔ زور آور نے کمزور کے وجود کے کچھ ٹوٹوں کو باہر پھینکا۔ ذرا سا سکون ملا تو میں نے ٹانگوں کو نمدے پر پھیلاتے ہوئے نیم دراز ہو کر جسم کو ڈھیلا چھوڑ دیا۔ پر کھڑکی سے آتی شام کی کرنوں کا دھیما پن مجھے مضطرب کر گیا۔ مستوج تک خاصا لمبا سفر ہے۔ کہیں راستے میں ہی نہ لڑھکتے پھریں۔

باہر جھانکا۔ مبارک تو کہیں نظر نہ آیا۔

آؤ مہر النساء ان کی راتھینی (چترالی کمرہ) دیکھتے ہیں۔

دو کچے تاریک کمروں کے آگے راتھینی تھی۔ کمرے کے وسط میں چولہا جلتا تھا۔ تین حصوں میں تقسیم شدہ کمرے کے ایک طرف مبارک شاہ کا بوڑھا باپ پرالی کے بستر پر لیٹا کھانس رہا تھا۔ من موہنی سی نوعمر بیوی چولہے میں روٹی سینک رہی تھی۔ دیواریں اگر دھوئیں سے توے کی طرح کالی تھی تو چھت سانولی۔ سامنے والے حصے میں دیوار میں گڑی چوبی کہنہ سالہ الماری میں ایلومینیم اور سلور کے برتن چمک رہے تھے۔ اور جب وہ دلاری سی لڑکی روٹی پر لگی راکھ جھاڑ کر اُسے پلیٹ میں رکھ رہی تھی مبارک شاہ نے اندر آ کر کہا۔ ''گاڑی آ گئی ہے''

گرم روٹی اور گھر کا جما دہی اور قہوہ۔ وہ جو کسی نے کہا۔ سچ کہا تھا۔

''بھکھ نہ ویکھے سالنا''۔

شوق و رغبت سے کھایا اور لطف اٹھایا۔

آنگن میں دونوں میاں بیوی کی تصویر بنائی اور گاڑی میں بیٹھے۔

مستوج میں کوئی ڈھنگ کا ہوٹل مل جائے مہر النساء فکر مند تھی۔ ڈرائیور نے تسلی دی فکر مت کریں۔ کچھ پہاڑوں کی خصوصیات ایسی ہوتی ہیں کہ وہ بہت منفرد نظر آتے ہیں۔ شہید اس کی

وادی کے آغاز میں ہی پہاڑیوں ظاہر ہوئے جیسے سیمنٹ کی ایک سیدھی دیوار بنا دی گئی ہو۔ مستوج وادی میں داخلی دہانے پر پہاڑ خاکستری کنکریوں کے مانند تھے یوں جیسے کارنیٹو کے منہ پر چاکلیٹی دانے ہوں۔

مستوج میں داخلے کے ساتھ ہی بروغل پاس کا سنگ میل نظر آیا۔ اسوقت تھکاوٹ شدید تھی پر پھر بھی میری آنکھوں میں بروغل پاس دیکھتے ہی ایک چمک سی پیدا ہوئی۔ ایک تشنہ آرزو نے سینے میں شور مچایا۔

گاڑی تیز رفتاری سے آگے بڑھتی گئی۔ مین سڑک سے وادی خاصی پیچھے ہے۔ اس وقت جھٹپٹا تھا جب مختلف گلیوں میں سے ہوتی ہوئی گاڑی ایک مکان کے سامنے رک گئی۔ بہتی کھال کے کنارے پختہ پلی کے پاس چند لڑکے کھڑے تھے۔ ''کوئی ہوٹل کوئی ریسٹ ہاؤس''۔ میں نے اُتر کر پوچھا۔ لڑکوں نے ایک گھر کی طرف اشارہ کیا۔ ''پیراڈائیز لاج۔''

پردیس میں گھر جیسا مزہ ۔ رہنا ۔ کھانا پینا سبھی کچھ گھریلو ماحول میں۔ دام بھی مناسب۔

گلی کے نکڑ پر واقع اس گھر پر میری طائرانہ سی نگاہ کچھ پسندیدگی لئے ہوئے نہ تھی۔

''ریسٹ ہاؤس کدھر ہے؟'' میں نے لڑکوں سے دوبارہ پوچھا۔

''سامنے والی سڑک پر آگے تک چلتی جائیے نصف فرلانگ پر ریسٹ ہاؤس کی عمارت ہے۔ پر ایک بات اس کا کرایہ ساڑھے چار سو روپیہ ہے اور اجازت اے۔ سی سے لینی پڑے گی۔''

مہر النساء کا منہ لٹک گیا اب اس سمے اے سی کے پاس کون بھاگتا پھرتا۔

چلو جو ہے اسے تو پہلے دیکھیں۔

پیراڈائیز لاج سچی بات ہے نام کو بڑا زبردست قسم کا بتہ تھا۔ پلی سے چند قدم پر داہنے ہاتھ گلی میں مڑ کر جس دروازے سے گزر کر اندر داخل ہوئے تھے جھٹپٹے کی اُداسی چھوٹا سا آنگن جسکے ایک حصے میں کچے پیلے رنگ کے کھلے پھول تنہائی کو کچھ زیادہ ہی بڑھا رہے تھے۔ سامنے کمرے

کے کھلے دروازے فرش پر بچھے سستے قالینوں کے ساتھ ساتھ دیواروں کی سفیدی اور کارنس پر بچھے رنگین موروں کی کڑھائی والے میز پوش اس سناٹے میں تھوڑی سی جان ڈال رہے تھے۔ سامنے باتھ روم تھا جس کا ٹوٹا ہوا دروازہ پنڈ کا بھاؤ روڑیوں کے مصداق اندر کا احوال بتا رہا تھا۔ میں دوسرے کمرے کی طرف بڑھی یہ جاننے کے لئے کہ وہ کیسا ہے جب لاج کے مالک نے نہ نہ کرتے ہوئے میرا راستہ روکا۔ ''ادھر مت جایئے۔''

''کیوں وہاں کوئی توپچی بیٹھا ہے؟''

'یا اللہ' میں نے ماتھے پر ہاتھ مارا۔ وہی صبح والا سن وٹہ کوجی ما چارپائی پر لیٹا چھت کی کڑیاں گننے میں مصروف تھا۔

مہرالنساء بھی میرے پیچھے ہی آ گئی تھی۔ ''یہ کیا'' اُس نے کوجی ما کو دیکھتے ہوئے گھبرا کر کہا۔ ''یہاں تم نے مردوں کو ٹھہرایا ہوا ہے۔ ادھر ہم اکیلی عورتیں۔''

''آپ کونسی جوان عورتیں ہیں۔''

شانوں تک کٹے بالوں اور دیدہ زیب لباس پہننے والی مہرالنساء کو بھی اس نے میرے ساتھ ملا دیا تھا۔

''ہم کیا تمہیں بوڑھی نظر آتی ہیں۔''

بے چارہ اکبر حیات اب کیا کہتا۔

مہرالنساء کے تلملانے پر اسکی بے بسی قابل دید تھی۔ کاروباری مجبوریاں کسی دشوار گزار دریا کی طرح سچا جواب دینے کے راستے میں حائل تھیں۔ زیرک اور ہوشیار آدمی تھا۔ مسکینی سے بولا۔

''آپ کی دل آزاری تو میرا مقصد نہ تھا۔'' کمبخت کس انداز میں چوٹ کر گیا تھا۔ بہرحال قالینوں پر دھلی ہوئی سفید چادریں بچھانے اور اپنی بیٹی کو ہمارے ساتھ سُلانے پر بات ختم ہوگئی۔ جو کھانا ہم نے رات کو کھایا وہ سادہ ہونے کے ساتھ لذت کے اعتبار سے اُن کھانوں میں

سے ایک تھا جنہیں ہمیشہ یادرکھا جاسکتا ہے۔ پالک گوشت، ماش کی دال، سلاداورلسی کے ساتھ گھر کی روٹی۔تعریف پر اکبرحیات نے نتھنے پھلائے اور بولا۔

''میری بیوی کی انگلیوں سے ذائقہ کسی رس کی طرح ٹپکتا ہے۔ جو ایک بار اس کے ہاتھ کا کھانا کھالے وہ دوبارہ یہیں آتا ہے۔''

اس میں یقیناً مبالغہ نہیں تھا۔ یہ جولائی کی خنک رات تھی جب روشن چہرے والی اکبر کی بیٹیاں اور بیوی ہمارے پاس آ کر بیٹھیں۔ قہوے کی سروس اکبر نے دی۔ میں نے چھوٹا سا گھونٹ بھرتے ہوئے اکبر کی بات کو کاٹ دیا جب اُس نے ''مستوج بہت خوبصورت وادی ہے'' کہتے ہوئے گفتگو کا آغاز کیا۔

''اکبر وادی کی طرف آتے ہوئے خوفناک ویرانی اور اُجاڑ پنے کا احساس ملتا ہے۔ مین سڑک سے یہ اتنی دور ہے کہ یوں لگتا ہے جیسے کسی نے اُسکے رُخسار پر زناٹے کا تھپڑ مار کر اسکا چہرہ پشت کی دیوار کے ساتھ چپکا دیا ہے۔'' اکبر کی ہائی اسکول میں پڑھنے والی بیٹیاں بہت ہنسیں۔

''مگر وادی ثقافتی اعتبار سے بڑی امیر ہے۔اسکے موسیقار۔اسکے کہانی گو اسکے لوک شاعر مرد خواتین سبھوں نے تاریخ چترال میں اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔اسکی خواتین کتنی جیالی کتنی اوالعزم اور کس قدر حوصلہ مند تھیں کہ سن کر آپکو حیرت ہوگی۔''

اور واقعی وہ سچی کہانی حیران کرنے والی تھی۔مستوج کے گاؤں ''چنار'' کے ایک میاں بیوی کی دو بیٹیوں کے نام لُوک اور بلُوک تھے۔نو سال کی لُوک کی شادی اسکے والد کے دوست کے بیٹے سے ہونا طے پائی۔ بیاہ کا دن آ پہنچا۔

گاؤں بھر نے نیوتہ ڈالا۔شام کو بارات کا استقبال دہلیز (چترالی برآمدہ) میں ہوا۔ بائی پتّس (نشست گاہ) میں بٹھایا گیا۔کردے میں نیم گرم پانی سے ہاتھ دھلانے کے بعد لکڑی کے بنے ہوئے ڈونگوں میں اشپری پیش کی گئی۔ گونجا (چترالی سٹور) میں لُوک کی سہیلیاں اُسے دم کیا

ہوا جوڑا پہنا کر سجا بنا رہی تھیں۔ جب رات گئے بارات حویلی جا کر سو گئی۔ لُوک کی سہیلیاں اور گاؤں والے بھی اپنے گھروں کو چلے گئے۔ لُوک بھی سو گئی۔ ماں بقیہ کام نپٹانے لگی کہ صبح سویرے بارات کو رخصت ہونا تھا۔ رات کے آخری پہر ماں نے جب لُوک کو جگانا چاہا اُسکی نبض خاموش تھی۔ سانسیں ساکت تھیں اور جسم بے جان تھا۔ ماں نے چیخ مارنی چاہی پر رُک گئی۔ باپ کو بُلا کر لائی پر اُسے ضبط کی تلقین کرتے ہوئے بڑی جی داری سے صورت حال سے نپٹنے کا تہیہ کرتے ہوئے سات سالہ بلُوک کو دلہن بنانے کا فیصلہ کیا۔ صُبح کاذب سے صُبح صادق ہوئی۔ اُسنے پرندوں کی چہچہکار سنی۔ فضا کے حُسن کو ایک نظر دیکھا۔ دل میں اُٹھتے درد کے طوفان کو جو آنسوؤں کی صورت آنکھوں سے بہنا چاہتا تھا ضبط کے بند لگاتے ہوئے روکا۔ ناشتے میں مصروف ہوئی۔ بارات رُخصت ہوئی وہ گھر کی چھت پر جا کر اپنی بیٹی کو دیکھتی رہی۔ اسکے کانوں میں بلُوک کی آوازیں گونجتی رہیں۔ میری بہن لُوک کہاں ہے۔ میری پیاری ماں مجھے نیند آ رہی ہے۔ جب بلُوک اور بارات نظروں سے اوجھل ہوئی۔ وہ نیچے اُتری۔ پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے ان اشعار کے ساتھ تجہیز و تکفین کی۔

میری بیٹی ماں تجھ پر واری
اے لوگو تم میری ننھی مُنی دلہن کے بال سنوارو
ماں کے دل میں تیرے مستقبل کے دیپ جلتے ہیں
اپنے گھر کی ہو رہنا۔ تیرے پیا کا گھر تیرا ہے
جہاں کہ تجھ کو رہنا ہے

بہت سویرے جاگی۔ بیرونی دروازوں کی کنڈیاں کھولنے میں ذرا دشواری نہ ہوئی پر ان کے آگے رکھے وزنی پتھروں کو ہٹانے میں مشقت کا سامنا ہوا۔ انہیں ہٹاتے ہوئے بے اختیار میں نے سوچا۔ کہ دروازوں کے آگے یہ بھاری بھرکم پتھر کیا شرارتی سیاحوں کے چپکے سے بھاگ نکلنے کی کوششوں کو ناکام بنانے کے سلسلے ہیں۔ پر جہاں ذرائع آمدورفت اتنے دشوار ہوں

وہاں کوئی ڈنڈی کیسے مارے گا۔

نِلی سے ڈھلانی راستے پر میں بھاگتی گئی۔ اس خیال سے بے نیاز کہ راستہ کونسا ہے اور کہاں جاتا ہے۔ ریسٹ ہاؤس کی عمارت نظر آئی۔ رُک کر اُسے دیکھا۔ چلو اچھا ہوا میں نے اپنے دل میں کہا۔ خجل خواری سے بچے۔

آگے چھوٹی سی ایک مسجد تھی۔ نہ کوئی بندہ نہ بندے کی چھوٹی موٹی ذات۔ ہو کا عالم۔ نماز پڑھتے ہوئے خوف سا طاری رہا۔

واپسی پر میں نے انکے رہائشی حصے کو دیکھنے کا سوچا۔

تنگ سی راہداری سے ہوتے ہوئے جو حصہ سب سے پہلے نظر میں آیا اُسکی کرسی زمین سے اتنی اونچی تھی کہ آنگن میں پر پھیلائے شہتوت کے درخت کی پھلدار ٹہنیاں چبوترے پر جھکی پڑتی تھیں۔ رسیلے خوش ذائقہ زبان پر رکھے پل بھر میں گھل جانے والے شہد آگیں شہتوتوں کو توڑنے کے لئے کسی زحمت کی ضرورت نہیں تھی۔ ذرا سی ہاتھ کو تکلیف دینے والی بات تھی۔

سامان سے اٹے پڑے کمرے میں اکبر حیات ریڈیو پر بی بی سی سن رہا تھا۔ رسوئی گھر میں اکبر حیات کی حسین بیوی پراٹھے بنا رہی تھی اور میرے لئے یہ کس قدر تعجب کی بات تھی کہ وہ سُن وٹہ جاپانی اسکے پاس اکڑوں بیٹھا چائے پراٹھا کھا رہا تھا۔

رات کے کھانے کیطرح صبح کے ناشتے کا بھی جواب نہ تھا۔ ایسے خستہ اور لذیذ پراٹھے کہ بندہ کھاتا جائے اور دل نہ بھرے۔

میرے اس سوال پر کہ مستوج میں کون کون سی چیزیں دیکھنے والی ہیں اکبر حیات فوراً بولا۔ ''پہلے تو قلعہ دیکھئے۔ دریائے یارخون اور مستوج کا سنگم قابل دید ہے۔''

بروغل پاس۔ میں نے بات کاٹی واخان کی پٹی اور تاجکستان کی سرحد۔

بہت دشوار گزار راستہ ہے اور میں آہ بھر کر رہ گئی۔

مستوج کے بازار کا طول و عرض بس اتنا تھا کہ نقطہ آغاز ہی نقطہ اختتام تھا۔ اشیائے

ضروریات زندگی سے بھری ہوئی چند دوکانیں اور بس۔

قلعہ مستوج کے بارے میں پوچھنے پر سننے میں آیا۔

''بس چند قدم پر ہے۔''

''چلو پیدل مارچ کرتے ہیں۔ واک ہی ہو جائے گی۔''

مہرالنساء بھنائی۔ ''انکے چند قدم میں جانتی ہوں۔ تڑکے سے واک میں جتی ہوئی ہو۔ ابھی بھی کسر باقی ہے۔ سیدھی طرح کسی سواری کا بندوبست کرو۔''

ہمارا اگلا پڑاؤ بونی تھا۔ بونی کے لئے گاڑی کے بارے میں جاننے کے لئے میں نے ایک دوکاندار سے پوچھا۔ میرے ہونٹ یقیناً لٹک گئے تھے کیونکہ جلیبیاں تلتے تلتے اُسنے خاصی بے اعتنائی سے کہا تھا۔

بک کرنی پڑے گی۔

چلو فی الحال بونی کو چھوڑو سردست تو قلعہ دیکھنے چلنا ہے۔ اسکا سامان کرو۔ میں نے اپنے آپ سے کہتے ہوئے کسی سوزوکی والے سے بات کرنے کا سوچا۔ واقعی پیدل قلعے تک جانا اپنے آپ کا ملیدہ کرنے والی بات تھی۔ بے شمار ٹیڑھی میڑھی گلیوں اندھے اور روشن موڑوں کے بعد کہیں قلعے کی صورت نصیب ہوئی۔ پر اس سے پہلے جس نظارے نے آنکھوں کو ٹھنڈک اور دل کے غبارے کو شادمانی کی ہوا سے پھلا دیا وہ پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی کا وہ شاندار موٹل تھا جو ابھی تکمیل کے آخری مراحل میں ہونے کے باوجود بڑی شان وشوکت کا مظاہرہ کر رہا تھا۔ پر شکستہ پا قلعے کو دیکھ کر دل کے غبارے کی ہوائیں نکلی کہ وہ پچک کر رہ گیا۔ کیا یہ کہوں کہ یہ پہلوئے حور میں لنگور والی بات تھی۔ یا اس احساس کا ماتم کروں جسکے تحت یہ عظیم ورثہ ٹوٹ پھوٹ سے دوچار ہو کر کھنڈرات میں تبدیل ہو رہا ہے۔

قلعے کے مرکزی دروازے پر جس ملازم سے ملاقات ہوئی اُس نے کچھ کہے بغیر گائیڈ کے فرائض سنبھال لئے تھے۔ ادھیڑ عمر کے اس مرد میں پیشہ ور گائیڈ بننے کی صلاحیت بدرجہ اتم

موجود تھی۔ میری طرح اُسے بھی مستوج کے راجہ کرنل خوش وقت کے بڑے بیٹے سے گلہ تھا کہ اُس نے قلعے کو شکست و ریخت سے بچانے کے لئے اس پر پیسہ لگانے کی بجائے کاروباری ذہنیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے چترال میں سیاحوں کے لئے عالیشان ہندوکش ہائیٹس بنائی۔ کیا تھا اگر وہ اپنے آباؤ اجداد کی اس نشانی کو زمانے کے ہاتھوں خورد برد ہونے سے محفوظ رکھنے کے لئے کچھ اس پر بھی خرچ کر دیتا۔

اس روشن اور خوبصورت صبح جب میں ٹوٹی پھوٹی بالکونیوں، غلام گردشوں، زنان خانوں، دیوان خاص اور عام جیسے طرز تعمیر والے شاندار تاریخی ورثہ کو لیر لیر ہوئے دیکھ کر خود دلگرفتہ سی تھی مجھے اسکا کرب اور دکھ سمجھ آتا تھا کہ اُنکی زندگیاں انہی چھتوں اور دیواروں کے سایوں تلے کچھ بسر ہوگئی تھیں اور کچھ ہو رہی تھیں۔ پھر وہ ہمیں ایک ایسے حصے میں لایا کہ جس پر نظر پڑتے ہی بے اختیار یوں محسوس ہوا جیسے صحرا میں چلتے چلتے یکدم کسی نخلستان میں داخل ہو گئے ہوں۔ ایک وسیع و عریض دبیز گھاس کا میدان نظروں کے سامنے پھیلا ایک خوشگوار سے احساس سے مالا مال کر رہا تھا۔ دائیں ہاتھ چند جدید وضع کے کمرے تھے۔ برآمدے میں ایک دلکش خاتون ہماری پذیرائی کے لئے آگے بڑھی۔

راجہ کرنل خوش وقت کی صاحبزادی سلطانہ بی۔اے، بی۔ایڈ اپنے بچوں اور داماد کے ساتھ کراچی سے یہاں چند یوم گزارنے آئی تھیں۔ ڈھیروں باتیں ہوئیں۔ بدلتی اقدار اور بدلتے حالات۔ ماضی کا وہ وقت جب وہ بہنیں ہوسٹل سے چھٹیاں گزارنے یہاں آتیں۔ راستے میں رعایا کی چاہتوں اور جانثاریوں کے بے شمار واقعات اور اب نئی نسلیں انہیں پرکاہ برابر اہمیت دینے سے انکاری۔ عروج و زوال کے یہ المیے۔

بونی کے لئے گاڑی میں بیٹھے تو احساس ہوا کہ صبح کی نرم نوخیزسی دھوپ شباب میں داخلے کے لئے تیزی سے ہاتھ پاؤں مار رہی ہے۔ ہماری خواہش پر ڈرائیور ہمیں اس مقام پر لے گیا جہاں سے ہم نے دریائے یارخون اور لاسپور کا ملاپ ہوتے دیکھا۔ دریائے لاسپور گول بشگار

سے نکلتا ہے جبکہ دریائے یارخون پاک افغان تاجک سنکیانگ سے۔

ہوائیں ٹھنڈی تھیں اور دونوں دریاؤں کی کہانیاں سُناتی تھیں۔ سناٹے کی اس زبان سے باتیں کرتے کرتے ہم پھر گاڑی میں بیٹھے۔

یکدم ننگے بُچھے پہاڑوں کی اوٹ سے ایک دوسرے کے مدمقابل واقع جو وادیاں اُبھر کر سامنے آئی تھیں یہ پرواک اور سنوغر تھیں۔ یہ وادیاں نہیں آرٹ کے بکھرے ہوئے شاہکار تھے جنہوں نے آنکھوں کو پھیلاؤ کی حد تک پھیلا کر جھپکانا بھلا دیا تھا۔

ٹوٹی پھوٹی کچی سڑک راستے کی خوفناک عمودی اُترائی چڑھائی، انجر پنجر ہلاتی گاڑی اور آگ برساتا سورج سب تلخ احساسات وقتی طور پر غائب ہو گئے تھے۔ کاش یہ سڑک پُختہ ہوتی۔ کاش یہاں اچھی گاڑیاں دستیاب ہوتیں کاش ہم اب تک ان وادیوں کے حسن کو کیش کرنے کی اپنے اندر صلاحیت پیدا کر چکے ہوتے۔ کتنے ہی سارے 'کاش' تھے جو میرے لبوں پر مچل مچل کر مجھے مضطرب اور بے کل کر رہے تھے۔ گاڑی رُک گئی تھی۔ کسی خرابی نے اُسے گھیر لیا تھا۔ خدا کا شکر کہ ویرانہ نہیں تھا۔ ڈرائیور گاڑی کی جانچ پڑتال میں لگ گیا۔ ذرا فاصلے پر چیک پوسٹ تھی اور سامنے سیبوں کے درختوں تلے چند لڑکے باتوں میں مگن تھے۔ میں اور مہر النساء اُتر کر ان کے پاس چلے گئے۔ سیبوں کے بھرے پُرے درختوں پر نظریں ڈالتے ہوئے میں نے لڑکوں سے کہا۔

''راجہ کے گھر میں موتیوں کا کال والی مثال تو بہت سُنی تھی پر اُسکا مفہوم اب سمجھ میں آیا۔ ہمارا تو وہ حال ہے کہ دریا کے کنارے آ کر بھی پیاسے ہیں۔''

متانت سے ایک لڑکے نے جواب دیا ''دراصل خوبانی اور توت دونوں ختم ہو رہے ہیں۔ گھروں میں ابھی بھی لگے نظر آتے ہیں آپکو ضرور کھلاتے پر گھر یہاں سے دور ہیں۔'' دفعتاً جیسے مجھے محسوس ہوا کہ میری بات کا جواب دینے والے لڑکے کی آنکھیں نم نم سی ہیں۔ میں نے سب لڑکوں کو بغور دیکھا وہ تعداد میں کوئی چھ تھے اور چُپ چاپ سے بیٹھے جانے کن سوچوں میں گم

تھے۔

''کچھ ہے۔'' جیسے میری چھٹی حس نے کہا۔

''کیا بات ہے بیٹے؟''

میرے استفسار پر لڑکوں کے سر جُھک گئے تھے۔ معاملے کی سنگینی محسوس کرتے ہوئے میں اُن کے پاس بیٹھ گئی اور سوال دوبارہ دہرایا۔

''خالہ ہمارا بہت پیارا دوست ہمارا بھائی ہمارا بچپن کا ساتھی کارگل میں دادِ شجاعت دیتا شہید ہو گیا ہے۔ پرسوں اس کی میت یہاں پہنچی تھی۔''

''شہباز خوش نصیب تھا اسے شہادت نصیب ہوئی۔ میں تو جاتے جاتے رہ گیا اور وہ چلا بھی گیا۔'' شہباز کی خوش نصیبی پر رشک کرنے والا دوسرا لڑکا جو میرے سامنے تھا بمشکل بائیس تیئس سال کا ہوگا۔ شباب کے اس دور میں شہادت کو خوش نصیبی سمجھنے والا اپنی تربیت اور اندازِ فکر کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔ میری آنکھوں نے یقیناً حیرت کے تاثرات اُگلے ہوں گے تبھی تو ایک لڑکے نے جو بالکل خاموش بیٹھا تھا کہا۔ ''چترال کے بہت سے نوجوان معرکہ کارگل کے جہاد میں مصروف ہیں۔ پندرہ بیس دن بعد جب ہمیں کسی کی شہادت کی خبر ملتی ہے تو سرخ محرابوں جھنڈیوں اور بینروں کے ساتھ اُس کا استقبال ہوتا ہے۔''

''یہ سلسلہ کب سے شروع ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''جب سے برف پگھلنے کا آغاز ہوا۔''

میرے اللہ نیچے کے لوگ تو کرکٹ ورلڈ کپ کے بخار میں پُھنک رہے تھے۔ خود میرا اس بار چترال آنا شندھور میلے کے سلسلے میں تھا۔ اسکے التوا کی خبر نے کیسے بے کل کیا تھا یہ تو اب جانی تھی کہ ایسے میں شندھور میلہ سجانا چترالیوں کے لئے کتنا مشکل تھا۔

''بیٹے اُس کی ماں کا کیا حال ہے؟''

''وہ مائیں جن کے بچے جہاد کے لئے جاتے ہیں سچی اور پکی مسلمان عورتیں ہیں خالہ

آپ یقین کریں گی شہباز کی ماں نے ایک آنسو نہیں بہایا۔ جب انہیں بیٹے کا چہرہ دکھایا تو انہوں نے سبحان اللہ کہا۔ شہباز کی میت پندرہ دن بعد ہمارے پاس پہنچی تھی اور وہ اتنی تر و تازہ تھی کہ یوں لگتا تھا جیسے ابھی ابھی وہ سویا ہے۔"

اسی دوران ڈرائیور بھی گاڑی کی مرمت سے فارغ ہو کر ہاتھ جھاڑتا ہمارے پاس آ گیا تھا۔

"ہمارا اسلام ہے اُس ماں کو" ہمارے ڈرائیور نے سر کو جھکاتے ہوئے کہا۔

اُس ماں نے اپنے دونوں ہاتھ اللہ کے حضور جوڑے تھے اور روندھی آواز میں بولی تھی۔

"میرے اللہ تو بادشاہ ہے میں نے شہباز کو کیسے پالا کیسے جوان کیا اور پھر کس حوصلے سے اُسے تیری راہ میں بھیجا۔ اُسکے مسلمان مظلوم بھائیوں کو اس کی ضرورت تھی۔ میرے اللہ میں سُرخرو ہوئی۔ تیری امانت میں نے تجھے لوٹائی میری قربانی قبول کرنا۔ پھر اس نے مجمع کو دیکھا اور کہا۔

شاہ عرب حشر کے دن میری شفاعت کرنا کہ میں نے تیرے دین کے لئے اپنا جگر کا ٹکڑا قربان کیا۔"

میری آنکھوں میں آنسو تھے اور ہونٹوں کا نچلا حصہ دانتوں تلے تھا۔ جس منڈیر پر میں بیٹھی تھی وہاں سے لڑھک کر نیچے آ گئی۔ میرے سارے جسم میں جیسے کرنٹ تھا۔ تڑپ کر میں نے ڈرائیور سے کہا تھا۔ "گاڑی کو شہباز کے گھر لے چلو اُس عظیم خاتون کے دیدار کے بغیر اب میں آگے نہیں جا سکتی۔"

ڈرائیور نے دھیرے سے کہا۔ "آپکو اس کے گھر تک کافی پیدل چلنا پڑے گا آپکے جذبات میں سمجھتا ہوں مگر بہت اونچائی نیچائی ہے۔"

"ارے بھئی میں ان راستوں پر چلنے کی عادی ہوں۔ گھبراؤ مت میرے جیسی دنیادار

عورت کے لئے اُن ہاتھوں کو بوسہ دینا اُس چہرے کا دیدار کرنا اور اُس زبان سے نکلتے کلمات کو سننا بہت ضروری ہے کہ جس نے نماز کے بعد اپنی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر ہمیشہ اپنے بچوں کے لئے دنیا کی بہتری ہی طلب کی۔ دین تو کبھی نظر نہیں آیا۔''

پھر اونچے نیچے ٹیڑھے میڑھے ڈھلانی عمودی راستوں پر چلتے چلتے ہم وہاں پہنچ گئے جہاں گاڑی رُک گئی۔ خوبانی، شہتوت، سیب اور انگور کی بیلوں سے سجے اس گھر میں اسی ہستی نے استقبال کیا جسکے اندر کے ایمان کا نور اُسکے چہرے پر پھیلا ہوا تھا۔ میرے اور مہر النساء کے ہاتھوں کا بوسہ لیتے ہوئے وہ ہمیں نشست گاہ میں لے آئیں۔ اونی رنگین نمدے پر بیٹھ کر باتیں شروع ہو گئیں۔ ہمارا ڈرائیور ترجمانی کر رہا تھا۔ میرے سامنے وہ عورت تھی جس نے مکتب کی شکل نہیں دیکھی تھی جس نے کسی سکول میں نہیں پڑھا تھا جو ہمارے نزدیک جاہل تھی۔ وہ کہہ رہی تھی۔

''ہماری جان ہمارا مال ہماری اولاد سبھی اللہ کے لئے ہیں۔ جہاں مسلمانوں پر ظلم ہو رہا ہو جہاں دین پر دنیا تنگ ہو رہی ہو وہاں جہاد ضروری ہے۔ جانے سے پہلے میں نے بیٹے کا ماتھا چوما۔ اُسکا چہرہ چوما اسکے ہاتھ چومے اور کہا۔

جاؤ مجھے سرخرو کرنا۔

الحمد اللہ اُسنے مجھے میرے رب کے حضور سُرخرو کیا۔''

میرے گلے میں جیسے میرا سانس پتھر کا گولہ بن گیا تھا۔

بونی میں جب ڈرائیور نے ہمیں بیچ چوراہے اُتارنا چاہا تو میں نے تلملاتے ہوئے کہا۔

''حد کرتے ہو میاں۔ ذرا باہر دھوپ کو تو دیکھو۔ پہر ڈھل گیا ہے پر اسکا بانکپن یوں لگتا ہے جیسے ابھی ابھی انگڑائیاں لے کر بیدار ہوا ہو تم خود بتاؤ ایسے میں دو غریب الدیار ادھیڑ عمر عورتیں کہاں سواری کے لئے دھکے کھاتی پھریں گی۔ سیدھے سبھاؤ ہمیں ارشاد بابا کے گھر لے چلو۔''

وہ کیوں اتنی لیت ولعت سے کام لے رہا تھا۔ اسکا اندازہ مجھے اس وقت ہوا جب گاڑی نے اونچی نیچی بہت سی ڈھلانیں طے کیں۔ ٹیڑھے میڑھے راستوں کے موڑ کاٹے برساتی نالے

میں سے گزری۔ ارشاد بابا کا گھر بلاشبہ اللہ میاں کے پچھواڑے میں تھا۔ کہ صرف ایک زقند بھرنے پر اُن پہاڑوں کے گلے ملا جا سکتا تھا جنہوں نے وادی کو بند کر دیا تھا اور جو گھر کے ہمسائے میں خاموش پاسبانوں کی طرح کھڑے تھے۔ گھر کے سامنے لمبا چوڑا چبوترا تھا اس پر اخروٹ کا زمانوں پرانا درخت پر پھیلائے کھڑا تھا۔ چبوترے پر چارپائیاں اور کرسیاں بچھی تھیں۔ چارپائیوں پر گاؤ تکئے سجے تھے۔ میز پر پانی کا جگ اور گلاس رکھا تھا۔ ہوائیں ٹھنڈی تھیں۔ چھاؤں میٹھی تھی۔ ارشاد بابا کا بھائی ہمیں اندر لے جانے کے لئے بضد اور ہمارا اصرار باہر بیٹھنے پر۔

بہت خوبصورت نظارے تھے۔ آنکھوں کے ذرا سے جھکانے اور اٹھانے پر بڑے دلچسپ مناظر بصارت کی زد میں آ رہے تھے۔ خاصی دیر بعد جب اندر داخل ہوئے تو پہلی حیرت اُن پیلے سرخ اور گلابی پھولوں کو دیکھ کر ہوئی جو بیرونی دروازے کے ساتھ پردے کی دیوار سے آگے قطار در قطار مسکراتے ہوئے جیسے خوش آمدید کہتے ہوں۔ جب اور آگے بڑھے انگنائی میں قدم رکھے تو گل و گلزار کا ایک جہاں دیکھا۔ کہیں پھولوں کی کیاریاں ہنستی تھیں کہیں سبز گھاس کے قالین حیرت زدہ کرتے تھے کمرے میں موجود اسلام آباد پشاور اور چترال سے آئی لڑکیاں فریال صمد، ماریہ کلثوم، صائمہ اور فہمیدہ کس درجہ مہذب اور شائستہ تھیں کہ خوشگوار حیرت نے بہت دیر تک جکڑے رکھا چھوٹی سی تپائی پر گھر کے درختوں سے توڑے ہوئے ٹھنڈے اور رسیلے آلو بخارے اور خوبانیاں سج گئیں۔

اور گفتگو کا سلسلہ اردو اور انگریزی میں شروع ہو گیا۔ پڑھا لکھا کھاتا پیتا وضع دار گھرانہ جسکی بیٹیاں پاکستان کے مختلف شہروں میں بکھری ہوئی تھیں اور اب بچوں کے ساتھ چھٹیاں گزارنے میکے آئی ہوئی تھیں۔

سبزے کے قالین پر بیٹھ کر ہم نے دوپہر کا کھانا چار بجے کھایا جو مکھن پالک ساگ، لسی اور چولہے کی پکی موٹی روٹی پر مشتمل تھا۔ ساگ اور مکھن دونوں لذیذ تھے۔

پھر جیسے یادوں کی بارات میرے ذہنی آنگن میں اُتر آئی۔ ایک مخصوص باس ایک پھیلا

ہوا منظر مجھے وہاں لے گیا جہاں درانتی سے مکئی کا چارہ کاٹتے ہوئے میں افق کو گھورتے ہوئے بے اختیار اپنے آپ سے کہا کرتی تھی ۔ بھلا میں چھٹیوں میں ماں جی کے پاس یہ مشقت بھرے کام کرنے کیوں آجاتی ہوں ۔ مار چارہ کٹوا بھالن (ایندھن) اٹھوا گوبر تھپوا تھپوا کر میرا بھرتہ بنا دیتی ہیں۔

سارے میں لوسن کے دو فٹ اونچے پودے کھڑے تھے اور ارشاد بابا کی والدہ درانتی سے چارہ کاٹ رہی تھیں ۔ میں نے بہتیرا ان کے ہاتھ سے درانتی پکڑ کر چارہ کاٹ کر ماضی کی یادوں کو زندہ کرنا چاہا پر وہ نہ نہ کرتی رہیں ۔

میں نے لمبے لمبے سانس بھرے کھیتوں سے اٹھتی ہوئی اس مخصوص باس کو اپنے اندر محفوظ کیا اور سیبوں کے باغ کو دیکھا جہاں درخت پھلوں کے بار سے کسی دولت مند صاحب حیثیت عاجز انسان کیطرح جھکے پڑ رہے تھے ۔ گھر سے ملحقہ یہ زمین یہ باغات سب اس خاندان کی ملکیت تھے ۔

رات کے کھانے پر دستر خوان پر وہی کچھ سجا ہوا تھا جو بالعموم میدانی علاقوں میں دعوتوں میں نظر آتا ہے ۔ شامی کباب ، پلاؤ ، چکن روسٹ ، دہی ، سلاد ۔ سلاد میں اہم چیز نیاز بو کے پتے تھے جنہیں ہم نے مقامی کلچر کی روایت سمجھتے ہوئے ذوق وشوق سے کھایا۔

اُس شب کا پہلا دلچسپ پہر ارشاد بابا کی پھول کیطرح نازک والدہ جنکے چہرے سے شفقت قندیل کی روشنی کی طرح پھوٹتی تھی کے ساتھ گذرا ۔ پرانے وقتوں کے ثقافتی عروسی ملبوسات گھوڑوں پر بارات اور باراتوں کا دنوں ٹھہرنا تفصیلات میں الف لیلیٰ کی کہانیوں جیسا طلسم ۔ پر اس منظر میں کلائمکس اسوقت آیا جب منقش چوبی ڈبے آئے اور نشست گاہ کے قالینی فرش پر یاقوت نیلم ، زمرد اور زرقونوں کے گلابی ، سبز ، سفید اور سرخ پتھر بکھر گئے ۔ اللہ میں نے حیرت اور شوق کی بلندیوں سے انہیں جھکتے ہوئے چھو کر دیکھا میرے بچپن کے جھلملاتے رنگین خوابوں کے یہ عکس اسوقت میرے سامنے پڑے تھے ۔ ہر روز جب میں بادشاہوں کی کہانیاں پڑھتی انکے زمرد یاقوت

اور ہیروں جیسے جواہرات سے پُر خزانوں کی تفصیلات اور ان کی ملکاؤں کے سروں گلوں اور ہاتھوں کو چار چاند لگاتے زیورات کا احوال پڑھتی تو سارا دن گویا بے کلی میں گزرتا۔ رات آتی اور ہر شب میں اپنے پسندیدہ بادشاہ کی ملکہ بنتی اور ان ہیرے جواہرات سے خود کو سجاتی۔

اس وقت میں نے اپنے ننگے بچھے ہاتھوں کو دیکھا۔ سونی کلائیوں پر نظر ڈالی خالی کانوں ناک اور گلے کو چھوا۔ کہیں رتی بھر سونا نہ تھا۔ کمبخت جو بادشاہ نصیب ہوا تھا وہ کور ذوق ہی نہ تھا حسن و نظر کی لطافتوں سے بھی بے بہرہ تھا۔ مجال ہے جو کبھی پہنا اوڑھا سراہا ہو۔ دھیرے دھیرے اس مردہ طرز عمل نے نسوانی حسیات کا بی ہی مار دیا۔

ایک بار پھر میں نے فرش پر بکھرے ان پتھروں کو دیکھا۔ میرے خوابوں نے انہیں چمکدار آنکھوں کو خیرہ کرتی شعاؤں کا خیالی روپ دے رکھا تھا۔ پر انکی صورت تو بڑی ڈل تھی۔

ارشاد بابا کی چھوٹی بہن جسکے میاں اسلام آباد میں مرکزی حکومت کے بڑے عہدیدار تھے۔ بڑے شاکی لہجے میں سور بند (گلے کی پٹی) کو ہاتھوں میں پکڑے کہہ رہی تھی۔

ہماری اماں انہیں کلیجے سے لگائے بیٹھی ہیں یہ نہیں کہ ایک ایک بیٹیوں کو عنایت کر دیں۔

ارشاد بابا کی والدہ بیٹی کے گلے کو یکسر نظر انداز کرتے ہوئے بولیں۔ پہلے تو بہوؤں کا حق ہے انہیں نپٹا کر تمہیں دیکھوں گی۔

گزشتہ دنوں نوادرات اکٹھے کرنے والی غیر ملکی سیاحوں کی ایک ٹولی ان سے بہت سے قیمتی پتھر کوڑیوں کے مول خرید کر لے گئی۔ فریال صمد انکی نواسی نے کہا۔ غیر ملکی سیاح یہ کام بھی کرتے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ملکھو وادی کی ایک خاتون نے ایسے ہی پتھر تقریباً بیس ہزار کے بیچے ہیں۔ انکی تراش خراش کے بعد تو یہ لاکھوں میں جاتے ہیں۔ غیر ملکی ایسے ہی ان وادیوں میں خجل ہوتے نہیں پھرتے۔

میرے مولا میرے ملک کے جوہریوں کے ساتھ کیا مسئلہ ہے۔ معلومات کی کمی ہے یا

آرام طلبی مشقت کی راہ میں مانع ہے۔ اس حیرت انگیز انکشاف پر مجھے شدید دکھ کا احساس ہو رہا تھا۔

شب بسری جس کمرے میں ہوئی وہ کتابوں اور رسالوں سے بھرا پڑا تھا۔ مگر اسوقت ہم قطعی طور کتابیں دیکھنے اور رسالے پڑھنے کے موڈ میں نہیں تھے۔ آرام دہ بستر پر لیٹنے اور سونے میں عافیت جانی۔

میں شدید قسم کی پینڈو ہوں۔ لاہور جیسے شہر میں ہوش سنبھالنے اور جوانی گالنے کے باوجود ماڈرن ازم کی بہت سی عادتوں نے میرے ساتھ یاری نہیں گانٹھی۔ ٹھیٹ دیہاتیوں کی طرح نور پیر کے تڑکے نیند کو میری بند پلکیں کھول کر اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگنے کی بیقراری ہوتی ہے۔ اب میں لاکھ اسکے ترلے کروں منتیں کروں ہاتھ جوڑوں کہ میری آنکھوں میں دوبارہ آجاؤ اور بڑے لوگوں کی طرح نو دس بجے تک میرے ساتھ رہو۔ مگر مجال جو اس ڈھیٹ ہڈی کے کانوں پر جوں بھی رینگے۔

اُس صبح بھی یہی ہوا۔ سارا گھر سوتا تھا جب میں آنگن میں آ گئی۔ گھر کے کشادہ لان میں پیراشوٹ کے رنگین خیموں نے مجھے حیران کیا۔ تھوڑی ہمت کی ایک خیمے کا پٹ اٹھا کر اندر جھانکا تو پشاور اور اسلام آباد کی ساری لڑکیاں میٹرس بچھائے وہاں سو رہی تھیں۔

پٹ میرے ہاتھ میں تھا اور پاکستان کا لڑکپن میرے سامنے تھا۔ نو دس سالہ اس کھلنڈرے لڑکے کے دل لاہور شہر کے گمٹی کشمیری اور لنڈا بازار پیراشوٹوں سے بھرے پڑے تھے۔ دیگر عورتوں کی طرح میرے گھر کی مہاجر عورتیں بھی انہیں چاہتوں سے خرید کر لاتیں، ادھیڑتیں، شلواروں میں جوڑ ڈلتے۔ قمیضوں اور کرتوں میں لیر لیر کا حساب جڑتا۔ سوٹ تیار ہو کر دُھلتا کوئلوں کی استری سے پریس ہوتا۔ تن پر کیا آتا چمک دمک سبک پن نفاست اور ملائمت کا ایک بازار سج جاتا۔

سامنے کیاریوں میں کھلے گلاب صبح صادق کی روشنی میں ہنستے تھے۔ سورج مکھی کے

پھول مسکراتے تھے۔ میں نے ان سب سے ہیلو ہائے کرتے ہوئے بیرونی دروازے کی کنڈی کھولی نماز کے لئے میرے سامنے دو جگہیں تھیں۔ پتھر کا بڑا سا چبوترہ اور سامنے ایک کمرے کی مسجد۔

چبوترہ قابل ترجیح تھا کہ نظارے سامنے تھے۔ ذرا سا رُخ پھیرنے پر دائیں تھے۔ بائیں تھے۔ اُس صبح دعائیں نہیں مانگی گئیں۔ دل سے اُٹھتی آوازوں اور نظروں کی زبان کا تصادم اس طرح بار بار ہوتا تھا کہ الفاظ کے لبوں پر آنے سے قبل ہی آنکھیں کسی زاویے میں اُلجھ کر انہیں بولنے سے روک دیتیں۔ میں دونوں ہاتھ ہوا میں لہراتے ہوئے ''مولا سائیں اللہ سائیں تو تو میرے اندر کا حال جانتا ہے'' کہتے ہوئے ڈھلانی راستے پر اُترتی گئی۔ ایک جگہ جا کر اس ڈھلان کا ایک سرا نیچے اُترتا تھا اور دوسرا دورویہ درختوں سے گھرا سیدھا معلوم نہیں کہاں جاتا تھا۔ چیختے چنگھاڑتے گلابی رنگ کے کپڑوں میں ایک نوعمری لڑکی سر پر چھوٹی سی پوٹلی دھرے ایک ادھیڑ عمر کے مرد کے ساتھ چلی جارہی تھی۔

چائے اور چوپھٹی کے ناشتے کے بعد دو شخصیات سے ملاقات بہت دلچسپ رہی۔ پہلی تو ارشاد کے بڑے بھائی عنایت اللہ بی۔اے۔بی۔ایڈ تھے۔ انکی تدریسی زندگی کی ابتدا کالاش کی وادیوں بمبوریت، ریمبور اور بریر سے ہوئی۔ دس سالہ اس طویل قیام نے انہیں کالاشیوں اور انکے کلچر پر ایک اتھارٹی کی حیثیت دلوائی۔ اپنے تجربے اور علم کو انہوں نے تحریری صورت بھی دی ہے۔ تھیس، کتابی صورت، کسی ماہنامہ کسی سہ ماہی پرچے میں اسکی چھپائی کا اہتمام عمل کی کونسی راہ بہترین ہے اسکا تعین نہیں ہو پا رہا تھا۔ یہ بھی سُننے کو ملا کہ بہت سے لوگ اس مواد کو حاصل کرنے کے لئے ان کے پیچھے سرگرداں ہیں۔ مگر وہ کسی کو پلہ نہیں پکڑا رہے۔ اسے جب انہوں نے میرے سامنے لاکر رکھا تو اسکی ہلکی سی پھولا پھرولی کے ساتھ ہی بیکن کے الفاظ میں

Some few to be read wholly with diligence and attention .

والی صورت نظر آئی۔ پر ہوا یہ کہ چند ہی لمحوں بعد وہ سُرخ فائل انہوں نے آہستگی سے یوں اٹھائی جیسے کوئی زیرک اور زمانہ ساز بوڑھی ساس اپنی نئی نویلی بہو کو اپنے کسی رنڈی باز بدمعاش داماد یا قریبی رشتہ دار کے سامنے سے کسی ناگہانی خطرے کے پیش نظر اٹھا لے جائے۔

فی الواقع جی تو میرا بھی بدمعاش داماد کیطرح اس دُلہن کو جھپٹا مار کر لے اُڑنے کو چاہ رہا تھا کہ ایسی نادر چیز تو کہیں نصیبوں سے ملتی ہے۔ پر مجھ میں دم خم کتنا تھا۔

دوسری شخصیت ۱۵۰ سالہ جناب جمعدار صاحب کی تھی۔ ربڑ کے لمبے بوٹ خستہ حال پینٹ اور خاکی قمیض پر جیکٹ ہاتھ مٹی میں سنے ہوئے تھے اور چہرے پر بھی کہیں کہیں اسکی گل کاری نظر آتی تھی۔ چشمے پر تیز پانی کے بہاؤ والی جگہ پر ایک چھوٹے سے کمرے میں پن چکی کا کام زمانوں سے سنبھالا ہوا تھا۔ صحت مند باہمت اور پُرعزم اس شخص کی باتیں قابل تقلید تھیں۔ حال کی بجائے ماضی سے زیادہ پیار تھا۔ وہ دن جب اخروٹوں سے پاپلر کے سوکھے چربی لگے درختوں اور دیودار کی سپیشل لکڑی سے گھر روشن ہوتے۔ ان دنوں میں بہت زیادہ برف باری ہوتی۔ بہت مزا آتا۔ اب زندگی بہت بدل گئی ہے۔

پھر محبت اور خلوص میں پورم پور ڈوبے اس گھرانے سے رُخصت ہوئے۔ برساتی نالے پر اس گھر کے سربراہ جناب محمد دبور خان سے ملاقات ہوئی جو جماعت اسلامی مستوج کے امیر ہیں اور اپنی جماعتی سرگرمیوں سے متعلقہ کاموں کے سلسلے میں دور افتادہ وادیوں کے سفر سے آرہے تھے۔ ہماری جانب سے رسمی جملے انکی جانب سے دعائیہ الفاظ کے ساتھ ملاقات کا خاتمہ ہوا۔

جب نشیب سے فراز پر آئے تو پل روڈ پر جابجا سرخ جھنڈے لہرا رہے تھے اور سبز پتوں سے محرابوں والے دروازے بن رہے تھے۔ ''یہ سب کس سلسلے میں؟'' میرا استفسار تھا۔ ''چترال سکاؤٹ کا ایک نوجوان کارگل میں شہید ہوا ہے اسکی میت کے استقبال کی تیاریاں ہیں۔''

''سبحان اللہ'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا۔

دار بند روڈ پر ارشاد بابا نے اپنی جیپ روکی۔ وہاں موجود نوجوان کے ایک ٹولے سے وہ خاصی دیر تک کھوار میں باتیں کرتا رہا۔ پتہ چلا کہ نوجوان ارشاد سے ہمارے بارے میں جاننے کے خواہشمند تھے۔ ہمارے شناختی کارڈوں کا مطالبہ تھا۔ اور ہم پر انڈیا کے جاسوس ہونے کا خدشہ ظاہر کیا جا رہا تھا۔ ارشاد نے ہنستے ہوئے بتایا کہ اُس نے اُن کی تسلی کر دی ہے۔

دراصل تحصیل موڑ کہو کی ہندوک وادی کے ایک سپاہی نے پاکستانی فوج کے ایک میجر کو انڈیا کے لیے جاسوسی کرتے ہوئے پکڑوایا ہے۔ اسی لیے لڑکے بالے کچھ زیادہ حساس ہو گئے ہیں۔

چترال واپسی پر سب سے پہلا کام نہانے کا کیا۔ اللہ سچا جانتا ہے تن سے اتنا میل اُترا تھا کہ باتھ روم گدلے پانی سے بھر گیا۔ سچے مولا سائیں تیرا پانی کتنی بڑی نعمت ہے من کا گند تو نہیں اُترتا پر تن کا اُتار کر سریر کو کیسا ہلکا پھلکا کر دیتا ہے۔

باب نمبر۔۱۴

بارون ترچ میر اور میں

یقیناً اسوقت لبوں پر بڑی شہد اگیں قسم کی مسکراہٹ ہوگی۔ سر تو سجدے میں پڑا تھا پر ہونٹ جو پڑھنا تھا جیسے بھولے بیٹھے تھے۔ ذہن سارے وجود کو خوشخبری کا وہ سگنل دے رہا تھا جس کا اذن مجھے آج شام چترال بازار میں ملا تھا۔ کل ترچ میر کے دامن بارون میں سجدہ ہوگا۔

کسقدر اتفاقیہ ٹکراؤ تھا۔ عین ہمارے پروگرام سے میچ کرتا۔ کرنل متاع الملک کے بڑے صاحب زادے ڈاکٹر حیدر الملک آتالیق بازار میں ملے۔ خیر و عافیت کے رسمی الفاظ کے بعد جب یہ سننے میں آیا کہ افراد خانہ کل راجہ صاحب کے ہمراہ اپنے گرمائی مستقر بارون جا رہے ہیں تب جانے کیسے زبان سے نکل گیا۔

''کیا ایسا ممکن ہے کہ ہم بھی آپ لوگوں کے ساتھ ایک دن کے لیے ترچ میر کے نظاروں سے محظوظ ہو آئیں۔''

''شیور (sure)۔ نرم خو ڈاکٹر کی زبان سے نکلا۔ کل دس بجے گاڑیاں روانہ ہوں گی۔ نو بجے تک شغور محل پہنچ جائیں۔''

مہر النساء کچھ جز بزسی تھی وہ گرم چشمہ کی پری خوان سے ملنے کے لیے مری جا رہی تھی۔

''ارے ہمیں وہیں سے تو جانا ہے اچھا ہے سفر ٹوٹ جائے گا ایک اور خوبصورت جگہ کا نظارہ بھی کرلیں گے۔''

سچی بات ہے صورت حال من و عین اُس شعر کے حسب حال تھی کہ یہ عالم شوق کا دیکھا

نہ جائے ہے۔ شب بھر خوابوں میں بھی ترچ میر کے چرچے رہے۔ صبح سویرے پاؤں تو جیسے Skates پر چڑھ گئے تھے۔ رُکو۔ تھمو۔ پلیز ذرا دم لو ناشتہ تو ڈھنگ سے کرنے دو۔ جیسے الفاظ کی تکرار مہر النساء کی طرف سے وقفے وقفے سے جاری تھی۔ اڈے میں سواریوں کا انتظار کون کمبخت کرتا۔ سالم گاڑی بک کی۔ شغور محل کے سامنے کھڑی گاڑیاں دیکھ کر چکریاں کھاتا وسوسوں میں ڈولتا دل سکون پذیر ہوا کہ ہمیں چھوڑ نہیں گئے۔ راجہ صاحب اور اُن کی فیملی سے ہیلو ہائے کی اور چائے پانی کے بعد مہر النساء پرانا محل اور میں بہشت کے اس ٹکڑے کو دیکھنے کے لیے اٹھی جسکی دوبارہ دید کی مجھے تمنا تھی۔ پر یہ کیا باغ تو اُجڑا پڑا تھا۔ اسے کیا ہوا؟ اضطراری کیفیت میں میری زبان سے نکلا۔ اوپر کے پہاڑوں سے برساتی طغیانی کا ریلا اتنا شدید اور زور آور تھا کہ اس کے ساتھ زنان خانے کا پرانا حصہ بھی تباہ ہوگیا۔ اب کف افسوس کتنی دیر ملتی۔ کرنل مطاع الملک کی منجھلی بھو نے راستے میں جائیداد کی تقسیم کے بارے میں بتاتے ہوئے کہا کہ پرانا محل ہمارے حصے میں آیا ہے۔

چلتے چلتے رک کر میں نے اُسکے ہاتھ تھامے۔ سُرخ وسفید چہرے کو محبت سے دیکھا اور کہا۔

''ہنزہ کے محل کی طرح آپ بھی اُسے سیاحوں کے لیے وقف کر دیں۔ ٹکٹ لگا دیں۔ جو چاہیں کریں پر اُسکی تاریخی حیثیت مجروح نہ کریں۔'' وہ میری طرف دیکھتے ہوئے مسکرائی اور بولی۔

''میں آپکی تجویز سے اپنے میاں کو ضرور آگاہ کروں گی۔''

جب اذن سفر ملا اسوقت میں مسز وقار الملک کو یہ سمجھانے میں جُتی ہوئی تھی کہ وہ نہیں جانتی ہیں کہ انکے اثاثے تاریخی لحاظ سے کتنے قیمتی ہیں۔

شغور کا چوبی برج کراس کرنے کے بعد نالہ اوژور کے ساتھ سفر شروع ہوا۔ سڑک سے بارون تک کا علاقہ اوژور کہلاتا ہے۔ستر اسی گھروں پر مشتمل سیواضت گاؤں کے بعد حسن آباد جیسی

کھلی وادی دیکھنے کو ملی۔ یہاں نالہ بہت نشیب میں بہتا تھا۔ آگے چڑھائی تھی۔ ہنجیل درمیر کی وادیاں گزریں۔ تقریباً 7000 فٹ کی بلندی پر ''اور غوچ'' کی وادی ہے جہاں راجہ صاحب کا باغ ہے انکی زمینیں ہیں انکے مزارع اور انکے گھر ہیں۔ یہیں پڑاؤ ہوا۔

راجہ صاحب کی بہوؤں نے اسے پکنک ٹرپ کے طور پر ارینج کیا ہوا تھا۔ چائے کا سامان شامی کباب، ویجی ٹیبل رولز اور نمکو جیسی چیزیں موجود تھیں۔ سکولوں میں پڑھنے والے ان کے بچے ماؤں کے ساتھ کھوار اور اردو میں بات کرتے درمیان میں کہیں کہیں انگریزی کے ٹوٹے لگاتے۔ پھلوں سے لدے پھندے باغ میں انکی چھاؤں تلے اونی دریوں پر کھلے ڈھلے انداز میں بیٹھ کر چائے پینا شامی کباب اور ویجی ٹیبل رولز کھانا کسقدر دلچسپ اور پُر لطف کام تھا۔ ٹھنڈی ٹھار ہوائیں دل و دماغ کو سرشار کرتی تھیں۔

درمیان میں تھوڑا سا ستانے اور چائے پینے سے تازہ دم ضرور ہوئے تھے پر عمودی چڑھائی اور کہیں اُترائی کا ایک ایسا سلسلہ تھا کہ لگتا تھا جیسے چڑھتے اُترتے ایک جگ بیت گیا ہے۔

سوسوم کئی اعتبار سے قابل رشک تھا نام کی نسوانی غنایت زیر لب جتنی بار بھی دہراؤ نیا صوتی لطف پاؤ۔ سوسوم کی لیڈی کونسلر اور مرد ناظم وادی کے رفاعی کاموں کے لیے سرگرم عمل۔ عورتوں کی شرح خواندگی زیادہ انگریزوں کا انگلش میڈیم سکول چلانا۔

ایک تو سمندر پار والی یہ چٹی چمڑی سمجھ وفہم سے بالا ہے۔ کمبخت مارے کیسے جنونی ہیں۔ کوہ قافوں میں کہیں انسانوں اور زبانوں پر ریسرچ کرتے پھرتے ہیں دنوں نہیں مہینوں نہیں سالوں پناہ گیروں کیطرح تیرے میرے گھروں میں ڈیرے ڈالے رکھتے ہیں۔ جیسے گھر سے دیس نکالا ملا ہو جیسے پتھر کے ہوں۔ کوئی خون کا رشتہ کبھی یاد نہ آئے۔ کہیں مشنری جذبوں کے اسیر ہو کر بھولے بھالے لوگوں کو مسیحی بنانے کے نیک کام پر عمل پیرا ہیں۔ کہیں تعلیم وتدریس کے نام پر خدمت ہو رہی ہے۔ جہاں مرضی چلے جاؤ جتنی چاہے بلندیاں چڑھ جاؤ انکا دیدار ضرور ہو جاتا ہے۔

کیار کے پارک گراؤنڈ میں آ کر گاڑیاں رُک گئیں۔ یہ ایک طرح وادی کی گاڑیوں کا اڈہ تھا۔

شکر ہے مولا تیرا۔ کہیں پہنچے تو سہی۔

اب یہ کب ممکن تھا کہ میں گاڑی سے اُتر کر کسی نظر باز اور دل پھینک عاشق کی طرح اس نئی جگہ کے کھیتوں کھلیانوں گھر گھروندوں اور انکے چھوٹے بڑے مکینوں شجر حجر اور وادی کو حصار میں لیے چوکس پاسبانوں سے آنکھیں نہ لڑاتی۔ سچی بات ہے میں تو حسن فطرت کے لیے دل نکال کر ہتھیلی پر رکھے پھرتی تھی اور صدائیں دیتی تھی کہ کوئی ہے جو اسے قبول کرے۔ اب ایسے سچے عاشق سے اگر کوئی منہ موڑے تو پھر معشوق کی بدقسمتی ہی ہے نا۔

پر جب آنکھیں لڑا کر واپس لوٹی تو مجھے محسوس ہوا جیسے ہندوکش کی چھوٹی بڑی چوٹیاں لڑھک کر یہاں آ گئی ہیں۔ میرا مولا جھوٹ نہ بلوائے سامان کے انبار لگے پڑے تھے۔ یہ ایک ماہ رہنے کے لیے یہاں آئے ہیں یا نقل مکانی کر لی ہے۔ حیرت آنکھوں سے پھوٹی پڑنے کے باوجود ہونٹوں میں دبی پڑی تھی۔

میری آنکھوں کے دیدوں میں مروت ولحاظ کا پانی ابھی نہیں ڈھلکا تھا۔ اسی لیے میں نے چور آنکھوں سے سامان کے حجم اور انکے بھاری اور ہلکے پن کے ساتھ ساتھ افراد تعداد انکی قد وقامت جسامت اور طاقت کے اندازے لگا کر اپنے لیے فلاں فلاں ہلکی پھلکی اشیاء اٹھانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

پر میرے ساتھ یہ بھی بات تھی کہ میں حال موجود صورت کا صحیح فہم وادراک نہ کر پاتی اپنے اسی مڑے تڑے ماڑے موٹے پس منظر میں ڈوبی رہتی۔ بھلا میں کسی ہما شما کی مہمان تھی۔ چترال کے مہتروں کا خاندان میرا میزبان تھا جن کی لمبی چوڑی زمینوں کے سلسلے میں یہاں تک دیکھتی چلی آئی تھی۔

اور پل بھی نہ لگا بے شمار انسانی ہاتھوں کے بلڈوزروں نے ہندوکش کی چھوٹی بڑی

چوٹیوں کا صفایا کر دیا۔

''چلیئے'' ڈاکٹر حیدر کی مسز مسکرائیں۔

میری جوابی مسکراہٹ کے ہونٹوں پر جو طمانیت اور سرشاری بجی تھی اسکے مفہوم سے صرف میں آشنا تھی۔

کیار کی ٹیڑھی میڑھی تنگ وکشادہ گلیوں میں جن سے ٹکراؤ ہوا اُن میں خوبصورت چہرے والی عورتیں تھیں جنکی مسکراہٹوں میں دوستانہ رنگ تھا۔ بوڑھوں میں اس راجہ فیملی کے لیے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر آداب کہنے میں نیاز مندی تھی۔ بچوں کی آنکھوں میں حیرت اور بے نیازی کا عنصر تھا۔

کیار کی ننانوے فیصد آبادی اسماعیلی ہے۔ پڑھنے لکھنے میں تیز اپنی مدد آپ کے اصولوں پر عمل پیرا۔ گاؤں میں بجلی ہے سکول، ڈسپنسری ہے پولو گراؤنڈ اور جماعت خانہ بھی ہے۔

جس پہاڑ کے سینے پر چڑھ کر ہمیں اوپر بارون جانا تھا اسکا حسن و بانکپن تو حیران کرتا تھا۔ سبز ریشمی گھاس سے ڈھپا نیلے کاسنی آتشی جنگلی پھولوں سے سجا۔ ایک میل کی چڑھائی تھی۔ پر اسنے اپنے رنگ وروپ کے زور پر اس مشقت کو عین راحت میں بدل دیا تھا۔ عمر رسیدہ کرنل مطاع الملک بغیر کسی چھڑی سہارے کے جوانوں کی طرح چڑھائی چڑھتے تھے۔ رشک سا محسوس کرتے ہوئے میری سوچ تھی کہ انکے گٹے گوڈوں میں ہڈیوں جوڑوں میں پہاڑوں کی ان مسافتوں سے دیرینہ یاری ہے تبھی تو ساتھ نبھایا جا رہا ہے۔ ان کے مقابلے میں ہم جیسے جوان پھر بھی ہانپ ہانپ جاتے تھے۔

ایک میل کی چڑھائی چڑھ کر میں بارون میں نہیں علامہ اقبال کی ''ایک آرزو'' سیموئیل راجرز کی ''A WISH'' کی جنت میں داخل ہوئی تھی۔

دامن میں کوہ کے ایک چھوٹا سا جھونپڑا ہو۔

گیارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑوں کے سینے پر تقریباً تین میل کے رقبے پر پھیلے وسیع

وعریض قطعے پر کوہساروں کے دامن میں ایک اکلوتا جھونپڑا تھا۔ سمر کاٹیج۔

ترچ میر کی چوٹیوں سے بہتا چشمے کا پانی اس سناٹے سے لبریز فضا میں گویا باجا بجا رہا تھا۔

فضا کسی خاندانی ازلی امیر کی طرح خوشبوؤں کے خزانوں سے بھری پُری تھی۔ کہیں اس میں پھولوں کی باس کا رچاؤ تھا کہیں پھلوں کی خوشبو حسیات کو چوکنا کرتی تھی۔ کہیں گندم جوار اور باجرے کے کھیتوں پر سے پھیلتی ہوا ماضی کے دریچے وا کرتی تھی۔ خوشبو کتنی جاندار ہے پل جھپکتے میں آپکے شعور چھوڑ لاشعور کی کھڑکیاں بھی چوپٹ کھول کر آپکو کہیں سے کہیں پہنچا دیتی ہے۔

سامنے ترچ میر کی چوٹی کسقدر رمائل بہ کرم تھی کہ لگتا تھا جیسے بازو وا کروں گی تو سینے سے ہی چمٹ جائے گی یا پھر میری گود میں لڑھک آئے گی۔

کاٹیج تین بیڈ رومز، سٹنگ روم ایک بڑے سے کچن اور سٹور پر مشتمل تھا۔ اسوقت کچن میں کھانا پک رہا تھا افراد خانہ اور نوکروں کے ساتھ یہ ماحول جنگل میں منگل جیسی صورت پیش کر رہا تھا۔

''آؤ چشمے پر چلیں۔'' مہر النساء نے اسوقت گویا میرے دل کی بات کہی تھی۔

چشمہ خاصے فاصلے پر تھا۔ اور صورت گری کچھ ایسی تھی کہ کہیں شکل چھپاتا اور کہیں خود کو ظاہر کرتا تھا۔ فضا میں خنکی تھی اسی لیے ہم نے پھوار میں بھیگنے سے گریز کیا۔ کیسا ٹھنڈا میٹھا آلائشوں سے پاک پانی تھا۔ آب حیات جان کر جو پینا شروع کیا تو وہ مثال خود پر فٹ بیٹھتی نظر آئی تھی۔

ہو چھے جٹ کٹورہ لبھا پانی پی پی اپھریا۔

قسمت اگر ہمیں بارونق جنت میں لے آئی تھی اور ہم ترچ میر کی برف پوش چوٹیوں کے اس آبی خزینے تک پہنچ ہی گئے تھے تو اب شکم میں موجود پرانی غلاظتیں دھونا اور آئندہ کے تین

دنوں تک اس کے فیض سے صحت یاب رہنا چاہتے تھے۔

ڈھلانوں پر اُگے رنگا رنگ پھول ہم نے نہ چاہنے کے باوجود توڑے۔ اپنی چادر بچھا کر نماز پڑھی اور قبلے کی بجائے ترچ میر کی چوٹی کو دیکھتے ہوئے دعا مانگی۔ نماز میں سرور تھا سپردگی تھی دعا میں عجز تھا اور قبولیت کی آس تھی۔

کھانے میں آلو گوشت تھا۔ ہوش سنبھالنے سے لیکر جوان ہونے اور میکہ گھر چھوڑنے تک جالندھر کے مضافاتی گاؤں سے لاہور جیسے بڑے شہر میں آ بسنے والے میرے پناہ گیر خاندان کے لیے سالنوں میں سب سے مہنگا اور خاص یہی ہوتا تھا جسے ادھ پاؤ چھوٹے گوشت کے ساتھ ہفتے میں ایک یا دو دن اہتمام سے پکایا اور کھایا جاتا۔ یوں اگر اندازے کے دائرے کو مہینوں اور سالوں پر پھیلاؤں تو پھر حساب کتاب شاید سینکڑوں تک چلا جائے۔ پر یہ کیسا آلو گوشت تھا جسکے لیے ندیدہ پن میری آنکھوں میں اُتر آیا تھا۔ میرے ہاتھ چوتھی بار ڈونگے کیطرف بڑھے تھے اور میری زبان نے شرمندگی کے احساس کو زائل کرنے کے لیے کہا تھا۔

''ایسا ذائقہ دار آلو گوشت میں نے آج تک نہیں کھایا۔''

''آلو بھی بارون کا اور گوشت بھی یہاں کا۔'' مسز حیدر نے کہا۔ ''تبھی۔'' میں نے اختصار سے کام لیا۔

عصر کی نماز پڑھ کر جب ہم چائے کے لیے اُس مخصوص جگہ پر آئے جہاں راجہ صاحب تشریف رکھتے تھے۔ میں نے پوچھا تھا۔ ''آپ یہاں سارا دن کیا کریں گے؟''

ترچ میر کے بولتے نظاروں سے دل بہلاؤں گا۔ انکی کرسی کا رخ ترچ میر کی طرف تھا۔ چادر میں جسم لپٹا ہوا تھا پھر انہوں نے ادھر اُدھر دیکھا اپنے چاروں طرف بکھری فطرت کی رعنائیوں کی جانب اشارہ کیا۔ یہ سب میرے پرانے سنگی ساتھی ہیں میرے ہمراز ہیں۔ پار افغانستان ہے۔ جسکی سرزمین سے میری حسین یادیں ہیں۔ بس اب ماضی کی وہ جنت اور دوزخ ہی ہے جس میں مجھے رہنا ہے۔

ہاں واقعی حال کے ان لمحوں میں سب سے زیادہ دلچسپ اور تکلیف دہ شغل اور کیا ہوسکتا ہے؟ میں نے سوچا۔

چائے کے کپ ہاتھوں میں تھام کر سرشاری کی حالت میں ترچ میر کو دیکھنا گویا پیدا کرنے والے کی ایک چھوٹی سی جھلک دیکھنے کے مترادف تھا۔

اب ہم پھر سیر کے لیے نکلے۔ گندم بیچاری کے ابھی کٹنے مرنے کے دن کچھ دور ہی لگتے تھے۔ مکئی پر جو شباب اور نکھار تھا وہ آنکھوں کو حیران کرتا تھا۔ خوبانی کہیں نظر نہ آئی تو میں نے کمپنی دینے والے راجہ فیملی کے بچوں سے پوچھا۔

''یہاں خوبانی نہیں ہوتی۔'' جواب ملا تھا۔

میں حیران ہوئی ایک ہی جیسی آب و ہوا اور زمین کے ہوتے ہوئے ایسا کیوں۔

یہاں سیب بھی نہیں ہوتے۔ بابا نے ایک سیب کا پودا لگایا تھا جس پر ابھی تک پھل نہیں لگا۔ ڈاکٹر حیدر کی بڑی بیٹی باتیں کرتے ہوئے کس قدر معصوم نظر آتی تھی۔

چلیئے میں آپکو وہ سیب کا اکلوتا درخت دکھاؤں۔

اب ٹھنڈک بڑھ گئی تھی۔ تیز ہواؤں نے درختوں کی شاخوں اور کمزور ٹہنیوں کو لمبے لمبے جھلار دینے شروع کر دیئے تھے۔ جس سے فضا میں شور اور سیٹیاں سی بجنے لگیں۔

میں نے ترچ میر کو دیکھا۔ اسکے چہرے پر بادلوں کے چند ٹکڑوں نے نقاب ڈال دی تھی۔ یہ بادل مجھے اس وہمی ماں کی طرح نظر آئے تھے جو اپنے خوبصورت بچے کو لوگوں کی نظر بد سے بچانے کے لیے گھر میں رکھنے کے جتن کرتی ہے۔ میں تو شام کے اُن لمحوں کی منتظر تھی کہ جب سورج کی آخری کرنیں ترچ میر کی پیشانی چوم کر اپنے مدار میں لوٹیں تو یہ دیکھ سکوں کہ رنگوں کی کونسی پچکاری کا اسکے چہرے سے چھڑکاؤ ہوتا ہے۔ اور اب یہ اُمید خاک میں مل گئی تھی۔

لالٹین کی روشنی میں کمرہ کتنا پُر اسرار لگ رہا تھا۔ دیواروں پر ہماری پرچھائیوں کے عکس بڑے بے ڈھبے اور خوفناک سے تھے۔ باہر ہواؤں کی چیخ و پکار تھی اور کمرے میں پوہ ماگھ کی سردی

اُتری ہوئی تھی۔ کھانے کے لیے بلاوے پر دوسرے کمرے میں جانا پڑا تھا۔

باہر پُر ہول تاریکی تھی۔ سردی تھی اور فضا پر چھائے سناٹے پر ضربیں لگانے والی چشمے کی مسلسل گونج تھی۔

کھانے میں پلاؤ تھا۔ ٹماٹر پیاز ہرے دھنیے کا سلاد اور راجہ صاحب کی ترچ میر سے متعلق کہانیاں تھیں۔

زمانوں پہلے صدیوں پہلے یہ ملک پریوں کی راجدھانی تھا۔ ترچ میر کی یہ چوٹی پری زادیوں کا دارالخلافہ تھا۔ یہاں انکے بادشاہ کا سونے کا محل تھا۔ یہ پری زادیاں سونے کے بستروں پر سوتیں۔ طلائی برتنوں میں کھانا کھاتیں۔ سونے کے تالابوں میں نہاتیں۔ انہیں فنون لطیفہ سے گہری رغبت تھی۔ سلیقہ اور ہنر مندی انکی پور پور سے ٹپکتی تھی۔ وہ مٹی اور لکڑی کے ایسے خوبصورت برتن بناتیں۔ چادروں تکیوں اور ملبوسات پر ایسی کشیدہ کاری کرتیں کہ انکا شہنشاہ دنگ رہ جاتا۔ پھر یہ برتن کھلونے چادریں اور ملبوسات لوگوں کے گھروں میں پھینک دیئے جاتے۔ لوگ انہیں دیکھتے حیرت زدہ ہوتے اور ڈرتے ڈرتے انہیں استعمال کرتے۔ اور یوں ہی لوگوں نے دھیرے دھیرے خود ایسے برتن کھلونے اور دیگر چیزیں بنانی شروع کردیں۔

جب سونے کے لیے لیٹے تو وہ کہانی یاد آئی۔ کسی جنگل میں ایک کٹیا تھی۔ بارون کے اس جنگل میں یہ بھی ویسی ہی ایک کٹیا تھی۔ جسکی بلند چوٹیوں سے برفانی چیتے بھیڑیئے اور ریچھ اُتر کران چوبی دروازوں کا تیاپانچہ کرتے ہوئے ہمیں اپنا لقمہ بنا سکتے تھے۔ آیت الکرسی کا دم درود تو کیا پر پھر بھی شب بھر اُلٹے سیدھے خیالوں سے ہی ہلکان ہوتے رہے۔

صبح دم ابھی پو بھی نہ پھٹی تھی جب میں نے باہر کیطرف دُھڑ کی لگائی صد شکر کہ ترچ میر کے چہرے پر اسوقت کوئی نقاب نہیں تھی۔ مجھے اپنی کیفیت پرانے وقتوں کے اس دل پھینک عاشق لونڈے کی سی لگی جو مئی جون کی آگ برساتی دوپہر میں اپنی محبوبہ کی ایک جھلک دیکھنے کے لیے چھت پر چڑھ جاتا ہے۔ سرد ہواؤں کے جھکڑ تھے اور میں تھی ترچ میر تھی اور میری پیاسی آنکھیں

تھیں۔

پھر جیسے ایک کوندا سالپکا ایک لشکارہ پڑا۔ روشنی کا نارنجی رنگ بکھرا۔ دھیرے دھیرے اسکا چہرہ اسمیں نہاتا گیا۔ میں دیکھتی گئی دیکھتی گئی۔

پھر اُٹھی اور کمرے میں آ کر کمبل اوڑھ کر لیٹ گئی۔ نارو تیجین کتنے جیالے تھے جو جان ہتھیلی پر رکھ کر اس پر پہنچے۔

وقت رخصت میں نے اُسے پھر دیکھا تھا۔

اور دم واپسیں وہ سب بڑے چھوٹوں سمیت ہمیں خدا حافظ کہنے کو موجود تھے۔ میں نے راجہ صاحب کے ہاتھوں کو عقیدت سے تھاما اور کہا دلی شکریہ آپکی محبت اور توجہ کا۔ کتنا اچھا ہو اگر اس خوش خلقی کا خفیف سا حصہ آپ اپنے عم زادوں شاہی قلعہ چترال اور محل کے وارثوں کو بھی منتقل کر دیں جنہوں نے ایسے جغادری دربان ڈیوڑھیوں پر بٹھا رکھے ہیں کہ جن کا ایک کڑکا اچھے اچھوں کا پتہ پانی کر دیتا ہے۔ وہ کھلکھلا کر ہنس پڑے۔ میرے ہاتھ جو ابھی تک اُنکی گرفت میں تھے ان پر ہلکی سی تھپکی دیتے ہوئے گویا ہوئے۔

بھئی آپکا اور ہمارا رشتہ تو قاری اور لکھاری کا ہے۔ چند لمحے خاموش رہنے کے بعد ہلکا سا مسکرائے چترال مرکزی جگہ ہے رکھ رکھاؤ کا اہتمام تو رکھنا پڑتا ہے۔

پھر میں نے انکی بہوؤں کے ماتھے چومے۔ اور رخصت ہوئے۔

باب نمبر۔۱۴

گرم چشمہ۔ پری خوان
بشقر پائین و بالا

شغور محل کے سامنے سڑک کے کنارے درخت تلے کھڑے چمکتی دمکتی آنکھوں کو چندھیاتی دھوپ میں اردگرد کی چیزوں کو دیکھتے ہوئے ہم نے سوچا بیٹھ جائیں کہیں۔ چترال سے گرم چشمہ جانے والی کسی گاڑی میں ہمیں یہیں سے جگہ یا لفٹ مل سکتی تھی۔

ابھی آدھ گھنٹہ کھڑی رہنے والی ٹانگوں کو پتھروں پر بیٹھ کر ستانے کا پل بھی نہیں ملا تھا کہ ایک ٹویوٹا سنگل کیبن موڑ مڑتی نظر آئی۔ ڈُڑکی لگائی اور عین اسکے سامنے خود کشی کے انداز میں کھڑے ہو گئے۔ گاڑی رُکی۔ ایک نوجوان باہر نکلا۔ دو اندر بیٹھے رہے۔

''گرم چشمے تک لفٹ چاہیے۔'' مجھے بولنا پڑا۔

کیونکہ وہ خاموش مگر مجسم سوال کی صورت میں تنا کھڑا تھا۔

''یہاں کیسے؟'' اب پوچھ پڑتال شروع ہوئی تو صورت حال سے آگاہ کیا گیا۔

روئیداد سُن کر طنزیہ اشارے اور ہنکارے چہروں اور ہونٹوں پر نظر آئے۔

''پیچھے بیٹھنا پڑے گا۔'' لہجے میں رعونت بھی تھی اور بے نیازی بھی۔

مہر النساء کونسا کم تھی فوراً بولی۔

''آپ لوگ ہمیں آگے بٹھائیں اور خود پیچھے جائیں۔''

''سبحان اللہ۔'' زوردار قہقہہ فضا میں گونجا۔

''دیکھئے یہ ایرفورس میں فلائٹ لیفٹیننٹ ہیں۔ اُس نوجوان کی طرف اشارہ ہوا جو ماشاءاللہ چہرے پر سجی بہت سی موٹی چیزوں کے ساتھ ساتھ موٹے تن وتوش والا بھی تھا۔ اور یہ دوسرے صاحب کی طرف اشارہ ہوا۔ انٹیلیجنس میں میجر ہیں۔ میرے مہمان ہیں۔ میں مردان سے ہوں اور لٹکوہ اپنے سسرال جارہا ہوں۔ اس لیے میں بھی مہمان ٹھہرا۔ اب اتنے معزز مہمان پیچھے کیسے بیٹھیں۔''

بطور پرنسپل میری پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا ایرفورس کے سکول سے ہوئی تھی۔ ایرفورس کے افسروں اور جوانوں سے اکثر و بیشتر رابطہ رہتا۔ دھرتی کو ہلانے اور فضاؤں میں کمندیں ڈالنے والے ان سمارٹ سے جوانوں کا فالتو چربی سے بھلا کیا واسطہ۔ اس گولو مولو کو دیکھتے ہی میرا دل اس پر نشتر چلانے کو مچلنے لگا۔ طنز بھرا نشتر چلا۔ اسکا پھولا پھولا گول مٹول چہرہ لال بھبھوکا ہوا۔

''میں فلائر ہوں آپکی اطلاع کے لیے۔'' وہ جیسے ترچ میر کی چوٹی سے جھانکا۔

''اوہو۔'' میں نے بھی ہونٹوں کو دائرے کی صورت دی۔

''پھر تو اور بھی مشکل ہوئی۔ کاک پٹ میں تو پھنس جاتے ہوں گے۔''

نوک جھونک کا یہ دلچسپ سا سلسلہ تھوڑا سا ہی آگے بڑھا تھا جب تحصیل لٹکوہ کے داماد نے اس قضیے کو سمیٹتے ہوئے کہا۔

''تو آپ پیچھے بیٹھیں گی نا۔''

''ارے میاں کیوں نہیں بیٹھیں گے یہاں کونسا گاڑیوں کی ریل پیل ہے کہ چلو ایک چھٹ گئی تو دوسری آجائے گی۔ سو کھنے پڑے ہوئے تھے۔''

میں تو خیر ٹپوسی مار کر چڑھی اور بیٹھی۔ عادی جو تھی کہیں کونے کھدرے میں کہیں گٹے گوڈوں میں کہیں شاخوں کی طرح لٹکتے ہوئے۔

ریت اور مٹی کے بگولے چہروں پر واری صدقے ہونے لگے تو ہم نے نقاب پوش

ڈاکوؤں کا روپ دھار لیا خدا کا شکر تھا کہ سورج کی تپش اور ہوائیں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے میں ہلکان ہو رہی تھیں۔ وگرنہ پڑا ہو جاتا۔ جیپ کے ہلکورے اور چارسو بکھرے نظارے۔ کہیں اگر میں جوان ہوتی تو ناچنا شروع کر دیتی۔ پھر پلاسٹک کے شیشے کی درمیانی دیوار سے ایک لفافہ ہماری طرف آیا۔ تازہ خوبانیاں واہ واہ کچھ کھائیں اور بقیہ سنبھالیں۔ ایک بار پھر گاڑی روک کر تواضع ہوئی چائے اور بسکٹ۔ جوانوں کا یہ روپ بڑا متاثر کن تھا۔

بیلپھوک سے ذرا آگے گاڑی رک گئی۔ میں ہنسی اب کھانے کو کچھ اور ملے گا۔

پر اب جو کھایا تھا اُسے نکالنے کی باری آ گئی۔ گاڑی سٹارٹ نہیں لے رہی تھی۔ زمینی اور فضائی فوج دھکوں میں مصروف ہو گئی۔ من پکے وجود کے ساتھ جمے بیٹھنے پر شرم آئی۔

''مدد کروں۔'' میں ہنسی۔

''نیچے اُتر آیئے۔ بس اتنی مدد کافی ہے۔''

مہرالنساء بالکل نہیں اُتری۔ زور سے چلائی۔ ''ارے میں تو ہوں ہی دھان پان سی۔'' میں نے کھایا پیا حلال کیا۔ نیک نیتی اور ایمان داری سے دھکا لگایا۔

جب گرم چشمہ اُترے تو ہمارے درمیان ماں بیٹوں کا رشتہ اُستوار ہو گیا تھا۔ اُس فلائٹ لیفٹیننٹ کو میں نے اپنے فلائٹ لیفٹیننٹ داماد کا پتہ دیا۔

میں نے تو بہتیرا چاہا کہ مہرالنساء سب سے پہلے گرم چشموں کی زیارت کرے پر وہ صرف دو ترجیحات کے ساتھ چمٹی ہوئی تھی پہلے نمبر پر پری خوان سے ملنا اور دوسرے پر بازار سے قیمتی پتھروں اور مقامی مصنوعات کی خریداری۔

''کیسے بگٹٹ بھاگے چلی جاتی ہو۔ کسی ریس میں حصہ لے رہی ہو کیا۔'' مہرالنساء تلملائی۔

میں نے قدموں کو لگام ڈالی۔ درخت کے سائے میں بیٹھ کر یہ طے کیا کہ ہمیں پری خوان سے اپنے کن مسائل پر دوا دارو لینا ہے۔

مہرالنساء جوان بیٹے کی فرضی ماں بنی لڑکے کو کسی لڑکی کے عشق میں مبتلا کروایا۔لڑکے کو بندے کا پتر بنانا مقصود ٹھہرا۔میں نے میاں کی عشق بازی کو مرکز مسلہ بنایا۔

پری خوان کے بارے میں جس سے دریافت کیا اُسنے پہلے تو سر کھجاتے ہوئے کچھ سوچا پھر کھوار میں کسی اور سے کچھ پوچھا تب وہ ہمیں ساتھ لے کر چلا۔اونچے نیچے راستوں کی چڑھائیوں اترائیوں میں جب ہم ادھ موئے ہونے کے قریب تھے اُسنے ہمیں ایک جگہ کھڑا کیا قریبی توت کے درخت سے ایک ٹہنی توڑی اُسے ہمیں تھمائی اور بولا اسے کھائیں میں معلوم کر کے ابھی آیا۔

''بھلا ایسی نابغہ شخصیت ہو اور بندہ کھوجتا اور چکریاں کھاتا پھرے۔'' مجھے تو سب رولا غولا لگتا ہے۔

چراغ تلے اندھیرا کی مثال سُنی ہے۔کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔رسیلے اور میٹھے توت کھاتے ہوئے مہرالنساء اس درجہ اطمینان سے بولی تھی کہ مجھے اس پر قدرے غصہ بھی آیا۔پھر جس تاریک کمرے سے گزر کر دوسرے کمرے میں پہنچے اسکے وسط میں چولہے کی روشنی کی بجائے راکھ کا ڈھیر تھا۔سیاہ دیواریں اور کمرے میں موجود چیزیں غربت کی دردناک عکاسی کرتی تھیں۔ اس ملگجے اندھیرے میں گھری بیٹھی وہ نور جہاں چاند کا ٹوٹا لگتی تھی۔پر اُس چاند سے ٹوٹے کی آنکھیں کیسی تھیں۔کسی برے کی طرح آپ کے قلب وجگر میں چھید کرتی ہوئیں۔اندر کے کرب کو لمبی زبان دیتی ہوئیں۔ایسے میں بھلا مجھے شاعر کیوں نہ یاد آتا۔

Oh! Beware of eyes, the window to life.

Thy Soul and heart dipped in eyes, Betray

میرا سارا وجود لرزا تھا اور دل باہر بھاگ جانے کو چاہا تھا کیونکہ میں شاعر کے ان اشعار کی نمائندہ نہ تھی۔

What if a man is blind. Yet having eyes.

مترجم لڑکے نے ہم سے کہا اپنا مسلہ بتاؤ۔ میں نے کہا ''اسے کہو ہم سے اُردو میں بات کرے۔''

ابھی ہم لڑکے کے ساتھ سوال جواب کی چکر پھیریوں میں ہی تھے جب اُس چاند کے ٹوٹے پر آمد ہوگئی یوں کہ حسین آنکھیں ٹیڑھی میڑھی ہوئیں زبان میں بھاری پن اور ہاتھوں میں ہلارآئے۔

جب مطلب پورا ہوتا نظر نہ آیا تو سب فراڈ بازی ہے۔ کہتے ہوئے میں نے مہرالنساء کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔ مترجم چیل کی طرح جھپٹا۔ ''تم پر عذاب آجائے گا۔'' ''ارے آنے دو میاں۔''

''جل جاؤ گی۔'' وہ چلایا۔ ''چلو اچھا ہوگا۔'' لنگڑی لولی ہو جاؤ گی۔ ''ہونے دو۔'' اطمینان بھرا لہجہ تھا۔ پچاس روپے کے نوٹ کا نذرانہ ضرور چڑھایا کہ غربت دامن دل کو کھینچتی تھی۔

ہمارے ڈاکٹر فیضی نیچے کے اُن پڑھے لکھے لوگوں کی طرح ہی ہیں۔ جو کسی بھی مشکل میں ڈبہ پیروں جعلی عاملوں اور جادو ٹونے والوں کے پاس بھاگے پھرتے ہیں۔ ''سب لفڑا ہے چلو۔''

مگر مہرالنساء ابھی پُر امید تھی۔ مزید کھوج کی طرف مائل تھی۔

پھر ایک درمیانی عمر کے آدمی نے انگشت شہادت سے اوپر سر سبز پہاڑوں کی چوٹی پر بنے گھروں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''بشقر پائین میں رہتی ہے گل پری عزیز خاں۔''

بشقر پائین اتنی بلندیوں پر۔ بشقر بالا تو پھر آسمان پر ہی ہوگا۔ میں سخت متعجب تھی۔

جب وہاں جانے کے لیے گاڑی والے سے بات کی تو معلوم ہوا کہ وادی گبور کا ایک جوڑا ابھی چھوٹے بچے کے ساتھ وہاں جانے کے لیے بیٹھا ہے۔

کیسی کٹھن چڑھائی تھی۔ راستہ سانپ کی طرح بل کھا کھا کر مڑتا تھا۔ دو گاڑیوں کا آمنے سامنے ٹکراؤ ہوا لگتا تھا اُسے راستہ دینے میں یہ تو لڑھک کر نیچے ہی گر جائے گی۔ قدرے ہموار سی ایک جگہ پر گاڑی روک کر ڈرائیور نے کہا۔ اوپر پیدل جائیے۔ عمودی چڑھائی کے اس پُل صراط کو بھی پار کیا۔ چوٹی پر پہنچ کر جب ایک نظر نیچے ڈالی بخدا سورج کی چمکتی روشنی میں ہری کچور وادی سبز نگینے کی طرح لشکارے مارتی تھی۔

ایسا فرحت آگیں منظر تھا کہ جس نے دیر تک خود میں جذب رکھا۔ اس محویت کو جس لڑکی نے توڑا اُسکی موٹی موٹی آنکھیں دنبالہ سُرمے سے سجی تھیں۔ فراخ پیشانی پر بالوں کی جھالر لہریں کھاتی پھرتی تھی۔ انگریزی کی ٹانگیں توڑتی تھی پر اردو اچھا بول لیتی تھی۔ یہ اس ساحرہ کی بیٹی تھی جسے ملنے کے لیے ہم نے کوہ قاف کی چڑھائیاں چڑھی تھیں۔ لاہور یئے جان کر میٹرک کی اس سٹوڈنٹ نے ہمیں خصوصی توجہ دی۔ جس کمرے میں بیٹھے وہ کارپیٹڈ تھا۔ اطراف میں مقامی رواج کے مطابق رنگین گدے بچھے تھے۔ پرچھتی رنگین دھاگوں سے کڑھے کپڑے سے سجی تھی۔ چھوٹی تپائی پر اگربتی دان اور ماچس پڑی تھیں۔ ظاہرہ شواہد خاصے زبردست تھے اندر خانے کیا تھا اسکے طلوع ہونے کا انتظار تھا۔

پھر ادھیڑ عمر کی ایک عورت بہترین لباس میں ملبوس اندر آئی۔ بڑا پکا پیٹھا چہرہ تھا۔ بڑی شاطر آنکھیں تھیں۔ تپائی پر بیٹھی۔ لڑکی نے ماں کے ساتھ نشست سنبھالی۔ ماچس کی تیلی جلی۔ اگر بتی اور لوبان سُلگے دھواں پھیلا۔ لڑکی نے مسئلہ پوچھا۔ میں نے پُرانا سوال دہرایا۔ ہم سے ہماری زبان میں بات کریں۔ آپکی زبان انہیں نہیں آتی۔ چلیئے قصہ ختم۔ مگر سٹیج تو سیٹ ہو چکی تھی لہٰذا تماشا دیکھنے میں کیا حرج تھا۔ اب تالی بجی خاتون کا چہرہ بدلا آنکھیں ٹیڑھی میڑھی ہوئیں۔ مہرالنساء، اپنا مسئلہ بتا رہی تھی۔ بازوؤں کا اوپر نیچے ہلار شروع ہوا۔ اس ہلار میں چند گول گول ہرے رنگ کے موٹے موٹے بیج گرے۔ بیٹی نے لپک کر اُٹھائے۔ پھر میرا مسئلہ زیر سماعت آیا۔ ایسی مضحکہ خیز صورت پر جانے کتنے جتنوں سے ہنسی کو لگام ڈالی تھی۔ میری بار بھی ایسے ہی چند بیجوں

کا نزول ہوا۔ایسا کرو اور ویسا کرو جیسے ہدایت نامے تھے۔

کمرے میں پُراسراریت کے بھرپور رچاؤ کے باوجود برتن خالی ہے جیسے شور نے مجھے باہر آنے پر مجبور کر دیا تھا۔کوئی صاحب نظر ہوتا تو ہم جیسی عورتوں کی چالاکیوں کو پل بھر میں جان کر آنکھوں کے ایک اشارے اور زبان کے دو بولوں سے ہمیں شرمندگی وخجالت کے پاتال میں دھکیل کر چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے پر مجبور کر دیتا۔

باہر انکے گھر کے سامنے لنڈے منڈے کشادہ سے چبوترے پر صنوبر کے درخت کی چھدری چھاؤں تلے بیٹھے ہوئے میں نے نیچے نگاہ کی۔فطرت نے اپنی تخلیق کی دلداری کے لیے کیا کیا سامان پیدا کر رکھے ہیں۔آنکھوں میں کھُب جانے والا منظر۔تھوڑی دیر بعد مہر النساء اور انکی بیٹی بھی ہمارے پاس آ کر بیٹھ گئیں۔

سورج کی اس ہمسائیگی کے باوجود یہ بشقر پائین تو بشقر بالا کہاں ہے؟ جیسے استفسار پر لڑکی کھڑی ہوئی خوبصورت ہاتھ سے اُس نے سامنے پہاڑوں کی عقبی سمت میں اوپر کی طرف رُخ پھیر کر اشارہ کیا اور بولی۔

''بشقر بالا ہے وہ۔بہت بڑی آبادی ہے۔لڑکیوں کا ہائی سکول بھی ہے ادھر۔''

خوبصورت لڑکی نے اپنی ماں کے پری خوان بننے کی جو کہانی سُنائی وہ کچھ ایسی ہی بے سروپا تھی جیسی ہم اپنے علاقوں میں ان جعلی پیروں فقیروں کی سُنتے ہیں۔

ریشن والی فیملی کی واپسی بھی ہمارے ساتھ ہی ہوئی۔جہاں اُترے وہاں انکے کوئی ملنے والے بھی کھڑے تھے بڑی دبنگ قسم کی شخصیت تھی۔راسخ العقیدہ مسلمان ہونے کے ناطے رشتے دار کے تو لتے انہیں لینے ہی تھے۔ساتھ ہی ہماری بھی کلاس لے ڈالی۔ ''بے وقوف عورتیں دکھتی ہیں آپ۔پڑھی لکھی ہیں پر نری جاہل ہیں۔'' اجنبی جگہ پر کسی اجنبی انسان سے ایسے شاندار کلمات۔یقیناً آپکا سر گھُمانے کے لئے کافی ہیں۔

ہونقوں کی طرح ہم اُسے بٹر بٹر دیکھتے تھے۔

گاڑی والے پری خوان کے ساک سائیں ہیں۔ دیہاڑی دار ڈرائیوروں سے ذاتی گاڑیوں کے مالک بن گئے ہیں۔

ریشن والی فیملی بیچاری ماٹھی سی تھی۔ کرایوں بھاڑوں کے علاوہ دوسو کا نذرانہ پری خوان کے چرنوں میں چڑھا کر آئی تھی۔ ایسے میں بھلا اقبال کیوں نہ یاد آتے۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن

چلتے چلتے یہ بھی نصیحت ہوئی کہ خدا کس لیے ہے۔ اُسکے فرائض اوروں کو کیوں سونپتی ہیں۔

مہرالنساء تو بازار میں داخل ہوتے ہی پتھروں میں اُلجھ گئی تھی پر میرا ذہن صرف اس ایک جُملے میں گھُمن گھیریاں کاٹ رہا تھا خدا کس لیے ہے۔

واپسی کے لیے جو گاڑی بک کی وہ بڑی فضول نکلی۔ درشپ میں خراب ہوئی۔ ڈرائیور بڑا ایبا سا آدمی تھا۔ شرمندگی کا غازہ اس نے چہرے پر یوں ملا کہ ہمیں از خود کہنا پڑا۔ کوئی بات نہیں اسے ٹھیک کرو سامنے محل ہے وہ دیکھ لیتے ہیں۔

درشپ کا یہ محل بھی ٹوٹ پھوٹ کے راستے پر نکلا ہوا تھا۔ تنگ و تاریک کمروں کی سرنگوں سے گزر کر جب کشادہ آنگن میں آئے تو اس ویرانے میں ایک بوڑھے باپ اور بیٹے کو کرسیوں پر بیٹھے باتیں کرتے دیکھا۔ ابھی تھوڑی سی گپ شپ ہی ہوئی تھی جب ملازم نے گاڑی ٹھیک ہونے کی اطلاع دی۔

زجی میں یہ پھر خراب ہوئی۔ بڑی خوفناک سی صورت حال تھی۔ ابھی صرف آٹھ بجے تھے پر ماحول پر چھائی گہری تاریکی۔ سیٹیاں بجاتی ہوا کے تیز جھکڑ۔ سناٹا اور چاروں طرف بکھری تنہائی نے فضا کو حد درجہ دہشت زدہ کر رکھا تھا۔ سڑک کنارے دھرے بڑے بڑے شہتیروں پر ہم

بیٹھ تو گئے تھے کیونکہ کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا کہ دن بھر کی تھکن نے ٹانگوں کو ماش کے آٹے کی طرح اکڑایا ہوا تھا۔ پر سچی بات ہے ٹک کر بیٹھنا بھی محال ہو رہا تھا کہ شہتیروں کے درمیان فاصلوں میں ڈر تھا کہ کوئی سانپ بچھو نہ ہو۔

''اگر کوئی خدائی مدد شامل حال نہ ہوئی تو مجھے امید نہیں ہم صبح سے پہلے چترال پہنچ سکیں گے۔''

مہرالنساء سخت ڈپریشن میں تھی۔ خدا کو مہرالنساء پر ترس آیا۔ اسکی کسی دعا کو فوری قبولیت حاصل ہوئی۔ بہر حال A.K.R.S.P والوں کی ایک گاڑی گزری جو ڈرائیور کے ہاتھ دینے پر رُک گئی۔

گاڑی کیا تھی کنکارڈ طیارہ تھا۔ بگولے کی طرح اُڑتی اس بلا نے معصوم سی بلی کی جان لی۔

''ذرا آہستہ چلائیے'' کہنے کی کوشش کی پر وہاں کانوں میں روئی کے تو بے ٹھنسے تھے۔

ہم دونوں نے خوف سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اور آنکھوں کی زبان میں کہا۔ آج بچ گئے تو معجزہ ہی ہوگا۔

چترال پہنچ کر اور بستر پر لیٹ کر بھی ہمیں یقین نہیں آتا تھا کہ ہم زندہ سلامت ہیں۔

باب نمبر۔۱۵

بھر موغلشٹ

اُس دن کی قطعی کوئی منصوبہ بندی نہیں تھی۔ مہر النساء نے رات مجھے الٹی میٹم دے دیا تھا کہ کل اُسے بازار جانا ہے ڈھیر ساری شاپنگ کرنی ہے۔ مقامی دستکاری کی اشیاء دیکھنی اور خریدنی ہیں۔ اور مجھے ایک مودب اور کم گو خادم کی مانند اسی طرح اسکے پیچھے پیچھے چلنا ہوگا جیسے وہ گزشتہ چند دنوں سے میرے ساتھ چلتی رہی تھی۔ اب اسکے اس نادر شاہی حکم پر آمنا وصدقنا کہنے کے سوا میرے پاس چارہ کار ہی کیا تھا۔ یہ شاپنگ بھی کس قدر فضول اور بیہودہ کام ہے۔ میں قہر درویش برجان درویش جیسی صورت حال سے دوچار تھی۔ منہ پر خاموشی کا قفل لگائے مودبانہ انداز میں اسکے تعاقب میں تھی۔ کوئی دو ڈھائی گھنٹے کی خجل خواری کے بعد اُس نے ہاتھ کھڑے کیے اور ہم پکوڑے نان لینے کے لیے بازار کی واحد دوکان پر آ کھڑے ہوئے۔ جب جیپ میں بیٹھے اُس لڑکے نے ڈرائیونگ سیٹ کی کھڑکی سے گردن باہر نکال کر پوچھا۔ ''گاڑی چاہیے کہیں جانا ہے۔'' میں نے لڑکے کو پہچان لیا تھا۔ ہم شغور اس کے ساتھ گئے تھے۔

''کہاں جائیں'' اُسوقت میں بھوک سے نڈھال پیٹ پوجا کی بھول بھلیوں میں اُلجھی ہوئی اُسے دیکھتے ہوئے صرف اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''بھر موغلشٹ۔'' بڑی خوبصورت قابل دید جگہ ہے۔ لڑکے نے مجھے راستہ دکھایا۔ مہر النساء سے بات کی اُس نے آمادگی کا توفی الفور اظہار کر دیا پر اپنے ساتھ خریداری کے ڈھیروں پلندوں کے بارے میں تفکر بھی اُسکے چہرے پر نمودار ہوا۔

''ارے قریب ہی تو ہمارا ہوٹل ہے۔ چیزیں اپنے کمرے میں سینت کر نکل چلتے ہیں۔'' نان اور پکوڑوں کے رول بنائے۔ بوتلیں خریدیں اور شاداں وفرحاں گاڑی میں بیٹھے۔

یہ ایک ایسا سفر تھا جس کے راستے میں کائنات کی خوبصورت ترین تخلیق انسان کی بنائی ہوئی بستیاں نہیں تھیں فطرت کے جمالیاتی عکس درختوں پودوں اور پھولوں کی صورت میں کہیں نظر نہ آتے تھے۔ البتہ اسکا جلال بلند وبالا اور پھیلے ہوئے کوہساروں کی شکل میں ضرور خوف زدہ کرتا تھا۔ انکے سینوں پر بنے ہوئے چاقو کی تیز دھار جیسے راستے کو دیکھتے ہوئے انسان سوچے چلا جاتا ہے کہ وہاں تک پہنچے گا کیسے۔ اور جب وہ کہیں رُک کر پیچھے دیکھتا ہے تو کسی بل کھاتے خوفناک سانپ کی مانند راستے کو دیکھ کر بے اختیار خود سے کہتا ہے

''ارے میں ابھی اس راستے سے اوپر آیا ہوں۔'' ایسی ہی ایک جگہ پر رک کر جب میں نے نظر بازی کی تو دولوموچ کا قلعہ، دینین لشٹ، دینین گول، چھاؤنی کا پل، چترال شاہی قلعہ، محل اور چترال اپنے سرسبز درختوں اور ٹین کی چھتوں والے گھروں کے ساتھ بہت خوبصورت نظر آئے تھے۔

اسی راستے پر گول نیشنل پارک جو تقریباً بیس ہزار ایکڑ رقبے پر پھیلا ہوا ہے دیکھنے کو ملا۔ میرے یہ پوچھنے پر کہ یہاں کونسے جانور ہیں ڈرائیور لڑکے نے سنولیپرڈ (برفانی شیر) ہمالیائی آئبکس۔ برفانی چیتے۔ مارخور۔ جنگلی بلے۔ لومڑیاں اور اڑیال کے متعلق تفصیلی بتایا۔ چترال سنولیپرڈ (برفانی شیر) کے سلسلے میں عالمی شہرت کا حامل ہے۔ خوبصورت پرندوں کے لیے بھی مشہور ہے۔ ڈرائیور لڑکے کی یہ اطلاع خوش کن تھی۔

تقریباً ساڑھے نو ہزار فٹ کی بلندی پر پی۔ ٹی۔ ڈی۔ سی شاندار موٹل بنا رہی تھی۔ روزگار کے جھنجھٹوں سے اُکتائے زندگی کے غیر ضروری اور اضافی تفکرات کے ستائے اور گوناگوں مصروفیات کے اژدھام میں پھنسے ہوئے صاحب لوگ جب یہاں پہنچیں گے تو خود کو بلاشبہ ارضی جنت میں پائیں گے۔

ایک تو انسانی ہاتھوں اور دماغ کی کاریگری دوسرے فطرت کی خوبصورتی نے ماحول کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چترال کسی سر سبز قالین کی طرح قدموں تلے بچھا نظر آتا تھا۔ نیلا آسمان میٹھی میٹھی مہربان دھوپ کے ساتھ سائباں کی طرح تنا ہوا تھا۔ اُترائی کی جانب کے گھنے جنگلوں سے آتی چلغوزے اور صنوبر کے درختوں کی ملی جلی خوشبوئیں حسیات کو نئی لطافتوں سے آشنا کرتی تھیں۔

پانچ سے دس ہزار فٹ کی بلندی تک تقریباً چودہ پندرہ میل کے رقبے میں پھیلے ہوئے چلغوزے کے درخت چراگاہیں مہتر چترال اور پبلک کی مشترکہ ملکیت ہیں۔ گول نیشنل پارک کا جھگڑا چترال کے سابقہ حکمرانوں اور حکومت کے درمیان عدالتوں میں زیر بحث ہے۔ پھر گاڑی میں بیٹھے اور اوپر محل میں پہنچے۔ ماضی کی پرشکوہ عمارات کو کھنڈروں میں تبدیل ہوتے دیکھ کر دل پر گھونسہ سا پڑا۔ شہ نشینوں، غلام گردشوں اور محرابوں والے اس ٹوٹے پھوٹے محل میں افسردگی سے گھومتے پھرتے یہی سوچتی رہی اور بار بار اس کا مہر النساء سے اظہار کرتی رہی کہ وہ جو ڈھیروں پیسہ خرچ کر کے سیر سپاٹے کے لیے آئیں گے ان کھنڈروں کو دیکھ کر کتنے مایوس ہوں گے۔

ہر جگہ بھوک کی جھاڑیوں کا راج تھا۔ مکئی کی فصل پر شباب تھا۔ خوبانی موٹی مگر کچی تھی اور اخروٹ کے درخت تلے سبزہ تھا۔ وہیں بیٹھ گئی۔ سامنے پہاڑ تھے۔ کوئی کاری کا پہاڑ تھا تو کوئی دینین کا۔ داہنے ہاتھ آلو کا کھیت تھا۔ جی چاہا آلوؤں کا بورا بھر کے لے جاؤں۔ پیچھے کہیں چشمہ تھا اور نشیب میں جنگل۔ اُسے دیکھنے چلے۔ چشمہ کیا تھا جیسے چھوٹی سی کھال ہو۔ ہاں البتہ چلغوزے کے درختوں کا گھنا جنگل تھا جو نیچے اُترتے اُترتے کسی اندھے کنوئیں میں بدل جاتا تھا۔ تھوڑی سی اُترائی کے بعد احساس ہوا کہ نیچے تک پہنچنے اور واپس اوپر آنے کے لیے ہم جیسوں کو پورا دن درکار ہوگا۔ اوپر سے ڈرائیور شور مچائے جاتا تھا۔ دفع کریں جی یہ چڑھائی اُترائی آپ کے بس کی بات نہیں۔

اس مہم جوئی کو ادھورا ہی چھوڑ کر اوپر آئے تو دیکھا کہ یہاں وہاں برسات میں اُگنے

والی کھمبیوں کی طرح خوبصورت چہروں والی عورتیں اور لڑکیاں بکھری ہوئی ہیں۔ ان کے شوخ رنگین آنچل اور رنگا رنگ ملبوسات نے جیسے اس شفاف نکھرے اور دُھلے ہوئے ماحول میں دھنک رنگ اُتار دیئے تھے۔ یہ A.K.R.S.P کے شعبہ خواتین کا ایگریکلچرل ونگ تھا جو پکنک منانے یہاں آیا تھا ان سے خوب گپ شپ ہوئی۔ معلوم ہوا کہ یہ شعبہ عورتوں کو چھوٹے پیمانے پر سبزیاں اُگانے اور مارکیٹنگ کرنے کے طریقے بتاتا ہے۔ A.K.R.S.P بڑی فعال اور مستعد تنظیم ہے جو شمالی علاقہ جات کی تعمیر و ترقی میں بڑا نمایاں کردار ادا کر رہی ہے۔

باب نمبر۔۱۶

بریر۔ پوڑ میلہ۔ ڈین
بزکشی اور بودلک

چترال سے یہ میری تیسری ملاقات تھی۔ پوڑ (ستمبر کے آخر میں بالائی چراگاہوں سے مال مویشیوں کا نیچے وادی میں آنے اور اخروٹ وانگور پکنے کی خوشی میں منایا جانے والا تہوار) دیکھنے کی حسرت بھی اندر سے نکل کر آنکھوں میں ڈیرے ڈالے بیٹھی تھی۔ تاج محمد فگار صاحب سے جو چترال کی بڑی علمی ادبی اور سماجی شخصیت ہیں فون پر رابطہ کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ اس تہوار کے لیے تاریخ کے تعین کا جان کر مجھے مطلع کریں گے۔ میری میری بہن کوثر جمال اس بار میری ساتھی تھی۔ وہ یقیناً اپنے بچپن کے فوکر طیاروں میں جیالے پائلٹوں کے سنگ کیے گئے سفروں کے کسی ایسے عکس کو جو ابھی بھی اُسکی ذہنی دیواروں سے چمٹا ہوا تھا کو دیکھنے کے لیے چترال جانے کی آرزو مند تھی۔

ستمبر کے اوائل کی اس گرم دوپہر میں تاج محمد فگار صاحب کی چترال سے آنے والی آواز نے مجھے پندرہ ستمبر کو پوڑ کے میلے کی خبر سنائی۔

سفر دونوں ہی بڑے مزے کے تھے۔ زمین کے سینے پر گڑگڑاتی سیٹیاں بجاتی اور چھک چھک کرتی نے جیسے طوالت کو بھی عین راحت میں بدل کر رکھ دیا تھا۔ اور ہواؤں سے گتھم گتھا ہونے والے نے تو پل جھپکتے میں جیسے عرش سے اٹھا کر فرش پر مارا تھا۔

ویٹنگ لاؤنج کے شیشوں والے دروازوں کے پیچھے تاج محمد فگار کا محبت بھرا چہرہ جھانکتا

تھا۔ اس چہرے سے بالمشافہ ٹکراؤ پر سفر کے خیریت سے کٹنے جیسے اطمینان بھرے اظہاریہ کے بعد گھر کے لیے اصرار تھا جب کہ میری ہوٹل کے لیے تکرار تھی۔ پر جب انہوں نے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے آپ اپنے بھائی کے شہر میں ہوں اور ہوٹل میں ٹھہریں۔''

تو سامان اُٹھا کر اُنکے پیچھے چلنا بے حد ضروری ہو گیا تھا۔

زرگراندہ گاؤں میں نالے کے قریب گھنے درختوں کے جھنڈوں میں وہ گھر تھا جس کا وسیع ڈرائنگ روم صوفوں اور قالینوں سے اور ملحقہ گیسٹ روم آرام و استراحت کے ضروری لوازمات سے سجا تھا۔ مسز تاج بڑی بُردبار کم گو اور متین سی خاتون تھیں۔ چترال شہر کی لیڈی کونسلر بھی تھیں اور سیاسی سوجھ بوجھ کی مالک بھی۔ دوپہر کے کھانے کے لیے بائی پٹس (چترالی نشست گاہ) میں جانا تھا۔ عقبی گھر میں چنار کے بے حد قدیمی درخت کی شاخوں کو تیز ہواؤں میں جھولتے انار کے سرخ پھل کو ٹہنوں پر جھومتے اور سیبوں کو بل کھاتے دیکھتے ہوئے اندر داخل ہوئے تھے کمرے کی پور پور میں صدیوں پرانی کہنہ سالی رچی ہوئی تھی۔ دھواں خوردہ چھت یوں چمکتی تھی جیسے اس پر ابھی تازہ سیاہ پینٹ کیا ہو۔ چوبی کڑھائی دار ستون تاج صاحب کے دادا پردادا کے زمانوں کی کہانیاں سناتے تھے۔ چوبی تختوں سے حد بندی کیا ہوا وسطی حصہ جس پر بچھے دسترخوان پر اعلیٰ درجے کی کراکری سجی تھی اور تاج صاحب کی چوتھے نمبر والی خوبصورت بیٹی اپنی دلنشین سی مسکراہٹ کے ساتھ ہمیں سروس دیتی تھی۔

چترال کے میٹھے اور صحت بخش پانیوں کی پیدا کردہ اور مسز تاج کے سلیقہ مند ہاتھوں کی تیار کردہ بھنڈی حد درجہ ذائقہ دار تھی کہ نصف لمبوترہ نان تو صرف اسی ذائقہ کی بھینٹ چڑھ گیا تھا۔ اور جب افرادِ خانہ کے بارے میں غائبانہ تعارف ہوتا تھا میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''تاج صاحب آپ تو بادشاہ ہیں۔''

چشمہ پہنے اُس چہرے پر ناقابلِ فہم سے تاثرات اُبھرے جنہیں محسوس کرتے ہوئے میں بولی۔

"دراصل ہماری ہر لوک کہانی کا بادشاہ یا سات بیٹیوں کا باپ ہوتا ہے یا پھر بے اولاد۔ آپکی بھی سات بیٹیاں ہیں لہٰذا آپ بھی بادشاہ ہوئے نا۔"

بڑا بھرپور اور جاندار قہقہہ تھا۔ جو اُنکی بیگم بیٹی اور خود انکے اپنے اندر سے نکلا تھا اور جس نے ماحول کو پھلجڑی سا بنا دیا تھا۔

ہمیں آرام کرنے کا کہتے ہوئے وہ پرنس اسد الرحمٰن سے قلعہ دیکھنے کی اجازت لینے چلے گئے۔

چترال کا موسم ابھی گرم تھا۔ میں لیٹی ضرور پر بے چین ہو کر اُٹھ بیٹھی۔ کوثر ابھی جاگن میٹی میں تھی۔ اُسے سُناتے ہوئے کہ میں ذرا پتہ تو کر آؤں پوڑ کس وادی میں ہو رہا ہے۔ کب اور کیسے جانا ہے کہتے ہوئے باہر نکل آئی۔

تاج صاحب کے گھر کی بلند و بالا سیڑھیاں اُتر کر نشیب میں واقع کریانہ کی دوکان پر آئی تو تھوڑی سی رہنمائی وہیں سے مل گئی۔ نالے کے ساتھ ساتھ چڑھائی چڑھتا راستہ سیدھا اتالیق بازار میں نکلتا ہے وہیں کالاشیوں کا مرکز ہوٹل ہے۔

پر جب کالاشیوں کے اس مرکز میں پہنچی تو وہاں اماں نہ پونیاں والی بات تھی۔ بہرام شاہ اور چند دیگر کالاشیوں سے ملاقات ہوئی۔ پر پوڑ کے بارے میں تقریباً سبھی لاعلم۔ پوڑ تو یوں بھی بریر وادی کا تہوار ہے کہ انگور کی پیداوار ٹنوں کے حساب سے وہیں ہوتی ہے۔ کسی نے کہا تھا۔

میرا دل اپنا آپ پیٹ لینے کو چاہا۔ بہرام شاہ نے وہیں گھاس پر مجھے بٹھاتے ہوئے چائے کا آرڈر دیا۔ چائے کے کپ میں چینی نہیں زہر گھلا ہوا تھا جس کا ہر جرعہ حلق سے اُترتے ہی مجھے چیرتا چلا جا رہا تھا۔ تاج صاحب نے ہمیں کیسے بُلا لیا۔ انہیں کس نے پندرہ سولہ کا کہا تھا۔ میں خود سے اُلجھتے ہوئے اپنے آپ سے پوچھتی تھی۔

واپس آکر جب تاج صاحب پر سردی گرمی جھاڑی تو انکی شان استغناد یکھنے کے قابل

تھی۔ آدھا نزلہ آیون چیک پوسٹ والوں پر اور آدھا ہمارے اوپر گراتے ہوئے گویا ہوئے۔

''ہمیں تو سمجھ نہیں آتی کہ آخر آپ نیچے والے لوگوں کی مت کیوں ماری ہوئی ہے؟ بھاگے چلے آتے ہیں۔ ہے کیا ان کے تہواروں میں ڈھول کی ڈھما ڈھم اور آگے پیچھے کی چلت پھرت۔''

گرمی سے بھری ہوئی سہ پہر میں نے مرحوم راجہ کرنل مطاع الملک کے سوگوار خاندان کے ساتھ افسوس میں گزاری۔ سال بھر گزر جانے کے باوجود انکی بڑی بہو کے آنسو انکی یاد میں ابھی بھی روانی سے بہتے تھے۔

باہر تاریکی تھی ہواؤں کے جھکڑ تھے۔ دریائے چترال کے پار پہاڑوں پر گھروں میں روشن بجلی کے قمقمے جگنوؤں کی طرح ٹمٹماتے اس ڈر کو کچھ کم کرتے تھے جو پرائے گھر جاتے ہوئے میرے اوپر طاری تھا۔

سہج سہج قدم اُٹھاتی اونچی نیچی جگہوں پر کمال احتیاط سے پاؤں دھرتی میں عقبی آنگن میں نمودار ہوئی۔ جہاں تاج صاحب کرسی پر فکرمند بیٹھے میرے ابھی تک گھر نہ پہنچنے پر کوثر سے اپنی پریشانی کا اظہار کرتے تھے۔

کمال ہے تاج صاحب یہ چترال ہے چترال۔ اکیلی عورت کو یہاں کیا خطرہ ہے۔

رات کے کھانے پر فیملی کے بقیہ افراد بھی موجود تھے۔ نویں کلاس میں پڑھنے والی ان کی گول مٹول سی پرکشش بیٹی حنا اور سویٹی۔ فہد احمد انکا بیٹا جو اکلوتا ہونے کے باوجود حد درجہ مودب اور بیبا سا تھا۔

چاولوں کا خشکہ مرغی کا شوربہ اور نان کے ساتھ پشور برٹھ خاص چترالی ڈش موجود تھی۔ پیاز اخروٹ قیمے آٹے اور ہری مرچ پودینے دھنیے کے ساتھ تیار کردہ یہ آئٹم بے حد ذائقہ دار تھا۔ ہم نے تو اسے ہی رغبت سے کھایا۔ گھر کے درختوں سے اُترے سیبوں کے بعد قہوہ پیتے ہوئے تاج صاحب کو سُنا جنھوں نے کل دس بجے شاہی قلعہ اور محل دیکھنے کا بتایا۔

یہاں برق گرانے والی ایک اور خبر تھی کہ ''شاہی محل کی وہ مہ لقا جسے دیکھنے کی میں آس لیے پھرتی تھی عرصہ سات سال سے زمین کا رزق ہو چکی تھی۔''

مسز تاج کے یہ الفاظ آتش شوق پر تیل اور تیلی گرانے کے مترادف تھے۔

چترال میں اُس جیسی حسین اور طرحدار عورت کب دیکھنے میں ملے گی۔ اُسے تو گھنٹوں دیکھو اور جی نہ بھرے والی بات تھی۔

اس ڈیپریشن کو کم کرنے میں بیچارے قہوے کی شامت جو آئی سو آئی تاج صاحب سے بھی اُلجھ پڑی جو بڑی معصومیت سے پرنس اسد کے اس استفسار کا تجزیہ کرنے میں مصروف تھے کہ ''آخر انہوں نے آپکی عمر کے بارے میں کیوں پوچھا۔ کہ آپ اُن سے بڑی ہیں یا چھوٹی۔''

''تاج صاحب آپ تو بھولے بادشاہ ہیں۔ انکے گہرے تفکر پر میری ہنسی چھوٹ گئی تھی کم عمری کی صورت میرے ساتھ بات چیت کو وہ انجوائے کریں گے۔ انکا وقت اچھا گزرے گا۔ دوسری صورت میں مجھے ٹرخایا جا سکتا ہے۔ ان کے لیے یہ وقت کا ضیاع ہے۔''

''نہیں نہیں آپ بالکل غلط سمجھیں۔ ہمارا پرنس اس مزاج کا نہیں۔''

''آپ واقعی بہت سیدھے اور بھولے ہیں۔'' میں نے کوثر کو اُٹھنے کا اشارہ کیا۔

اس روشن صبح بالکونیوں کی بیرونی دیواروں پر ٹنگے مارخوروں اور ہمالیائی آئبیکس کے سر پرانی زنگ آلود تلواریں توپیں اور جنگی آلات حرب ایک عہد کی داستان سناتے تھے۔

اندر منقش دیواروں پر کٹور خاندان کے شہزادے راجے مہاراجے ہیروں کے تاجوں سے سجی پیشانیوں کے ساتھ ایک سرے سے دوسرے تک پھیلے ہوئے تاریخ کی کتابوں کے اوراق اُلٹاتے تھے۔ ان ورقوں میں رئیسہ خاندان کی شکست اور تیمور لنگ کی اس اولاد کے کارنامے رقم تھے۔ امان الملک سے لے کر موجودہ سیف الملک ناصر تک۔ موجودہ شہزادہ تو یوسف ثانی تھا۔

ریاست کے مدغم ہونے کے بعد سے اسلام آباد میں مقیم تھا۔ اسکی جھیل جیسی نیلی آنکھیں اور تابناک چہرہ دیکھتے ہوئے میں سوچتی تھی۔ اسلام آباد کی فیشن ایبل عورتیں تو اُسے

دیکھ کر اپنے کلیجوں پر ہی ہاتھ دھرتی ہوں گی۔ نشست گاہوں میں بچھے قالین صوفے ہاتھی دانت کی انٹیک میزیں اور تپائیاں۔ ماضی کی عہد ساز شخصیات کی تصویروں سے بجی دیواریں۔ گچ کی ان دیواروں میں دراڑیں تھیں۔ چیزوں پر پرانے پن اور بوسیدگی کی چھاپ تھی پر پھر بھی ان پر پھیلا شاہانہ رعب داب اور شان وشوکت کا پرتو متاثر کرتا تھا۔ محل بھی ٹوٹ پھوٹ کے عمل سے دوچار تھا۔ ایک ایک کمرہ نادر چیزوں سے آراستہ ضرور تھا۔ نیل گائے مارخور اور چیتے کے سینگوں سے بجی غلام گردشیں تھیں جہاں گھومتے ہوئے بندہ عروج وزوال کے المناک تصورات کے زیر اثر ہول کھائے چلا جاتا ہے اور یہ سوچنے پر مجبور ہوتا ہے کہ ان محل باڑیوں میں رہنے والے لوگ کہاں گئے۔ اب یہ ڈھنڈار سے کمرے عبرت کا سامان بنے پڑے ہیں۔

میرا دل گھبرانے لگا تھا۔ اونچی اونچی فصیلوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے یہاں قید ہو گئے ہوں۔ باہر نکل آئے۔

بلند وبالا فصیلوں سے باہر راجہ فیملی کے باغ باغیچوں کے ساتھ بنی سڑک پر جس کے بائیں ہاتھ نشیب میں پامیران کے ہوٹل کا سلسلہ پھیلا ہوا ہے چلتے ہوئے ہم پرنس اسدالرحمٰن سے ملنے جارہے تھے۔

دریائے چترال کے پہلو میں یہ ایک جدید وضع کا خوبصورت گھر تھا۔ ابھی ناشتے کا مرحلہ جاری تھا۔ چائے پیتے ہوئے وہ ہنسے اور بولے۔

آیئے باتیں کرتے ہیں۔ جو آپکو اپنے مطلب اور کام کی چیز محسوس ہو اُسے رکھ لیں باقی کو دفع کردیں۔

اب ان کے اور حکومت کے درمیان پیدا شدہ جائیداد سے متعلق مختلف معاملات جو عدالتوں میں زیر سماعت تھے دفع کرنے کے قابل ہی تو تھے۔

ڈیڑھ گھنٹے کی اس نشست میں جن حقائق کو میں جاننے کی آرزومند تھی اُن میں سے کوئی بھی موزوں انداز میں زیر بحث نہیں آیا۔ اور اگر کوئی آیا تو وہ قانونی موشگافیوں کی بھول

بھلیوں میں اُلجھا ہوا تھا۔ ریاست کے پاکستان میں مدغم ہونے کی تاریخ بھی اُن حقائق سے لگا نہیں کھاتی تھی جو میں نے سرکردہ لوگوں سے سُنے تھے۔ خاندانی البم دیکھنے کا معاملہ پھر کسی اور وقت پر اُٹھ گیا۔ سیف الرحمٰن کی بیوہ سے شادی کرنے میں اُس کے بے پایاں حُسن کی کوئی کرشمہ سازی تھی یا ماں بہنوں کا دباؤ تھا کہ اس کی اتنی نوعمری کی بیوگی پر خواص چھوڑ عوام بھی اشک کناں تھے۔

سچی بات ہے جب میں اُٹھی تھی میرے دماغ میں کھولن تھی۔ کوئی چیز واضح نہیں تھی۔ سب کچھ گڈمڈ ہو گیا تھا۔ اور میں سخت ڈپریشن میں تھی۔

یہ بھی کیسا عجیب اتفاق تھا کہ شاہی قلعے کی فصیل کے پاس سفید ٹویوٹا میں ایک معزز مرد نے ہمیں قریب پہنچنے پر فراخدلانہ پیشکش کرتے ہوئے کہا تھا۔

آپ بمبوریت جانا چاہتی ہیں؟

پل بھر کے لیے ہم حیرت زدہ سے ہوئے۔ پر حیرت جلد ہی رفع ہو گئی کہ صاحب کسی سگریٹ کمپنی کی طرف سے ایڈورٹائزنگ کے سلسلے میں چترال آئے تھے۔ ہمشیرہ ساتھ تھیں ان کے پاس خود وقت نہیں تھا۔ ڈرائیور ہمشیرہ کو بمبوریت لے جا رہا تھا۔ ہمیں دیکھ کر انہوں نے بہن کی دوسرا تھ کے لیے پیشکش کر دی۔

میں نے تو پل نہیں لگایا۔ ہنستے ہوئے یہ کہتے ہوئے ”ارے اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے“۔ گاڑی میں گلہری کی طرح پھدک کر بیٹھ گئی۔

پر شیشیوں میں سے میں نے دیکھا تاج صاحب حواس باختہ سے گُم سُم پریشان کھڑے تھے غالباً سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ اس عورت کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ یقیناً اگر کہیں اس وقت میری ماں موجود ہوتی تو تاج صاحب کے شانے پر محبت بھرا ہاتھ پھیرتے ہوئے کہتی۔ چھڈ پتر۔ یہ تو ہے ہی سارے زمانے کی اوا گون اسکا تو وہ حال ہے۔ جنے لایا گلیں اودے نال اُٹھ چلی۔

جب گاڑی چلی میں نے بیگ سے بسکٹ کا ڈبہ نکالا۔ خود لیا۔ کوثر کو دیا۔ مسز زہرہ ممتاز کو

چاہت کے ساتھ پیش کیا۔ڈرائیور کو بھی اس منہ ماری میں شامل کیا۔

چلو بمبوریت میں پوڑ کا کچھ پتہ تو چلے گا۔میں نے طمانیت سے سوچا۔

پر جونہی جیپ نے آیون کے لیے عمودی اُترائی پر قدم دھرا میرے ذہن نے قلابازی کھائی۔

بمبوریت کی بجائے بریر جایا جائے۔

اس خیال نے گاڑی کی رفتار پکڑنے کے ساتھ ساتھ زور پکڑا یوں کہ میں نے اپنا ہاتھ مسز زہرہ ممتاز کے بھاری بھرکم شانے پر رکھتے ہوئے انہیں بریر وادی کے دلفریب نظاروں کی ایسی دل کش تصویر دکھائی کہ وہ بے اختیار بول اُٹھیں کہ بھئی مجھے تو سیر سے غرض ہے۔ڈرائیور نے ذرا سی پس وپیش کی تو میں نے وہاں کے نسوانی حسن کے یوں قصیدے پڑھے کہ بیچارے کو یقیناً دل پر ہی ہاتھ رکھنا پڑا ہوگا۔

فیصلہ ہوا کہ آیون سے ہی بریر جایا جائے۔میری باچھیں دور دریا کو کسی کشادہ دل رئیس کی طرح سبک خرامی سے بہتے دیکھ کر کھلی جاتی تھیں۔

سڑک گو کسی کنجوس کے دل کی طرح تنگ اور کسی غریب کی طرح بے مایہ سی تھی مگر بُری نہیں لگ رہی تھی کہ بریر کو جاتی تھی۔ پہاڑوں کی اونچائی کسی اعلیٰ ظرف کی طرح بلند تھی۔سڑک کے کچا ہونے کی وجہ سے ہچکولے جھولے جھلاتے تھے۔راستے نے ایک جگہ آکر ایسی دل دہلانے والی صورت بنا رکھی تھی کہ فرنٹ سیٹ پر بیٹھی زہرہ ممتاز اسکی خوفناکی سے لرز کر چیخ اُٹھیں۔ڈرائیور محتاط تھا اور حوصلے والا بھی۔فوراً بول اُٹھا تھا۔

مت گھبرائیے۔ابھی گاڑی یہاں سے نکل آئے گی۔

گہریت پر بریر وادی سے آتا ہوا نالہ دریائے چترال میں گر رہا تھا۔گہریت پشاور روڈ پر وہ جگہ ہے جہاں سے بریر کو راستہ جاتا ہے۔اسے بریر موڑ بھی کہتے ہیں ڈرائیور ہمیں پہلے گہریت موڑ پر لے آیا تھا اُسے گاڑی کو چیک کرنا تھا۔ہم آبادی کے لوگوں سے پوڑ کے بارے میں پوچھنے

لگے۔ جب پھل پک کر گرے گا تب قاضی گنڈولک سرکردہ لوگوں کے صلاح مشورے سے تاریخ کا اعلان کرتا ہے۔ بالعموم ستمبر کا آخری ہفتہ ہوتا ہے۔ مایوسی تو پہلے ہی تھی یہ سب سُن کر آہ بھری اور گاڑی میں بیٹھے۔ پُل کراس کیا اور سفر پھر دریا اور پہاڑوں کے ساتھ ساتھ شروع ہو گیا۔ بریر کا راستہ بہت خطرناک تھا دریا اور سڑک کے دونوں جانب پہاڑوں کی تنگی نظر کو عجیب سی کوفت کا احساس دیتی تھی۔ چشموں سے جگہ جگہ راستے کا کٹاؤ ہوتا تھا۔

یہ بیزار کن صورت عین راحت میں بدلی جب بریر کا آغاز ہوا۔ یوں لگا جیسے بہشت بریں میں داخل ہو گئے ہوں۔

ہر سو سبزہ تھا۔ پکے ہوئے سیاہی مائل عنابی کالے سفید اور سرخی مائل انگوروں کے لٹکتے گچھے مکئی کے سرسبز کھیت پھلدار درخت اور جنت کی حوروں جیسے چہروں والی لڑکیاں اور عورتیں کہیں کھیتوں میں کہیں بھیڑ بکریوں کے پیچھے بھاگتی نظر آئیں۔

بریر نسار بڑا ابھرا پُر اسا گاؤں تھا۔ ریسٹ ہاؤس سے کچھ فاصلے پر سڑک کے کنارے قبرستان تھا۔ کس قدر عبرتناک نظارہ تھا۔ تابوت کھلے پڑے تھے بکھری ہوئی ہڈیاں چیخ چیخ کر متکبر بندے کو اپنی اوقات کا پتہ بتا رہی تھیں۔

اس وقت دو بج رہے تھے اور بھوک سے برا حال تھا۔ چنانچہ ایک سڑک کے کنارے ٹپری والے ہوٹل سے روٹی کھائی۔

اب گھروں پر پھیلی بیلوں پر منوں کے حساب سے لٹکتے انگور کے خوشوں کو دیکھ کر آنکھوں میں تحیرِ شوق اور انہیں توڑ کر کھانے کی ترغیب جاگی۔ پر جونہی ایک بھری پُری بیل کو ہاتھ لگایا وہ ہاہا کار مچی کہ یوں محسوس ہوا جیسے غلطی سے ہاتھ کسی بھڑوں کے چھتے میں پڑ گیا ہے۔

میرے اردگرد لوگ کھڑے تھے جو میرے ہاتھوں کو دیکھتے تھے کہ ان میں کوئی انگور کا خوشہ تو نہیں۔

کوثر اور زہرہ ممتاز دور کھڑی پریشانی سے دیکھتی تھیں کہ ہوا کیا ہے۔

۱۴ اگست سے ۲۰ ستمبر تک پھلوں پر DANE کا قانون لاگو ہے پھل کو کوئی توڑ نہیں سکتا ہے۔ اگر کوئی قانون شکنی کرتا ہے اسے جرمانہ ہوگا۔ ایک جوشیلے لڑکے نے باآواز بلند گویا اس قانون کی منادی کی۔

کوثر قریب آ چکی تھی اور یہ سب سن کر اونچی اور غصیلی آواز میں بولی تھی۔

"کچھ خدا کا خوف کرو۔ تمہارا پوڑ دیکھنے کے لیے ہم اتنی دور سے پینڈے مارتے آئے ہیں۔ ذرا ہماری آنکھوں میں تو جھانکو جو تمہاری اس زمین پر پھلوں پھولوں اور فطرت کے حُسن کو دیکھ کر قدرت کی تم پر فیاضیوں پر رشک وحسد کے جذبات اُگل رہی ہیں۔ ہم مہمان ہیں تمہارے۔ کیا تمہیں مہمانداری کا ذرا بھی احساس نہیں۔ تمہارے کنویں سے کوئی پیاسا پانی نہ پئیے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔"

کوثر کی جذباتی باتوں کا اُن پر خفیف سا اثر بھی دیکھنے کو نہ ملا۔ البتہ یہ ضرور ہوا کہ وہ ہمیں اخروٹ کے درخت تلے لے آئے اور اُس نوجوان لڑکے جس نے سیاہ لباس پہنا ہوا تھا اور جس کا نام شاہ حسین تھا ہمیں بتانا شروع کیا۔

دراصل پندرہ اگست کی صبح سب کالاشی مرد اپنی چراگاہوں اور وادی سے دُور مویشی خانوں سے پنیر کیلاڑ اور دودھ لے کر آتے ہیں۔ خواتین خانہ کی پکائی ہوئی روٹیوں کے ساتھ عصر کے وقت مالوش (قربانی کا دیوتا) پر جا کر وہاں اپنے ساتھ لایا ہوا کھانا کھانے کے بعد مالوش کے سامنے باادب کھڑے ہو کر اپنی سلامتی اولاد کی درازی عمر پھلوں کی آرضی وسماوی آفات سے بچاؤ اور قربانی کی قبولیت کی دعا مانگتے ہوئے پھلوں کی ایک ماہ کے لیے حفاظت کا عہد کرتے ہیں۔ ڈین ہمارا مذہبی وعدہ ہے جسے توڑنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ چلیے آپ کو ہم اپنے مرکزی گاؤں گورو لیکر چلتے ہیں ہمارے مذہبی رہنما شیر بیگ سے آپکو بہت سی باتوں کا پتہ چلے گا۔ شاہ حسین نے پیشکش کی۔ یہ امر بھی باعث صد اطمینان تھا کہ زہرہ ممتاز اس سیر سے لطف اندوز ہو رہی تھیں۔

"ضرور۔ دیکھیں تو سہی وہ کیا سناتے ہیں۔"

سچی بات ہے ہماری آنکھیں تھک گئی تھیں پر رسیلے انگوروں سے لدی بیلوں کا سلسلہ لامتناہی تھا۔ اخروٹ کے بلند وبالا درختوں اور حُسن و جوانی سے بھرپور لڑکیوں کے نظاروں نے وادی کی تنگی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

گورو مرکزی وادی ہے۔ شاہ حسین نے ایک جگہ گاڑی رکوائی اُترا۔ اوپر گیا اور تھوڑی دیر بعد ایک ہنستے مسکراتے آدمی کے ساتھ ظاہر ہوا جس نے ہمیں بریر میں خوش آمدید کہتے ہوئے اندر چلنے کی دعوت دی۔ گھر تو ایک ہی جیسے نمونے کے تھے۔ شیر بیگ بڑی میٹھی طبیعت کا بندہ تھا۔ محبت پور پور سے ٹپک رہی تھی۔

ہمارا پوڑ دیکھنے کے لیے آنا اسکے لیے باعث مسرت تھا پر غلطی سے قبل از وقت آمد پر متاسف بھی تھا۔ ''آپ کے اس ڈین نے تو ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ دیئے ہیں۔'' کوثر بے صبروں کی طرح بولی۔

ڈین کا مقصد دراصل کالاش قوم کو ضبط نفس کی تعلیم دینا ہے۔ بالعموم اسکا دورانیہ ڈیڑھ ماہ کا عرصہ ہے یعنی ۱۴ اگست سے ۲۹ ستمبر تک۔ بزکشی کی ادائیگی گویا اس قانون کے خاتمے کا اعلان ہے۔ اس رسم کے بعد ایک دن کے وقفے سے پوڑ کا میلہ شروع ہو جاتا ہے۔

اب ہم سب کے چہروں پر بزکشی سے متعلق سوال رقم تھا۔ جسے انہوں نے پڑھا پر انکے بولنے سے پہلے چائے آ گئی تھی۔ چائے کے ساتھ جو لوازمات آئے تھے اُن میں بھنے ہوئے مکئی کے سفید بھٹے مغز اخروٹ خشک خوبانی اور بسکٹ۔

میں نے مکئی کا آدھا بھٹہ اُٹھایا اُسے چھوٹی سی چکی ماری تو صاحب خانہ نے ساتھ ہی مغز اخروٹ والی پلیٹ آگے کرتے ہوئے کہا۔

''بھٹہ اس کے ساتھ کھایا جاتا ہے۔''

''بہت خوب۔'' اس نئے آمیزے کو شوق سے کھاتے ہوئے میرے منہ سے نکلا۔

''وادی کی مکئی ابھی کچی ہے کل میں چترال سے یہ لایا تھا۔ اخروٹ بھی پارسال کا

ہے۔ نیا تو ابھی درختوں پر ہے۔"

چائے کا گھونٹ بھرنے کے بعد کپ ٹرے میں رکھتے ہوئے انہوں نے بات جاری رکھی۔ بزکشی کی رسم کے لیے عصر کا وقت بکری کے دو بچے وادی کے سرکردہ معزز لوگ ایک نابالغ بچہ جس نے نہانے کے بعد نئے کپڑے سر میں تیل اور آنکھوں میں سُرمہ لگایا ہو ضروری ہیں۔ یہ لوگ ہمارے سب سے طاقتور دیوتا مہاندیو جو وادی سے بہت دور چنار کے درخت کے نیچے ایک چھوٹی سی دیوار پر موجود ہوتا ہے کے حضور حاضر ہوتے ہیں۔

بکری کے پہلے بچے کو نابالغ بچہ بغیر کسی مدد کے خود ذبح کرتا ہے۔ کلہاڑی سے کھال اُتارے بغیر اُسکے ٹکڑے کرتا ہے۔ مہاندیو پر اُسکے خون کے چھینٹے پھینکتا ہے اپنے سر پر بھی ملتا ہے۔ دوسرے بچے کے ساتھ وہی عمل پھر دہراتا ہے۔ اُسے بھی ٹکڑوں میں کاٹتا ہے۔

معززین میں سے ایک آدمی اسکی طرف خشک لکڑی کی ٹہنیاں پھینکتا ہے جنہیں جلا کر بچہ اس پر گوشت بھون کر خود کھاتا ہے۔

اپنے لیے معززین کا علیحدہ گوشت بھوننا اُسے کھانا اور پھر انگوروں سے منہ میٹھا کرنا ضروری ہے۔ دو دن بعد وادی میں میوہ اُتارو کی رسم شروع ہو جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہو سکتا آپ پندرہ دن ٹھہر جائیں۔ انہوں نے ہماری طرف دیکھا۔ یقین جانیئے۔ پوڑ والے دن اس تنگ سی وادی میں حسن و رنگوں کی پچکاریاں یوں چھٹتی ہیں کہ وادی اور اس پر تنا آسمان سبھی لال گلال نظر آتے ہیں۔

باہر کی وادیوں کے لوگوں سیاحوں گاڑیوں کی بھرمار اس زمین کے چپے چپے پر زندگی کو قہقہے لگاتے شور مچاتے اور ناچتے گاتے دیکھتی ہے۔ بڑی بڑی چوبی ٹوکریوں میں میٹھا رسیلا تازہ جنت کا پھل ٹنوں کے حساب سے اُترتا ہے اور منوں کی مقدار میں مفت بانٹا جاتا ہے۔

"پھل کی اتنی بہتات تو یقیناً وادی کے لیے کاروباری نگاہ سے بہت منافع بخش ہو گی۔"

زہرہ ممتاز کا یہ سوال کچھ ایسا بھی نہ تھا کہ شیر بیگ اس پر اپنی ہنسی ہی نہ روک پاتے۔ وہ ہنسے چلے جا رہے تھے۔ شاہ حسین مسکرائے چلا جا رہا تھا اور ہم تھے کہ ہونقوں کی طرح انکی صورتیں دیکھے چلے جاتے تھے۔

ایک دانہ نہیں بیچتے۔ ان رسیلے میٹھے انگوروں سے شراب بنتی ہے۔ نہایت بڑھیا ذائقہ دار ارغوانی رنگت والی شراب جو گندم کے گیلے آٹے میں مغز اخروٹ اور نمک گھی کی آمیزش سے بننے والی روٹی کے ساتھ ہمیں دسمبر جنوری کے تا حد نظر پھیلے برف کے صحراؤں میں برچھی کی طرح کاٹنے والی یخ بستہ ہواؤں میں زندہ رکھتی ہے۔ ہمارا دسمبر کا چاؤ موس کا تہوار بھی اسکے بغیر ادھورا ہے۔

آپ کی چترال میں آنے والی حکمران اور ایلیٹ اس شراب کے لیے مری جاتی ہے۔ معلومات فراہم کی جا رہی تھیں دو نوئر مڈل کلاس عورتیں شراب کے اس درجہ پسندیدہ ذکر پر چیں بچیں تھیں۔ اُن کی پیشانیوں کی لکیریں اور آنکھوں سے باہر جھانکتی زبان اس ذکر کو یہیں ختم کرنے کے لیے کہتی تھی۔ پر تیسری مڈل کلاسی کو یہ سب منظور نہیں تھا۔

میں پتھروں کی ہوزری دیکھتی تھی۔ زون (شراب بنانے والا آلہ) کے بارے میں سُنتی تھی۔ انگوروں کے پاؤں سے کُچلے جانے کے عمل کی تفصیل جان رہی تھی۔ وادی کا ہر گھر اس معاملے میں خود کفیل ہے۔ نیز تہواروں پر چترال کے مسلمان بھی بلا تکلف شراب پینے یہاں آتے ہیں۔

''بس کرو اب۔'' کوثر پنجابی میں چلائی۔ مسز ممتاز چلنے کے لیے کہتی ہیں۔

وہیں شراب کی ہوزری کے پاس میں نے بودلک کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا۔''

زمانہ گزرا اس رسم کو ختم ہوئے۔ اب کوئی بودلک بھی زندہ نہیں جسے آپ کو دکھایا جائے۔'' شیر بیگ نے رسان سے کہا۔

''مجھے یقین نہیں۔'' قطعیت سے پُر میرا جواب تھا۔

''معاشرے کے تہذیبی ارتقاء میں رسموں کا ختم ہو جانا اور نئی کا رواج پانا کچھ ایسا بھی غیر معمولی نہیں جس پر آپ کو اعتبار نہ آئے۔''

شیر بیگ کی دانائی سے پُر اس بات نے مجھے قائل تو ضرور کیا پر میری آنکھوں میں تذبذب تھا۔ سوال تھے۔ اور کچھ جاننے کی شدید خواہش۔ میں نے کوثر لوگوں سے وادی کو دیکھنے کے لیے کہا۔

میں نہیں چاہتی تھی کہ اب وہ اس نئے افسانے کو سُنے جس کی حقیقت جاننے کے لیے مجھے اُچھل پیڑے لگے ہوئے تھے۔

اب یہ مشکل کام تو آپ کو ہی کرنا ہے۔ میں نے کمرے میں آنے اور بیٹھنے کے بعد کہا۔ وادی کی عورتوں کے ساتھ تو زبان یار من ترکی و من ترکی نمی دانم والا معاملہ ہے۔

تب وہ بولے۔

جب انسانی وجود کے آر پار کو کسی برچھی کی انی کی طرح چیرتی نورستان کے پہاڑوں سے آنے والی زمستانی ہوائیں دم توڑنے لگتیں تب بودلک کے چناؤ کے لیے سیمسن جیسے جری جوان کا انتخاب ہوتا تھا۔ اُسکے انگ انگ کی صحت مندی کی سند وادی کے وید حکیم کے جاری ہونے کے بعد پہاڑ کی چوٹی پر ایک الگ تھلگ گھر میں چھ ماہ تک بہترین کھانوں اور پھلوں کے ساتھ پرورش اور صنف مخالف سے میل ملاپ نہ کرنے کی نگرانی کرنا وادی کے لوگوں کا ایک مقدس مشن تھا۔

پھر ایسے ہی دنوں میں جب پہاڑوں کی چوٹیوں پر جمی برفیں آبشاروں کی صورت وادی کو نہال کرتی تھیں جب پھولوں کے خوش رنگ چہرے اسکا حُسن بڑھاتے تھے جب انگوروں کی بیلیں رسیلے خوشوں سے لدی پھندی آنے والے دنوں میں سرور کے نئے رنگوں کا پیغام دیتی تھیں۔

وہ کسی آسمانی دیوتا کے سمان وادی میں اُترتا تھا۔ اُس بادل کی طرح جس کے ایک ایک

آبی قطرے میں دھرتی کو گل رنگ کردینے کا جادو ہوتا ہے۔تب سولہ سنگھار کیئے حسینا ئیں آنکھوں میں محبت وعقیدت کے جام بھرے مردوزن پیروجوان بچے بوڑھے اسکے قدموں تلے پھول بچھاتے اُسے چارسو (ڈانس ہال) لے آتے۔جہاں جلتی مشعلیں رات کو دن بنارہی ہوتیں۔

ڈھول کی ڈھما ڈھم پر رقص اور مے نوشی کہ ساری کائنات تو بس سمٹ کر جیسے ان لمحوں میں مقید ہو جاتی۔بارہ کا گجر۔حسیناؤں کے چارسو سے جانے کی گھڑی کا اعلان ہوتا۔جیسے کوئی کانچ کا کھلونا تھامے۔یوں ڈبلول (مذہبی رہنما) بودلک کو پکڑے لڑکیوں کے پاس جاتا۔

تب گل چینی کا عمل شروع ہوتا۔لڑکیاں پھول ہی تو ہوتی ہیں۔تاروں کی طرح چمکتی پہلی لڑکی۔پہلا تارہ ٹوٹتا ڈبلول چارسو میں طبل بجاتا۔لوگ سرمستی اور سرشاری میں رقص کو تیز کر دیتے۔تارے ٹوٹتے جاتے اور یوں صُبح ہو جاتی۔تیں لڑکیوں کی گل چینی اُس شب بودلک کے لیے بے حد ضروری ہوتی تھی۔

''اس رسم یا عقیدے کی کوئی توجیح یا فلاسفی تو یقیناً آپ لوگوں کے ذہنوں میں ہوگی ہی۔''میں نے پوچھا تھا۔

''بس یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارا یقین ہے کہ بودلک کے وجود سے انسانی وحیوانی نباتاتی وجماداتی زندگی کے سوتے اُبل پڑتے ہیں۔وہ وادی کو خوشحالی کی پھوار میں بھگو دیتا ہے۔''

''جب ایسا اندھا یقین ہے تو پھر یہ ختم کیسے ہوگئی۔''

''کئی بدلتی قدریں۔وقت اور نئی نسل جسے یہ سب خرافات نظر آتی ہیں۔''

پھر میں اُنکے گھر کی بلندی سے نیچے آئی۔انگور نہ کھا سکنے کا میرا دُکھ۔کنوئیں کے پاس آکر پیاسے آدمی کا میٹھا پانی نہ پی سکنے کا افسوس میری بار بار کی چچ چچ نے شیر بیگ کا دل یقیناً پسیج کرر کھ دیا ہوگا۔تبھی وہ ہنستے ہوئے میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔

''ایک نکتہ بتا دیتا ہوں۔اُس سے فائدہ اُٹھا سکتی ہیں تو اُٹھا لیجیے۔

بیلوں سے گچھا توڑے بغیر دانہ دانہ کر کے کھالیں۔آپکے ہاتھ میں ثبوت نہیں ہونا

چاہیے۔''

خدا حافظ کہہ کر وادی میں بقیہ لوگوں کو ڈھونڈ نے لگی۔ سی این ڈبلیو ریسٹ ہاؤس کے پاس ہی ٹکراؤ ہو گیا۔ خوشی سے چہکتے ہوئے انہیں راز کی بات بتائی۔

ڈرائیور یہاں سے واپسی چاہتا تھا پر زہرہ ممتاز کا وادی کے حُسن و رعنائی پر واری صدقے ہونا اور اگلی وادیوں کو دیکھنے کی خواہش کا اظہار کرنا میرے لیے بہت طمانیت کا باعث تھا۔

گرو خاصی بڑی وادی ہے۔ یہاں ڈسپنسری مڈل سکول دو کانیں اور ہوٹل ہیں۔

جب آگے چلے اور وادی کی مختصری بھیڑ بھاڑ سے نکلے۔ تو پھر انگور تھے ہم تھے۔ چشمے کے ٹھنڈے ٹھار پانیوں سے گچھے دھوئے اور کھائے۔ ڈین کی تو دھجیاں اُڑائیں۔

اگلی وادیاں بشاڑ اور بہاڑ تھیں۔ بشاڑ میں ہم نے ہوٹل کے سامنے دھری چار پائیوں پر بیٹھ کر چائے پی اور بہاڑ سے نورستان کے سرسبز و شاداب جنگل دیکھے۔

گلیشئروں سے لدے پھندے پہاڑوں نے مسحور کیا۔ افغانستان کے علاقے نورستان کے متعلق جانا۔ نورستانی چراگاہوں میں کالاشیوں کے ڈھور ڈنگروں کا رہنا چرنا اور کالاشیوں کا دودھ گھی جوڑ جوڑ کر نیچے لانا سب سُنا۔

اور جب واپسی ہوئی مسز زہرہ ممتاز نے میرے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''میں شکر گزار ہوں آپ کی۔ بخدا میں نے فردوس بریں کی سیر کی۔''

باب نمبر۔ ۱۷

الوداع چترال
اور اہل چترال

الصلوۃ خیر من النوم پہلی بار آہستہ پر دوسری بار اونچی آواز میں پڑھتے ہوئے کوثر اُٹھ بیٹھی تھی۔

میرے جسم کی حالت کچھ اُس مظلوم عورت کی سی تھی جس کے خاوند نے اُسے چار چوروں کی مار ماری ہو۔ بریر کی جنت نظیر وادی کے خوفناک راستے بدن کے لیے جیسے ظالم شوہر کا ڈنڈا ہی تو ثابت ہوئے تھے۔ آنکھ کی خفیف سی جھری سے میں نے کوثر کو دیکھا اور پھر اُسے بند کر لیا۔ نئے نکور کمبل کی ننّھی سی گرمائش دُکھتے شریر کے لیے ٹکور کا کام کر رہی تھی۔

کوثر کی کھٹ پٹ نے مجھے مجرم سا بنا دیا تھا۔ اُسکی اللہ میاں سے یاری کی فلاسفی میں نماز کی ایک چھٹی بھی اُس تیز دھار والی قینچی جیسی ہے جو محبت کو پھیتی پھیتی کر ڈالتی ہے۔ اس کے چھوٹے بچے نے اگر کبھی شامت اعمال سے رات کو پیشاب کر کے اُسے گیلا کر دیا تو پوہ ماگھ کی راتوں میں اس نے اپنے ساتھ بچے کو بھی نل کے نیچے کھڑا کر دیا۔

جب وہ وضو کر کے آئی تو اس نے عین میرے سامنے سر پر کھڑے ہو کر کہا تھا۔ باجی فجر کی نماز چترال شاہی مسجد میں پڑھنی ہے۔

اب باجی کو مرتی کیا نہ کرتی کے مصداق اُٹھنا پڑا تھا۔

شاہی مسجد میں نماز کی ادائیگی میں عبودیت کی انکساری عین اپنے عروج پر تھی۔ لُطف

آیا۔ واپسی میں دن چڑھ چکا تھا۔ مہمان خانے سے اندر زنان خانے آ گئے۔ برآمدے میں کرسی پر تاج صاحب ہشاش بشاش بیٹھے ریڈیو سُنتے تھے۔ مسز تاج چائے بنانے میں مصروف اور بڑی بیٹی راتھینی میں ناشتے کے لیے چیزیں رکھتی تھی۔

کیسا محبت بھرا گھرانہ تھا۔ چہروں پر جو مسکراہٹیں بجی تھیں اُن میں خلوص کی دمک تھی۔ ناشتے کے لوازمات شیراشاپیک (اخروٹ خوبانی اور دودھ کے آمیزے سے بیک کی ہوئی روٹی) پراٹھے انڈے اور قہوہ چائے دونوں موجود تھے۔

تاج صاحب نے اُس دن کا پروگرام جاننا چاہا۔

''گیارہ بجے تک تو آپ کے ساتھ نشست جمے گی۔ بعد میں کل والی پارٹی کے ساتھ بمبوریت کا پروگرام ہے۔''

''آپ تو پہلے بھی وہاں جا چکی ہیں اور کتنی بار جانا ہے۔'' کالاش وادیوں کی طرف بھاگ بھاگ کر جانا شاید ہر چترالی کی طرح انہیں بھی اچھا نہیں لگا۔

''تاج صاحب مفت کا ٹرپ ہے اور آپ جانتے ہیں مفت کی شراب تو قاضی نے بھی پی لی تھی۔''

چترال کا چہرہ میرے لیے اب خاصا شناسا تھا۔ اس شناسائی میں مزید اضافہ اس صبح تاج صاحب کی گفتگو نے کیا۔

سیاسی جغرافیائی اور دفاعی نظر سے چترال پاکستان کا اہم ترین صوبہ ہے اسکی سرحدیں چین افغانستان اور تاجکستان سے جُڑی ہوئی ہیں۔ یہ اگر ہندوکش کے بلند و بالا پہاڑی سلسلوں میں مقید ہے تو وہیں مختلف دروں سے باقی اضلاع سے ملا ہوا ہے۔

بے شمار گلیشئر دں میں سے اہم چیانتار ہے جو ۲۵ میل لمبا اور کوئی تین میل چوڑا ہے۔ چترال کے کلچر اور تہذیب پر وسط ایشیا کی ریاستوں کا گہرا اثر ہے کیونکہ مختلف اوقات میں مختلف نسلوں کے لوگ یہاں آ کر آباد ہوتے رہے۔ ان قبائل میں کھو، بشگالی، گواری، کالاش، دامیٹری،

ڈانگرک ، پٹھان واخی اور بدخشی ہیں۔ کھوا کثریتی قبیلہ ہے جو قدیم آریائی واخان چینی ترکستان افغانستان اور دیر سوات سے آنے والے لوگوں کے یہاں آ کر رہنے اور قبول اسلام کے بعد باہم شادیوں اور میل ملاپ کے باہمی ربط سے تشکیل پایا۔ انکی زبان کھوار ہے جو کم وبیش پورے چترال میں بولی اور سمجھی جاتی ہے۔ بشگالی دراصل افغانستان کے سرخ کافر تھے۔ جو اُنیسویں صدی کے آخر میں بھاگ کر چترال آئے۔ مسلمان ضرور ہیں مگر اُن میں ابھی تک جہالت اور وحشی پن موجود ہے۔ بکرے کے پوست سے تیار کردہ پوستین پہنتے ہیں۔ سر پر پکول نما ٹوپی رکھتے ہیں۔ سردیوں کا لباس بور (بے آستیں چوغہ) ہے۔ مردوں کو سر کے بال لمبے رکھنے کی عادت ہے۔ ہڈ حرام اور کام چور سے ہیں۔ گھر کی گاڑی چلانے کی ذمہ داری تمام تر عورت کے ذمہ ہے۔ لڑکی جب بیاہ کر سُسرال جاتی ہے تو میکے میں گزارے گئے سالوں کا تاوان وہ شوہر کی زمینوں پر محنت سے کام کر کے ادا کرتی ہے۔

پروردگار عورت کے معاملے میں کتنے ظالم ہیں لوگ۔ مسلمان ہو کر بھی جاہل رہتے ہیں۔ کوثر بے اختیار ہی بول اُٹھی تھی۔

گواری جنگجو قسم کے اُجڈ لوگ ہیں۔ نسل در نسل دشمنیوں کے چکر میں اُلجھنے والے اس قبیلہ کا پیشہ مویشیوں کی چرائی ہے۔ واخی چین کے علاقے سنکیانگ افغانستان کے واخاں اور تاجکستان سے آنے والے لوگوں کی قوم ہے۔ زبان بھی وخی ہے۔ فطرتاً پیسے لوگ ہیں۔

چترالی رقص وموسیقی کے بہت دلدادہ ہیں۔ پولو میں انکی جان ہے۔ شادی بیاہ کی تقریبات پر اب میدانی علاقوں کا رنگ غالب آنے لگا ہے۔ تاہم چند مقامی رسمیں ابھی بھی دلچسپی کا باعث ہیں۔ جن میں بارات کے دُلہن کے گھر پہنچنے پر چھڑی کا پھینکا جانا جسے جو کوئی پکڑے انعام پائے اور دُلہن کا دولہا کے گھر پہنچ کر سواری سے اس وقت تک نہ اُترنا جب تک کہ ساس اور سُسر اسکے لیے تحائف کا اعلان کریں۔ دُلہن کا میٹھی روٹیاں پکانا اور دُولہا کا انہیں پلٹا دینا۔

دوپہر کا کھانا کھا کر ہم لوگ پامیر ہوٹل گئے جہاں سے بمبوریت کے لیے روانگی ہوئی۔

گاڑی کا ڈرائیور مقامی تھا۔ جس نے آیون گاڑی روک کر ہمیں وہ راستہ دکھایا جو فاریسٹ والوں نے بمبوریت تک کھرہ کے جنگل سے پہاڑوں کے گرداگرد کاٹ کر بنایا تھا۔ یہ راستہ دشوار گزاری اور خوبصورتی دونوں لحاظ سے بے مثال تھا۔ پتہ نہیں اسے کیوں بند کردیا گیا۔

بمبوریت میں سچی بات ہے ویرانی کی دھول اُڑتی تھی۔ سارے میں اُداسی اور بے کیفی کی فضا تنی ہوئی تھی۔

کراکال میں جرمن حکومت کے تعاون سے ایک بڑا ٹیکنیکل کالج بن رہا تھا۔ کراکال کی بشالینی بھی گریک منسٹری آف فارن آفیسرز کے تعاون سے بنی ہوئی تھی۔

یہ وہی بشالینی تھی جہاں تا کا جھانکی ممنوع تھی۔ اوراب ہم نے اسکے ایک ایک کمرے کو دیکھا تھا۔ میٹرنٹی ہوم کو جدید سامان سے آراستہ دیکھ کر باغ باغ ہوئے۔ فائیو سٹار ہوٹلوں جیسے باتھ روموں کو استعمال کر کے خوشی ہوئی۔ کالاشیوں کی مادی ترقی کے ساتھ ساتھ ذہنی ترقی یقیناً قابل رشک تھی۔

مسز زہرہ ممتاز بمبوریت دیکھ کر بہت مایوس ہوئیں۔ میں نے کہنا ضروری سمجھا تھا ''دراصل آف سیزن ہے۔ خزاں کی آمد ہے وگرنہ وادی کی خوبصورتی میں کوئی شبہ نہیں۔''

جب واپسی میں چترال داخل ہوئے تو پولو گراؤنڈ میں اُتر گئے کہ وہاں ہجوم عاشقاں تھا۔ تیز ساز والی موسیقی کی تانیں تھیں۔ پلے ہوئے خوبصورت گھوڑوں پر بیٹھے رعنا جوان برق کی مانند انہیں بھگائے پھرتے تھے۔ دھرتی ملیریا کے مریض کی طرح کانپتی تھی۔ پولو کا میچ عروج پر تھا۔ کسی ٹیم کا گول ہوا لوگوں کے نعروں کے شور اور بینڈ کی چیختی چنگھاڑتی موسیقی نے کانوں کے پردے پھاڑنے والا کام کیا تھا۔

ہماری بمبوریت والی بوریت کہیں بھاگ گئی تھی۔ اس سنسنی خیز اور خون کو کھولانے والے کھیل سے ہم نے لمحہ بہ لمحہ مسرت کشید کی اور اپنے آپ کو مسرور کیا۔

جب یہ سارا کھیل تماشا ختم ہوا۔ سورج غروب ہونے کے قریب تھا۔ چترال کی شام

خنکی میں ڈوب کر لطیف ہو گئی تھی۔ ایک دوسرے کو خدا حافظ کہتے ہوئے ہم جدا ہوئے۔

ہمارے لیے تاج صاحب کا گھر گھر سے باہر گھر جیسا آرام اور سکھ لیے ہوئے تھا۔ مہمان خانے کے سامنے چھتنار درختوں کے جنگل کی عقبی سمت کے پہاڑوں کی چوٹیوں پر دھوپ پھیل جاتی تب ہم اندر جاتے۔ اُسوقت نہم میں پڑھنے والی حنا سکول کے لیے بیگ سیٹ کرتی سب سے چھوٹی آٹھ نو سالہ لاڈو بیٹی سویٹی باپ کے ساتھ چہلیں کرتی اور مسز تاج چوبی ریلنگ والے برآمدے میں چائے تیار کرنے اور نازک سی ہنس مکھ بیٹی ناشتے کے اہتمام میں مصروف ملتیں۔ ناشتے سے فارغ ہو کر جب ہم جانے کے لیے اُٹھے مسز تاج بولی تھیں۔ ''رات کا کھانا گھر پر کھانا ہے۔ بیٹی آج قلی (چترالی سوپ) بنائے گی۔''

مہمان خانے کی طرف بڑھتے ہوئے کوثر نے کہا تھا۔ ''آپ نے مسز تاج کے لہجے میں چھلکتے محبت کے رچاؤ کی شدت کو محسوس کیا۔ کیسی دریا دل عورت ہے۔''

پورا گھر ہی خلوص کے شیرے میں لتھڑا پڑا ہے۔ رحمت کی بجائے اب ہم زحمت والے خانے میں داخل ہو گئے ہیں۔ پر پھر بھی انکے چہرے پیار بھری مسکراہٹوں سے ''آپکا اپنا گھر ہے'' کا پیغام دیتے ہیں۔ ہاتھ ہیں کہ دستر خوان نئی نئی چیزوں سے سجاتے کہتے ہیں۔ ''ارے آپ اپنے حصے کا رزق کھا رہی ہیں۔''

چترال بازار پہنچ کر جونہی کوثر نے اپنے پرس سے کاغذ نکالا میں تو جی جاں سے دہل گئی۔ گرم چشمہ کی پٹی والی واسکٹیں اپنے بچوں اور عزیزوں کے لیے تو ضروری تھیں پر یہاں تو سہیلیوں کے شوہروں کے لیے بھی لمبا چوڑا نمبر تھا۔

کوئی ڈیڑھ بجے شاہی بازار کی نکڑ والی چھوٹی سی دوکان سے بیسن میں تلے آلو پیپسی کے ساتھ کھائے اور سول اسپتال کے پاس میونسپل لائبریری گئے۔ لائبریری میں کتابیں بھی تھیں اور پڑھنے والے بھی۔ اہل چترال کتابوں سے محبت کرتے ہیں۔ لائبریرین کے اس جملے میں ملمانہ تفاخر تھا۔

ساری شام پرنس اسد الرحمن کے ساتھ گزری ۔ خاندانی البم اُس مہ لقا کی تصویروں سے بھرا ہوا تھا۔ جسے دیکھنے کی چاہت میں گزشتہ چند سالوں سے میں مری جا رہی تھی۔ البم میں ایک اور مہ لقا کی بھی وضاحت ہوئی۔ وائی ہنزہ میر غضنفر کی ہمشیرہ پرنس اسد کی سابقہ منگیتر۔ نظریں تو اس پر یوں چپک گئی تھیں کہ ہٹانا مشکل ہو رہا تھا۔ ایک لمبی داستان تھی اسکی منگنی کے ساتھ جو سُننی پڑی۔

جب شام ڈھلے گھر آئے تو لان میں تاج صاحب کے ساتھ باتیں کرتے ایک نوجوان سے تعارف ہوا۔ محکم الدین ایونی چترال کا ذہین آرٹسٹ۔ خاصی دیر باتیں ہوئیں۔ رات کے کھانے پر چترالی سوپ نے لذت دی۔ ترکیب نوٹ کی۔ چوتھے نمبر والی بیٹی جس کی ساری سہ پہر اسکی تیاری میں گزری تھی کو شاباش دی۔

صبح ائر پورٹ جا کر چانس پر سیٹ کے لیے کوشش کی پر ناکام رہے۔ اگلے دن فلائٹ نہیں آئی۔ اس سے اگلے دن بھی نہیں۔ سامان اُٹھا کر جانا اور شرمندگی کا طوق چہرے پر سجائے واپس آنا کس قدر ذلت آمیز تھا۔ اب ہمیں کسی ہوٹل جا کر اپنے میزبانوں کی رسوائی بھی گوارہ نہ تھی۔

''پروردگار'' میں نے ہندوکش کے پہاڑوں میں گھرے نیلے آسمان کی وسعتوں کو دیکھتے ہوئے کہا تھا ہمارے حالِ زار پر رحم کر۔ کوثر لواری ٹاپ سے سفر کرنے کے لیے تیار نہیں۔ اس معزز اور شریف گھر نے سارے چترالی اور میدانی کھانے ہمیں پکا پکا کر کھلا دیئے ہیں۔ اب انکے پاس ہمیں کھلانے کے لیے کوئی نئی ڈش نہیں۔

رحم میرے مولا ہم پر اور ہمارے میزبانوں پر۔

اور اگلے دن ہم پر رحم ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سلمٰی اعوان

971 آشیانہ دہلی روڈ

لاہور چھاونی

مصنفہ کی دیگر کتب

تنہا (سابق مشرقی پاکستان پر)

یہ میرا بلتستان

میرا گلگت وہنزہ

شیبہ

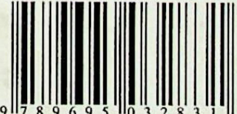
ثاقب

زرغونہ

گھروندا اک ریت کا

پیچ بچولن

Title Design By: Agha Nisar 7210011



الفیصل
ناشران و تاجران کتب
غزنی سٹریٹ اردو بازار لاہور